فرینڈلی
فائر
نگہت سیما

نہ جانے کتنے حقائق کا ماحصل ہوں گے
زمانہ جن کو سمجھتا رہا ہے افسانے

پیش لفظ

بہت پہلے جب میں اسکول کی طالبہ تھی اور بچوں کے ایک رسالے ''غنچہ'' میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھا کرتی تھی میں نے ایک دن اخبار میں ایک ویت نامی بچے کی تصویر دیکھی جو زمین پر اوندھے منہ گرا تھا اور ایک امریکن فوجی اسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ بچہ میری عمر کا ہی تھا۔

کیا اس بچے کو میری طرح جینے، ہنسنے اور کھیلنے کا حق نہیں ہے؟ میں نے سوچا تھا اور پھر ایک کہانی لکھی۔ ''وانگ ھو کی کہانی''

اس کہانی کے تین کردار تھے۔ ویت نامی بچہ، کشمیری بچہ اور پاکستانی بچہ۔ وہ کہانی اسطرح شروع ہوتی تھی۔ ''زعفران کے کھیتوں میں آگ لگی ہے اور وانگ ھو کی ماں کو امریکیوں نے مار دیا ہے سلیمان بٹ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اس ان دیکھے انجانے بچے کے دکھ پر روئے، زعفران کے کھیتوں کا ماتم کرے یا بوڑھے دادا کیلئے روئے جسے ہندو فوجی پکڑ کر لے گئے ہیں۔ اسے اپنا اور وانگ ھو کا دکھ سانجھا لگتا ہے'' اس کہانی سے میں نے اپنے اردگرد دیکھنا' حالات و واقعات کو محسوس کرنا اور انہیں لفظوں کا روپ دینا سیکھا۔ یہ ابتدا تھی اس کے بعد میری دوسری کہانی ''مسجد اقصیٰ کے آنسو'' تھے۔ جو بچوں کے رسالے میں تو نہ چھپ سکی لیکن ''سیارہ ڈائجسٹ'' میں ایک تاثر یا احساس کے نام سے چھپ گئی۔

میں کوئی سیاسی بصیرت نہیں رکھتی۔ نہ میں کوئی بہت بڑی تجزیہ نگار ہوں۔ میں حالات و واقعات سے اس طرح متاثر ہوتی ہوں جیسے عام لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن میں انہیں اپنی سوچ، فکر احساس کے ساتھ دیکھتی اور محسوس کرتی ہوں۔

میں ٹی۔ وی نہ دیکھنے کے برابر دیکھتی ہوں۔ اخبارات بہت کم ہفتے میں ایک بار پڑھتی یکن جتنا اور جس قدر پڑھتی ہوں وہ مجھ پر اثر انداز ہوتا ہے

اور میں ''قطرے میں دجلہ دیکھتی ہوں۔''

میرے پاس قلم ہے۔ قلم ہاتھ میں ہو تو بولنے لگتا ہے میری ساری کہانیاں تخیلاتی ہیں لیکن میں نے ان میں حقائق کو اس طرح سمونے کی کوشش کی ہے کہ کہانی واعظ نہ بنے اور اس کی دلچسپی برقرار رہے اور لوگ جان سکیں کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

میں نے فلسطین، افغانستان، کشمیر، بوسنیا، کراچی، مشرقی پاکستان کے حالات اور پھر عراق پر لکھا ہے۔ یہ سب میرے اپنے احساسات ہیں۔ ہاں اعداد و شمار میں نے اخبارات سے لئے۔

میں کڑھتی ہوں افغانستان کے حالات پر، عراق کی صورت حال پر اور سب سے بڑھ کر پاکستان پر۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے تکلیف دہ ہے اور سب سے بڑھ کر تکلیف دہ یہ ہے کہ ہمیں اس کا احساس نہیں ہے۔ ہمارے دل پتھر ہو گئے ہیں اور احساسات مردہ۔ میڈیا نے جس طرح ہماری ثقافت پر حملہ کیا ہے وہ تو تکلیف دہ تھا ہی لیکن اب پاکستان کی تاریخ مسخ کی جا رہی ہے۔ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت نہ تھی ہماری ہجرت بے معنی اور بے مقصد تھی۔ ہندو اور مسلمان کی تہذیب و ثقافت ایک ہے۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کیا واقعی ہماری تہذیب و ثقافت رہن سہن ایک ہے؟ کیا ہم مسلمان ہیں؟ ان حالات پر ہم جتنے لفظ بھی روئیں کم ہیں۔ تمام دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ سوچنے والی بات ہے۔

ساؤتھ وزیرستان اور وانا میں کیا ہو رہا ہے۔ مرنے والے بھی ہم ہیں اور مارنے والے بھی ہم۔ مجھے دونوں کا دکھ ہے۔ جہاد کیا ہے؟ دہشت گرد کون ہے؟

''وہ تیسرا ہاتھ'' کس کا ہے جو ڈوری ہلا رہا ہے اور ہم اپنے ہاتھ اپنے ہی خون سے رنگ رہے ہیں اس کتاب میں میری پانچ کہانیاں شامل ہیں۔ ''فرینڈلی فائر'' یہ خط نما مختصر طویل افسانہ، گو ایک فرد کے احساسات ہیں لیکن یہ ہمارے اجتماعی کردار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ہم امریکہ سے نفرت نہیں کرتے ہمارا مذہب محبت کا درس دیتا ہے لیکن ہم ظلم اور زیادتی سے نفرت کرتے ہیں۔

ہم دوسروں پر ظلم ہوتے دیکھ کر روتے ہیں۔ لیکن ہمارے ذاتی مفادات ان آنسوؤں کو فوراً ہی خشک کر دیتے ہیں۔ یہ کیسا بے بسی کا مقام ہے۔ کاش ہم اپنی ذات کی نفی کر کے اجتماعی مفادات پر سوچنا جان جائیں۔

''یہ دانہ و دام کی کہانی'' اس میں عراق پر امریکی قبضے کے بعد اور ساؤتھ وزیرستان (وانا) میں ہونے والے واقعات کو پس منظر بنا کر میں نے کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے قلم کا حق ادا کر سکوں۔ اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں یہ میرے قارئین ہی بتا سکتے ہیں کہ وہی بہتر پارکھ ہیں۔ تیسری کہانی ''لاتخل'' عزتوں کی قربانی اور خون کے دریا پار کر کے ''پاکستان'' حاصل کرنے والوں کا نوحہ اور نئی نسل کی بیگانگی کی عکاس ہے جبکہ تیسرا اور چوتھا افسانہ معاشرتی ناہمواریوں، غیر اسلامی رسومات اور شدت پسند رویوں کو بے نقاب کرنے کے آئینہ دار ہیں۔ میری ان تمام کاوشوں کو ادارہ المجاہد پبلشرز نے کتابی شکل دینے کا بیڑا اٹھایا۔ اس پر میں محترم ناصر اقبال مجاہد کی مشکور ہوں۔

میری دعا ہے کہ خدا پاکستان اور دنیا بھر کے مسلمانوں کا حامی و ناصر ہو۔

نگہت سیما، چکوال

10 دسمبر 2004ء

دانہ و دام کی کہانی

''پھر یوں ہوا کہ'' عبدالعلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''فرات و دجلہ لہو کے اشکوں سے بھر گئے ہیں وہ جن کے سینوں میں الف لیلیٰ کی سحر انگیز داستانیں دھڑک رہی تھیں ان ہی کی روحوں میں خوف کے صد ہزار جنگل اتر گئے ہیں۔''

''فارگاڈ سیک عبدالعلی!'' محب اللہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''اتنی جذباتیت اچھی نہیں ہے۔ قوموں اور ملکوں کی زندگی میں ایسے مقام آیا ہی کرتے ہیں۔''

''یار! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہاں جرنلزم میں کیوں آ گئے ہو، تمہیں تو

ادیب ہونا چاہیے تھا۔''
چوہدری عظمت اللہ نے تیزی سے لکھتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ناک کی پھننگ پر اٹکی عینک کو دوبارہ درست کر کے ناک پر جمایا۔

''ایڈیٹر صاحب نے تمہیں عراق کے موجودہ حالات کے متعلق چھوٹا سا کالم لکھنے کو کہا ہے۔''

''کالم ہی تو لکھ رہا ہوں۔''

''یہ کالم ہے یا نوحہ؟'' چوہدری عظمت اللہ کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

''درندگی اس مقام پر ہے کہ بابل و نینوا کی تہذیب رو رہی ہے۔''

محب اللہ نے جو عبدالعلی کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا جھک کر پڑھا۔

''یار عبدالعلی! میرا خیال ہے اس وقت تم جذباتی ہو رہے ہو...... کچھ دیر بعد لکھ لینا اسے پھاڑ دو۔ خوامخواہ ایڈیٹر صاحب کا پارہ چڑھ جائے گا اسے دیکھ کر۔''

''میں تو اسے پھاڑ دوں گا محب اللہ خان!'' عبدالعلی نے گردن پیچھے کر کے محب اللہ کو دیکھا۔

''لیکن کیا تاریخ کے چہرے سے درندگی و سفاکی کے یہ بدنما داغ بھی مٹا سکو گے؟ نہیں محب اللہ! آنے والی نسلیں اور آنے والا زمانہ اس درندگی اور سفاکی کو اسی طرح تاریخ کے صفحات پر رقم کرے گا جس طرح ہلاکو اور چنگیز کی سفاکی کو رقم کیا گیا ہے۔''

''لیکن اس سے کیا ہوگا عبدالعلی! اگر تاریخ کے صفحات پر یہ خونریزی رقم بھی ہو گئی تو کیا یہ جو ہر روز سینکڑوں لوگ مارے جا رہے ہیں۔ عورتوں کی عزت و عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں۔ معصوم بچے دوبارہ زندگی پا سکیں گے۔ کیا لوٹی ہوئی عصمتیں واپس ہو سکیں گی کیا ان خون اگلتے نوجوان سینوں میں زندگی پھر دھڑک سکے گی عبدالعلی! بتاؤ۔''

محب اللہ کا ہاتھ پھر اس کے کندھوں پر آ ٹکا تھا اور عبدالعلی کو اس کی انگلیاں اپنے کندھوں میں کھبتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

''ہاں! تم شاید صحیح کہتے ہو محب اللہ!'' عبدالعلی کی آواز بہت دھیمی تھی۔

''جب ہم خود کچھ نہیں کر سکتے تو تاریخ کے کندھوں پر سارا بار ڈال کر خود کو ہر

طرح کے بوجھ سے آزاد کر لیتے ہیں کہ چلو ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور باقی کام آنے والی نسلوں کا ہے کہ وہ اس خونریزی پر نوحے لکھے اور مرثیے کہے اور پچھلی نسل کی بے حسی کا ماتم کرے۔ خاندان برامکہ کے زوال پر کتنے نوحے لکھے گئے۔ سقوط غرناطہ، سقوط بغداد اور پھر سقوط ڈھاکہ پر کیا کچھ نہیں لکھا گیا لیکن۔''

''سقوط ڈھاکہ!'' چوہدری عظمت اللہ نے پھر لکھتے لکھتے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور عجیب طرح سے ہنسا۔

''یہ تو ابھی کل پرسوں کی بات ہے جب ہمارا دل دو ٹکڑے ہوا تھا لیکن میرا بیٹا نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان کون سا ملک ہے۔ اسے یہ خبر تک نہیں کہ بنگلہ دیش کبھی اسی پاکستان کا ایک بازو تھا جو کاٹ دیا گیا۔''

اس نے رک کر باری باری دونوں پر ایک طنزیہ سی نظر ڈالی۔

''تو عزیزان من! تاریخ بھلے کچھ نہ کر سکے گی لیکن آنے والی نسلوں کو آگاہی تو دیتی ہے ایک امید تو دیتی ہے کہ شاید پچھلے کی غلطیاں اگلے نہ دہرائیں شاید وہ کوئی سبق سیکھ لیں۔ تاریخ ہمارے ان آج کے لکھنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی جنہوں نے تاریخ کے صفحات سے مشرقی پاکستان کا نام ہی مٹا دیا۔ میرا بیٹا اکثر مجھ سے پوچھتا ہے۔ پپا! یہ بابا کس ملک کا نام لیتے ہیں اور کیا آپ بھی کبھی بابا کے ساتھ اس ملک میں گئے تھے۔ میں کہتا ہوں' بیٹا وہ ہمارا ہی ملک تھا تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھتا ہے۔ پپا میری ٹیچر تو کہتی ہیں کہ اس نام کا کوئی ملک نہیں ہے۔'' میں شرمندہ ہو کر سر جھکا لیتا ہوں اسے۔ کچھ نہیں کہہ پاتا تو بابا سے الجھتا ہوں کہ وہ کیوں نہیں بھول جاتے مشرقی پاکستان کو اور کیوں بچے کو الجھاتے ہیں لیکن میں بابا کے ذہن و دل سے مشرقی پاکستان کو نہیں نکال سکتا۔ بھلے تاریخ کو مسخ کر دوں۔''

اس نے میز پر رکھا ہوا قلم اٹھایا اور پھر جھک کر یوں انہماک سے لکھنے لگا جیسے وہ بہت دیر سے یونہی بیٹھا لکھ رہا ہو۔

''اور یہ کتنا بڑا المیہ ہے محبت اللہ خان!'' عبدالعلی نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہم اپنی تاریخ کو مسخ کرنے کے مجرم ہیں۔''

''ہماری تاریخ صرف المیوں سے ہی مرتب ہوئی ہے ایک نہیں کئی المیے۔'' محب اللہ کے لہجے میں دکھ رو رہا تھا۔

"اور ابھی مزید کئی الیے جنم لیں گے۔" وہ ہنسا۔

"یہ چوہدری عظمت اللہ آج اس بات پر شکوہ کناں ہے کہ اس کا بیٹا نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان کبھی پاکستان کا ہی حصہ تھا۔ کل اس بات پر روئے گا کہ اس کا بیٹا اور بیٹے کی اولاد یہ تک نہیں جانتی کہ یہ ملک کیوں حاصل کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ ہم نے اسے اپنے نصاب میں اب باور کرایا ہے کہ پاکستان کوئی نظریاتی ملک نہیں۔ نہ ہی کسی اسلامی نظریہ کے تحت وجود میں آیا ہے بلکہ یہ تو دو بھائیوں کی کہانی ہے جو ایک دوسرے سے الگ ہو کر رہنا چاہتے تھے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو محب اللہ؟" عبدالعلی کی آنکھوں میں یکدم اضطراب کروٹیں لینے لگا۔

"صحیح کہہ رہا ہوں میری جان!" محب اللہ گھوم کر اس کے سامنے والی کرسی پر آ بیٹھا۔

"ہم بابل و نینوا کی تہذیب کے لٹنے پر رو رہے ہیں۔ عبدالعلی! تو آؤ کچھ دیر کے لیے اپنی تہذیب و ثقافت کے لٹنے پر آنسو بہالیں کہ ہم نے اپنے نصاب میں بچوں کو یہ بتایا ہے کہ اگر پاکستان اسلامی نظریہ کی بنیاد پر وجود میں آتا تو مشرقی پاکستان کی بجائے افغانستان اس میں شامل ہوتا۔ ارے احمقو! افغانستان تو ایک الگ ملک تھا برصغیر کی تقسیم سے پہلے آزاد ہو چکا تھا۔ تقسیم تو برصغیر کی ہوئی تھی۔"

"اوہ مائی گاڈ!" عبدالعلی نے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

تب ہی السلام علیکم کا پرزور نعرہ لگاتے ہوئے سید مجاہد حسین اندر داخل ہوئے اور ہاتھ میں پکڑا لفافہ ٹیبل پر رکھا۔

"یہ کیا ہے مجاہد صاحب؟" ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے محب اللہ نے پوچھا۔

"تصاویر ہیں۔ ابھی مدنی صاحب نے دی ہیں۔" مدنی صاحب اور مجاہد صاحب دونوں ہی اخبار کے فوٹو گرافر تھے۔

"کل کے اخبار میں لگیں گی۔" محب اللہ نے لفافہ کھول کر تصاویر نکالیں۔

چند عراقی بچوں کی خون میں لت پت نعشیں سڑک پر پڑی تھیں اور قریب ہی چند

امریکی فوجی کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ رات ہی انہوں نے ٹی وی پر یہ خبر سنی تھی کہ چند عراقی اسکول سے نکل کر اس تباہ شدہ امریکن گاڑی کو دیکھ رہے تھے جو ایک خودکش حملے میں تباہ ہو گئی تھی کہ ایک موبائل آ کر رکی جس میں امریکی فوجی سوار تھے انہوں نے ان ہنستے کھلکھلاتے بچوں پر فائر کھول دیا۔ ان کے بستے ان کے گلوں میں لٹکے تھے اور معصوم گلابی بچوں کی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر منجمد ہو گئی تھی۔

"یہ...... یہ دیکھو عبدالعلی!" محب اللہ نے تصاویر اس کی طرف بڑھائیں تو وہ جو ابھی تک سر پکڑے بیٹھا تھا اس نے سر اٹھا کر تصاویر کو دیکھا اور اس کے اندر سے ایک چیخ اٹھی جو وجود کی دیوار کے اندر ہی کہیں گونج کر خاموش ہو گئی وہ نم آنکھوں سے تصاویر دیکھتا رہا۔

اور یہ صرف آج کی بات نہ تھی۔

ایسی اور اس جیسی کئی تصاویر وہ ہر روز دیکھتا تھا۔ بظاہر سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔

عراق فتح ہو گیا۔

بعث پارٹی کا خاتمہ ہوا۔

صدام حسین گرفتار ہو گئے۔

لیکن کچھ بھی تو ختم نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ظلم و ستم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

عراق میں جمہوریت قائم کرنے کے وعدے۔

عراقی عوام کو ظلم و ستم سے نجات دلانے کے خواب سب ہوا میں تحلیل ہو گئے سامنے کیا تھا۔

خودکش حملے کرتے عراقی جوان، لٹی پٹی عراقی عورتیں، لہو میں نہائے معصوم جسم اور بین کرتی مائیں۔

اور وہ جو امن کی مشعلیں جلا کر ہماری تہذیب کو نئی منزلوں کا مژدہ سنا رہے تھے جو آسمانوں کی سمت رستہ دکھا رہے تھے۔

خدا کے لہجے میں بات کرتے یہ چند انسان زمین کی تقدیر اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں۔ نجف میں، بصرہ میں اور بغداد کی فصیلوں میں اب دراڑیں پڑی ہوئی ہیں۔

اس نے بغور تصویر کو دیکھا۔

"میرے ننھے فرشتو! کاش تم نے اس سرزمین پر جنم نہ لیا ہوتا جہاں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے لیکن کہاں کھلتے تم ننھے بچو! اس دھرتی پر کوئی ایسا گوشہ نہیں جہاں تم بے خوف ہو کر ہنستے اور نڈر ہو کر تتلیوں کے پیچھے بھاگتے۔"

ایک سرد آہ عبدالعلی کے ہونٹوں سے نکلی۔ اس نے لفافہ ٹیبل پر رکھتے ہوئے دائیں ہاتھ کی پشت سے ان نادیدہ آنسوؤں کو پونچھنے کی سعی کی جو آنکھ تک آنے کی بجائے اندر ہی کہیں ٹوٹ کر گم ہو گئے تھے۔

"سر جی......!"

بابا کرماں والے نے دروازے سے چق اٹھا کر اندر جھانکا۔

"کیا ہے بابا؟" محب اللہ نے پوچھا۔

"آپ کے عبدالعلی کرماں والے کو اپنے ایڈیٹر صاحب یاد کر رہے ہیں۔"

بابا کا نام تو نہ جانے کیا تھا لیکن وہ اپنی گفتگو میں "کرماں والے" کا لفظ زیادہ استعمال کرتا تھا۔ اس لیے اخبار کے اس آفس میں سب ہی اسے بابا کرماں والا کہتے تھے۔

"اچھا آتے ہیں، پہلے تم چائے لاؤ چار کپ۔"

"جی سر جی! ابھی لایا۔" بابا جی نے چق گرا دی۔ عبدالعلی نے کلپ بورڈ سے لکھے ہوئے کالم والا کاغذ نکالا اور اسے گول مول سا کر کے ویسٹ میں پھینک دیا۔

"جذبات کو ذرا ایک طرف رکھ کر لکھنا!" چوہدری عظمت اللہ نے سر اٹھائے بغیر کہا اور عبدالعلی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قلم اٹھا کر کلپ بورڈ پر جھک گیا۔

☆ ☆ ☆

مے کدہ جمال میں کیا ہیں رسوم مے کشی

آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے

آنکھ تو سیر ہو چلی......"

دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے ٹیبل بجاتے ہوئے آنکھیں بند کیے اسجد اونچی آواز میں گا رہا تھا۔

کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے عنیزہ نے جھلا کر اسے دیکھا۔

"تم اپنا والیوم تھوڑا کم نہیں کر سکتے اسجد۔"

"بشرطیکہ دل کی تشنگی کم ہونے کی کوئی سبیل ہو۔" اسجد نے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا جبکہ انگلیاں بدستور میز پر تال دے رہی تھیں۔

"کیا تم تھوڑی دیر صبر نہیں کر سکتے۔"

"تھوڑی دیر! ارے ہم تو نہ جانے کب سے صبر کر رہے ہیں اور کب تک کرتے رہیں گے۔ بلکہ شاید صبر ہی کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔" اس کی زبان چل پڑی تھی۔

"لیکن اس وقت اگر تم دومنٹ کے لیے اپنی زبان بند کر لو تو میں تمہاری ازحد ممنون ہوں گی۔" عنیزہ نے چبا چبا کر بات مکمل کی۔

"او کے، او کے لیکن یہ اس وقت تم کیا ضروری کام کر رہی ہو؟"

"میں اپنی اور عادلہ کی سی وی بنا رہی ہوں، ہمیں ایک انٹرویو کے لیے جانا ہے۔ عادلہ ابھی آتی ہو گی۔"

"تم...... یعنی تم بھی اب گھر سے رخصت ہو رہی ہو۔ واہ کیپٹن اسجد تاجدار تمہاری قسمت ہی خراب ہے۔ پورے تین ماہ بعد گھر کے در و دیوار ہی دیکھنے تھے تو وہاں کیا برا تھا۔ کم از کم شام میں کبھی کبھار اچھی صورتیں ہی نظر آ جاتی ہیں۔ ہائے وہ سونے سی ترشی میجر حمزہ کی دختر نیک اختر کس قدر اداس تھی میرے آنے سے اور میں خوامخواہ مرا جا رہا تھا یہاں آنے کو۔"

"ہم ابھی آ جائیں گے بس آدھ گھنٹے تک اور ابھی تو عادلہ بھی نہیں آئی۔"

عنیزہ کو اس پر ترس آ گیا۔

سچ ہی تو کہہ رہا تھا کہ اتنے ماہ بعد آیا ہے اور یہاں کسی کو اس کی پروا تک نہیں۔ وہ رات دیر سے آیا تھا اس لیے علی سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی اور صبح عبدالعلی کو کسی جگہ ایک تقریب کی کوریج کے لیے جانا تھا۔ اس لیے وہ اس کے جاگنے سے پہلے ہی جا چکا تھا اور ممانی کو آج شام اپنے لیڈیز کلب میں ایک تقریب اٹینڈ کرنا تھی، سو وہ ناشتے کے بعد ہی فیشل وغیرہ کے لیے اپنی بیوٹیشن کے پاس چلی گئی تھیں۔ علینہ کو بالوں کی کٹنگ کروانا تھی سو وہ بھی ان کے ساتھ تھی اور کیپٹن اسجد تنہائی دور کرنے کے لیے اس وقت عنیزہ کے کمرے میں بیٹھا اس کا سر کھا رہا تھا۔ بلکہ یہ عنیزہ کا بھی نہیں عبدالعلی کا کمرہ تھا جہاں اس کے کمپیوٹر پر وہ سی وی

بنانے آئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

کرنل تاجدار کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑے بیٹے اسعد کو ایم بی بی ایس کے بعد امریکہ میں ہی فیلوشپ مل گئی تھی اور آج کل وہ وہیں مقیم تھے۔ اس سے چھوٹا اسجد تھا جو ان کی خواہش پر آرمی میں گیا تھا اور اب کیپٹن تھا جب کہ علینہ سب سے چھوٹی تھی اور اس وقت یونیورسٹی کی طالبہ تھی اس کا ارادہ فزکس میں ڈاکٹریٹ کرنے کا تھا۔

عنیزہ اور عبدالعلی کرنل تاجدار کی بہن کے بچے تھے۔ عبدالعلی ساتویں میں تھا اور عنیزہ کلاس تھری میں تو ان کے والدین کار کے حادثے میں ان سے جدا ہو گئے تھے۔ میجر ڈاکٹر عابد علوی اور ان کی بیوی ڈاکٹر آصفہ علوی اپنے ایک کولیگ ڈاکٹر کے ذاتی کلینک کے افتتاح کے سلسلے میں ہونے والی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے جا رہے تھے کہ پیچھے سے آتا ہوا بھاری ٹرک ان کی کار کو کچلتا چلا گیا تھا۔ ڈاکٹر عابد کا کوئی قریبی عزیز نہ تھا۔ نہ والدین نہ بہن بھائی سو عنیزہ اور علی کی ذمہ داری نانی کو اٹھانا پڑی تھی۔ مالی لحاظ سے تو کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اسلام آباد کی کوٹھی کرائے پر دے کر نانی دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لاہور لے آئی تھیں۔ جہاں وہ اکیلی ہی رہتی تھیں اکلوتے بیٹے کرنل تاجدار کی پوسٹنگ مختلف علاقوں میں ہوتی رہتی تھی اور وہ سال چھ مہینے کے بعد کبھی ماں کے پاس چکر لگا جاتے تھے لیکن پچھلے دو سال سے ان کی فیملی لاہور میں ہی تھی۔ ان کی پوسٹنگ کھاریاں میں ہو گئی تھی اور انہوں نے وہاں کی بجائے اپنے ذاتی گھر میں ماں کے پاس رہنے کو ترجیح دی تھی۔ گو ماڈل ٹاؤن میں ان کا آبائی گھر خاصا بڑا اور اچھا بنا ہوا تھا لیکن ان کی بیگم جہاں آرا تاجدار نے شروع میں خاصی ناک بھوں چڑھائی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کھاریاں میں ہی رہنا چاہ رہی تھیں۔

''جہاں تک علینہ کی تعلیم کا مسئلہ ہے وہ ہوسٹل میں رہ لے گی ہمیں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ پھر شروع سے بچے اور ہم ایک مخصوص ماحول میں رہنے کے عادی رہے ہیں۔ ہر ویک اینڈ پر آ جایا کریں گے۔''

لیکن کرنل تاجدار نے ان کی بات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ جہاں آرا کی بہت ساری باتیں مان لینے کے باوجود وہ کبھی کبھار اپنی بات بھی منوا لیتے تھے۔

''میں اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ اتنے سالوں سے وہ تنہا رہ رہی ہیں۔

بچے اور تم یہاں رہو گے تو میں بھی ہر ویک اینڈ پر آ جایا کروں گا۔ ماں جی بھی خوش ہوں گی۔''

''تنہا کہاں، عنیزہ اور عبدالعلی بھی تو ہیں۔''

''عبدالعلی اور عنیزہ کے سلسلے میں میرا بھی فرض بنتا تھا کہ ان کا ساتھ دیتا گو مالی پرابلم تو نہیں تھا انہیں، عابد بھائی اور آصفی کا بہت کچھ ہے ان کے پاس لیکن......''

''آتے تو رہتے تھے ہم۔''

''کبھی کبھار کے آنے اور ذمہ داریاں سنبھالنے میں بڑا فرق ہوتا ہے جہاں آرا بیگم۔''

اور پھر انہیں خاموش ہونا پڑا تھا۔ گھر آنا جانا تو لگا رہتا تھا۔ بہت شروع میں بھی جب عنیزہ کے والدین کے حادثے کو سال بھر ہوا تھا تو کرنل تاجدار کی پوسٹنگ لاہور میں ہو گئی تھی اور اس وقت سال بھر کے لیے سب کو اکٹھے رہنے کا موقع ملا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنی بے تکلفی نہ تھی جتنی اب ان دو سالوں میں ہو گئی تھی۔ اسجد کی پوسٹنگ چند ماہ پہلے ہی کوئٹہ ہوئی تھی اور وہ پورے تین ماہ بعد آیا تھا۔ کرنل تاجدار بھی دس بارہ دن بعد چکر لگا لیتے تھے۔ جہاں آرا بھی ایڈجسٹ ہو گئی تھیں۔ بیگم کرنل ہدایت اللہ کے ساتھ مل کر انہوں نے کئی این جی اوز کی رکنیت حاصل کر لی تھی۔

اسجد نے جو بغور عنیزہ کی پشت پر لمبے سیاہ بالوں کو لہراتے دیکھ رہا تھا۔ پوچھا۔

''نانو سو رہی ہیں کیا؟''

''ہاں، صبح جلدی اٹھ جاتی ہیں اس لیے ناشتہ کر کے سو جاتی ہیں۔'' عنیزہ نے کمپیوٹر آف کر کے اسے دیکھا۔

''کتنے دن کا پروگرام ہے؟''

''صرف چار دن۔''

''اتنے تھوڑے دن۔'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''کہو تو زیادہ دن رک جاؤں بلکہ حکم کرو تو واپس ہی نہ جاؤں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو اسجد؟'' عنیزہ کے رخساروں پر رنگ سا بکھرا جسے اسجد نے بے حد دلچسپی سے دیکھا۔

''سمجھنے کی کوشش کیا کرو عینی! ان باتوں میں بڑے معنی ہوتے ہیں۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سی وی عنیزہ کے ہاتھوں سے لے لی۔

''عادلہ چوہدری۔'' اس نے پڑھا۔

''واہ بھئی واہ! بڑی لائق فائق ہیں یہ بی بی بھی۔''

''جی!'' عنیزہ نے خوش ہو کر کہا۔'' عادلہ بہت لائق ہے۔ شروع سے ہی ہر جماعت میں اول آتی ہے۔''

''پہلے تو تم نے کبھی ان کی ان خوبیوں سے متعارف نہیں کرایا۔''

ایک بات تو بتاؤ تم دونوں کیا ایک ہی جاب کے لیے انٹرویو دینے کے لیے جا رہی ہو۔ اگر ایسا ہے تو پھر تم تو گئیں کام سے۔''

''نہیں' آج تو مجھے عادلہ کے ساتھ جانا تھا ویسے عادلہ پہلے سے ہی جاب کر رہی ہے۔ ایک پرائیویٹ چینل ہے وہاں پر خبروں کی ایڈیٹنگ وغیرہ کرتی ہے لیکن وہ مطمئن نہیں ہے اپنی جاب سے' دراصل وہ کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتی ہے اس سے بہتر۔''

''اور تم......''

''میں' مجھے آفس ورک وغیرہ کرنا مشکل لگتا ہے۔ میرا ارادہ کسی کالج میں جاب کرنے کا ہے۔''

''ویسے ایک اور جاب بھی ہے اگر تم کرنا چاہو تو۔''

''کون سی؟'' عنیزہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''میاں اور بچوں کی جاب۔''

''اسجد تم......!'' اس کے رخساروں سے جھلکتی سرخی گہری ہو گئی اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا عادلہ السلام علیکم کہتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔

''بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے۔'' اسجد چہکا۔

''یہاں بڑی دیر سے لوگ انتظار کر رہے تھے۔'' اس نے عنیزہ کی طرف اشارہ کیا۔

''سوری عینی! تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ وہ دراصل بھابھی کو عابی کے ساتھ ہاسپٹل جانا تھا۔ تو میں پہلے ان کے ساتھ چلی گئی۔ تمہیں تو پتا ہے کہ کہیں اکیلے جانے سے وہ کتنا

گھبراتی ہیں۔

''کیا ہوا تھا عابی کو؟''

''وہ گلے میں کچھ تکلیف تھی اور ٹمپریچر بھی۔ اسکول میں کھٹی چیزیں کھا لیتا ہے اوپر سے ٹھنڈا پانی اور پھر یہ پاپڑوں اور چپس کے نام پر خوبصورت پیکٹوں میں جو میٹریل ملتا ہے نا کھٹائی میں رچا ہوا اس نے بچوں کو مسلسل بیمار کر دیا ہے کبھی جو عابی کا گلا ٹھیک رہتا ہو۔'' اس نے تفصیل سے بتاتے ہوئے اسجد کی طرف دیکھا وہ کھنکارا۔

''خاتون ایک نظر کرم ادھر بھی۔''

''اوہ ہاں' کیسے ہیں آپ اسجد بھائی! کب آئے؟''

''رات کو اہل لاہور کی محبت میں بھاگا آیا ہوں اور یہاں کی مخلوق اس قدر بے وفا ہے کہ جی چاہ رہا ہے ابھی واپس پلٹ جاؤں۔'' اس نے برا سامنہ بنایا تو عادلہ مسکرا دی۔

''کیوں عینی! مناسب پروٹوکول نہیں دیا کیپٹن صاحب کو۔ کیا خبر آنے والے سالوں میں اپنی تاریخ کو دہراتے ہوئے پاکستان کی سربراہی کے حق دار ٹھہرائے جائیں۔''

''بالکل بالکل......'' اسجد نے سر ہلایا اور پھر چونک کر عادلہ کی طرف دیکھا۔

''کیا کہا تھا۔''

''بات دہرائی جائے تو اپنا حسن کھو دیتی ہے۔''

''ہونا صحافی کی بہن۔ طنز کرنے کے ہنر سے آشنا۔''

''عینی غور کرنا کل کو تم سے بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔''

''ارے ہاں اپنے عبدالعلی بھائی بھی تو۔'' اسجد نے کان کھجائے۔

''ویسے آج کل ان کے کالموں کی دھوم ہے۔ کیا بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ بلکہ لوگ شیخ صاحب کا اخبار صرف ان کے اور محب اللہ کے کالموں کی وجہ سے خریدتے ہیں۔''

''ہاں! بھائی جان بھی بتا رہے تھے' سرکولیشن کافی بڑھ گئی ہے ورنہ درمیان میں تو نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی کہ شیخ صاحب اسے بند کرنے کا سوچنے لگے تھے۔''

عادلہ نے تائید کی۔

''تم دونوں باتیں کرو میں تمہارے لیے پانی لے آؤں۔''

''کوک یا پیپسی نہ لانا۔''

''مجھے پتا ہے' میں اسکوائش بنا کر لاتی ہوں۔''

''کیوں کیا بائیکاٹ کر رکھا ہے؟''

''نہیں۔'' اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

''کس کس چیز کا بائیکاٹ کریں گے اسجد یہ تو ہماری رگوں میں اتر گئے ہیں اور ہمارے خون کو زہریلا کر دیا ہے انہوں نے۔'' اسے اپنے بابا جان کی بات یاد آ گئی تھی۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' اسجد بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''مجھے ویسے ہی پسند نہیں ہیں یہ پیپسی کوک اور اس طرح کے دوسرے مشروبات دراصل بابا جان اس کو محض پیسے کا زیاں سمجھتے ہیں' وہ کہتے ہیں'' یہ محض فیشن ہے ورنہ فائدہ وغیرہ کچھ نہیں۔''

''نہیں لسی پسند ہو گی؟'' اسجد نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں''

عادلہ اپنی سی وی دیکھ رہی تھی۔

''زیادہ نہیں لیکن کبھی کبھی پی لیتے ہیں گرمیوں میں۔ کہتے ہیں آم کھاؤ تو لسی ضرور ہی پینی چاہیے۔ دہی اور دودھ کو ملا کر بنائی گئی لسی۔'' عادلہ نے حسب معمول تفصیل سے بات کی۔

اسجد کو سادہ سی عادلہ اچھی لگتی تھی۔ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف گندمی رنگت' بڑی بڑی چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں' لانبا قد اور سیدھی مانگ نکال کر بنائے ہوئے بال۔ بڑی سی چادر لپیٹے چہرہ چھپائے اس گھر میں عنیزہ کے پاس آتے اس نے بارہا اسے دیکھا تھا' اس سے باتیں کی تھیں۔ اتنی سادگی کے باوجود بلا کی خود اعتمادی تھی اس میں اور اس نے کئی بار عنیزہ سے عادلہ کی اس خوبی کی تعریف کی تھی اور وہ عنیزہ کی یہ خواہش بھی جانتا تھا کہ عنیزہ اسے عبدالعلی کے لیے بہت پسند کرتی ہے اور اس کی شدید خواہش ہے کہ عادلہ اس کی بھابھی بنے لیکن عبدالعلی فی الحال اس موضوع پر بات کرنے کے لیے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔

یہ سب سوچ کر اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے سوچا کہ آج ضرور وہ عبدالعلی کو اس حوالے سے کریدے گا کہ موصوف کے دل میں کیا ہے۔

عنیزہ اسکوائش لے آئی تھی۔

''ماں جی جاگ گئیں''

اس کے ہاتھ سے اسکوائش لیتے ہوئے اسجد نے پوچھا۔

''نہیں نانو ابھی سو رہی ہیں۔''

''اچھا...... اور تم دونوں کیسے جاؤ گی؟''

''رکشہ لے لیں گے۔''

''میں چھوڑ دوں گا۔ یوں بھی مجھے احمر سے ملنے جانا ہے۔'' جلدی سے گلاس خالی کر کے ٹیبل پر رکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

''میں گاڑی کی چابی لے کر آتا ہوں۔''

''یہ اسجد......'' عادلہ نے اس کے جانے کے بعد ایک گہری نظر عنیزہ پر ڈالی۔

''مجھے لگتا ہے جیسے تم میں بہت انٹرسٹڈ ہے۔''

''پتا نہیں۔'' عنیزہ نے نظریں چرا لیں۔ وہ بھی اسجد کی وارفتگیوں کو سمجھ رہی تھی، لیکن اسے جہاں آرا سے خوف آتا تھا۔ ان کے مزاج کے رنگ پل میں بدلتے تھے۔ وہ یہاں رہ تو رہی تھی لیکن ان کی رہائش اپنے ہی پورشن میں تھی جو ان کے آنے پر نانو نے کھلوا دیا تھا۔ اپنا کچن الگ تھا جہاں خانساماں اور دوسرے ملازم تھے۔ عنیزہ' نانو کے کمرے کے ساتھ ہی عبدالعلی کا کمرہ تھا باقی گھر کے کمرے بند ہی رہتے تھے۔ ہاں ڈرائنگ روم کھلا رہتا تھا لیکن جب کرنل تاجدار نے ادھر رہائش کا پروگرام بنایا۔ تو نانو اوپر والے پورشن میں اٹھ آئی تھیں۔ یہاں بھی وہ نانو کے کمرے میں رہتی تھی اور ساتھ والا کمرہ اس نے عبدالعلی کے لیے سیٹ کر دیا تھا۔ سامنے ٹی وی لاؤنج تھا۔ ساتھ سٹنگ اور ٹی لاؤنج کے ساتھ ہی کچن تھا۔

نانو کی پرانی ملازمہ اوپر کا سب کام کر جایا کرتی تھی۔ البتہ جب سے وہ یونیورسٹی سے فارغ ہوئی تھی تو عنیزہ کچن میں نانو کا ہاتھ بٹانے لگی تھی بلکہ اس نے ایک طرح سے نانو کو فارغ ہی کر دیا تھا اور کچن کی ساری ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ جہاں آرا کے مزاج میں سختی تھی اور وہ عبدالعلی اور عنیزہ سے کم ہی مخاطب ہوتی تھیں۔ البتہ بچے چند ہی دنوں میں گھل مل گئے تھے۔ علیزہ اور اسجد گھر پر ہوتے تو زیادہ وقت اوپر ہی گزارتے۔ شروع میں وہ اوپر شفٹ ہونے پر اپ سیٹ ہوئی تھی تو نانو نے پیار سے اسے سمجھا دیا تھا۔

''جہاں آرا اور مزاج کی ہے، شروع سے الگ رہی ہے اپنے میاں کے ساتھ حالانکہ شروع میں تاجدار نے کہا بھی تھا کہ اماں جی جہاں آرا یہیں رہے گی آپ کے پاس لیکن میں نے کہا۔ نہ پتر تیرے سکھ کے لیے بیاہا ہے نہ کہ اپنے لیے۔ تو عینی بیٹا! میں نہیں چاہتی کوئی بات ہو۔ مزاج کی تیز ہے نا۔''

اور واقعی ان دو سالوں میں کوئی بات نہ ہوئی تھی۔

نانو کا جی چاہتا تو نیچے جا کر بیٹھی رہتیں اسے بھی لے جاتیں جہاں آرا سے بھی گپ لگتی لیکن عنیزہ نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ جہاں آرا مامی بڑے تکلف سے بات کرتی تھیں۔ کسی بات کا جواب دیتیں تو یوں جیسے بحالت مجبوری دے رہی ہوں۔ اس لیے اسجد کی واضح پسندیدگی کے باوجود نظر انداز ہی کرتی تھی۔

''شاید تم نے کبھی اپنی طرف اٹھتی اس کی نظروں پر غور نہیں کیا عینی!'' عادلہ نے خالی گلاس ٹیبل پر رکھا۔

''شاید...... لیکن میرا خیال ہے، تمہیں وہم ہوا ہے ایسی کوئی بات نہیں۔'' عنیزہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چلو اب۔''

''ہاں چلو۔'' عادلہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نانو کو بتادوں۔'' اس نے چادر اوڑھتی ہوئی عادلہ کو دیکھا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں، نانو کو سلام کرلوں۔'' اور وہ دونوں آگے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئیں۔

☆ ☆ ☆

''لعنت ہے ہم پر۔ مجھے تو اپنے آپ سے شرم آرہی ہے۔ یہ ہم ہیں۔'' عبدالعلی نے چلتے چلتے کوئی پچاسویں بار کہا۔

''کیوں...... کیا کیا ہے ہم نے۔ ایسا کیا ہوگیا ہے جس پر تمہیں شرم آرہی ہے ؟''

چوہدری عظمت اللہ نے چلتے چلتے ذرا سی دیر کو رک کر اسے دیکھا۔

''بس ہم نے کام ذرا وقت سے پہلے ختم کرلیا ہے اور وقت سے پہلے گھر جارہے

ہیں اور یہ کوئی اتنی بڑی بددیانتی ہرگز نہیں ہے۔ ارے جہاں لوگ اتنی بڑی بددیانتیاں کررہے ہوں، وہاں ہمیں اس ذرا سی بددیانتی پر شرمانا بالکل نہیں چاہیے جبکہ ہمارا کام ہوچکا ہے۔''

عبدالعلی نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا اور پھر اس کے قدم بہ قدم چلنے لگا۔

دراصل شیخ صاحب آج آفس نہیں آئے تھے اور اخبار تیار تھا۔ یہ ایک ہفت روزہ ایڈیشن تھا۔ شیخ صاحب نے کچھ عرصہ پہلے اسے شروع کیا تو ان کا خیال تھا کہ یہ محض ایک دینی اور مذہبی ایڈیشن ہوگا۔

''ندائے اسلام'' کے نام سے اس ہفتہ وار اخبار کی سرکولیشن بہت کم تھی۔ پھر ہولے ہولے اس میں سیاسی مضامین اور حالات حاضرہ پر تبصرہ چھپنے لگا۔ ایک صفحہ خواتین کے لیے مختص کردیا گیا اور ایک بچوں کے لیے۔ ٹی وی پروگراموں پر بھی تبصرے ہونے لگے۔ یوں دال روٹی کا سلسلہ چل پڑا تھا۔

شیخ صاحب نے جوانی میں ہی اخبار نکالنے کا خواب دیکھا تھا لیکن ایک متوسط طبقے کا شخص جس کی تنخواہ سے بمشکل جسم و جاں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہوں وہ بھلا ایسے خواب کہاں افورڈ کرسکتا ہے۔ شیخ صاحب ملازمت کرتے رہے اور یہ خیال ان کے اندر جڑ پکڑتا رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے ساری جمع پونجی اس اخبار میں لگادی تھی۔

انہوں نے محسوس کیا تھا کہ معاشرے میں دین سے متعلق علم کی بہت کمی ہے۔ بہت سی غلط باتیں رائج ہوچکی ہیں۔ جس نے جو سنا اسی پر یقین کرلیا اور وہ جو ایک روزنامے کا خواب دیکھتے تھے۔ جو ایک روز ملک کا سب سے بڑا روزنامہ ہوگا انہوں نے اس ہفت نامے کو ہی خواب کی تعبیر جان لیا۔ ایسے میں انہیں پہلے چوہدری عظمت اللہ جیسا صحافی جو ایک بڑے اخبار میں کام کرچکا تھا اور کسی رنجش کی بنا پر استعفیٰ دے کر نوکری کی تلاش میں تھا مل گیا اور پھر محب اللہ اور عبدالعلی جیسے مخلص کارکن میسر آگئے، یوں اس اخبار کی ڈوبتی نیا تیرنے لگی تھی۔

عبدالعلی اور محب اللہ دونوں اس اخبار سے منسلک ہوئے تھے جب امریکہ نے افغانستان پر حملہ کیا تھا اور ایسے میں ان کے کالموں اور تجزیے نے دھوم مچادی تھی اور اخبار کی

سرکولیشن ایک دم بڑھ گئی تھی۔ شیخ صاحب نے ایک پرانی سی بقول عظمت اللہ کے موہنجوداڑو کے زمانے کی سوزوکی خرید لی تھی اور کارکنوں کو بھی مناسب تنخواہیں مل رہی تھیں۔ شیخ صاحب کا اصول تھا کہ کام بھلے ہو جائے لیکن چھ بجے سے پہلے کوئی دفتر سے بغیر ضروری کام کے نہیں اٹھ سکتا تھا۔

وہ تقریباً چار بجے فارغ ہو چکے تھے۔ آج محبّ اللہ بھی نہیں تھا۔ دو دن قبل وہ اپنے علاقے میں گیا تھا اس کا تعلق جنوبی وزیرستان سے تھا اور عبدالعلی کے ساتھ اس نے پنجاب یونیورسٹی سے ہی جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا۔ دونوں بہت گہرے دوست تھے عبدالعلی کچھ خاموش سا تھا۔

''محبّ اللہ کے بغیر دل نہیں لگ رہا یار؟''

چوہدری عظمت اللہ نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تو چل گھر چلتے ہیں۔''

''تمہارے گھر؟'' وہ خالی الذہن سا بیٹھا تھا۔

''ہاں! ہمارے گھر۔ بابا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ بہت دنوں سے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ کسی روز عبدالعلی کو گھر لاؤ۔ بہت دن ہو گئے آیا نہیں۔ اداس ہیں تمہارے لیے۔''

''اچھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

آج وہ ٹیکسی سے آیا تھا۔ اس کی گاڑی ورکشاپ میں تھی۔ یہ اس کی امی کی گاڑی تھی جسے نانو نے فروخت نہیں کرنے دیا تھا۔ ابو کی گاڑی تو حادثے میں تباہ ہو گئی تھی۔ اسے بھی اس گاڑی سے بہت محبت تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اسے ماں کے ہاتھوں کا لمس اسٹیرنگ پر محسوس ہوتا تھا وہ عجیب سے احساسات میں گھر جاتا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے یہ گاڑی اسے تنگ کر رہی تھی لیکن اس کا دل نہیں مانتا تھا اسے فروخت کرنے کو۔

''رکشہ یا ٹیکسی لے لیں، آج گاڑی نہیں ہے میرے پاس۔'' اس نے عظمت اللہ سے کہا۔

''ویگن میں چلیں گے۔'' چوہدری عظمت اللہ نے اپنی عینک درست کرتے ناک پر جمائی۔

''ہم غریب بندے ٹیکسی یا رکشہ افورڈ نہیں کر سکتے۔''

''پھر چوہدری کس بات کے ہو؟''

''صرف نام کے۔''

اس نے قہقہہ لگایا اور ویگن کو ہاتھ دیا۔ جو پہلے ہی بھری ہوئی تھی۔ تاہم انہیں جگہ مل گئی تھی اور ویگن میں اس کے بالکل پیچھے بیٹھی ہوئی دو لڑکیاں مسلسل بول رہی تھیں موضوع گفتگو عبدالقدیر خان تھے۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔'' لڑکی بار بار کہتی۔

''ایک بار وہ ہمارے کالج میں آئے تھے بطور مہمان خصوصی، میں نے بہت قریب سے انہیں دیکھا تھا ان کی گفتگو سنی تھی۔ میں پروگرام کی کمپیئرنگ کر رہی تھی۔ وہ شخص؟ وہ شخص جھوٹا اور بے ایمان نہیں ہو سکتا۔ رابعہ! یقین کرو مجھے اپنے فیس ریڈنگ پر بڑا یقین ہے میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔ کاش میں ایک بار ان سے مل سکتی رابعہ! ان سے کچھ باتیں پوچھ سکتی۔ پتا نہیں وہ کہاں ہوں گے کس حال میں ہوں گے۔ اب تو اخبارات میں ان کی خبریں بھی نہیں آتیں۔''

''کیا پتا وہ...... سب سچ ہو جو بتایا جاتا ہے۔''

''سچ بھی ہو تب بھی، تب بھی رابعہ! کیا قوم کے محسنوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے کیا------؟ نہیں رابعہ! ہم بہت کمینے ہیں----- بہت گھٹیا ہیں۔''

''فار گاڈ سیک فرح! یہ کیا باتیں کرنے لگی ہو لوگ سن رہے ہیں۔''

دوسری لڑکی نے اسے جھڑکا تو وہ چپ کر گئی۔

عبدالعلی کا بڑا جی چاہا کہ وہ مڑ کر اس لڑکی کو دیکھے لیکن یہ کتنا نامناسب ہوتا لیکن اس کا دل جیسے کسی گہرے بوجھ تلے دبنے لگا تھا۔ کوئی درد جاگ اٹھا تھا اور کسی زخم سے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔ وہ اپنے اسٹاپ پر اتر کر پیدل ہی گھر کی طرف چلنے لگے تھے۔ چوہدری عظمت اللہ کا گھر اسلامیہ پارک میں تھا۔ روڈ کراس کر کے وہ گلی میں آ گئے۔

''لعنت ہے ہم پر۔''

اس نے زیر لب پھر کہا تو چوہدری عظمت اللہ نے اسے گھورا۔

اس کا دل اس کا ذہن اس کا سارا وجود جیسے شرمسار تھا۔

''اور یہ ہم نے اچھا نہیں کیا۔'' اب وہ چوہدری عظمت اللہ کے گھر کے دروازے پر پہنچ چکے تھے۔

''کیا واپس چلیں؟'' چوہدری عظمت اللہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' عبدالعلی نے آنکھیں اٹھائیں۔ تاسف میں ڈوبی نظریں۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا، تم نے ان لڑکیوں کی گفتگو سنی تھی؟''

''اوہ ہاں۔'' چوہدری عظمت اللہ نے کان کھجائے۔

''واقعی لعنت ہے ہم پر، بڑے شرم کی بات ہے۔''

لیکن محب اللہ نے کہا تھا نا ہماری تاریخ ایسے ہی المیوں سے پر ہے۔ تو یہ بھی ہماری تاریخ کا ایک المیہ ہے۔''

اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان!
ہم نے تمہیں اعزازات سے نوازا
ہم نے تمہاری شان میں
قصیدے لکھے
تم ہمارے محسن تھے
تم نے ہمیں دنیا کی قوموں کی صف میں
سر اٹھا کر کھڑا ہونے کے قابل کیا
تم نے ہمیں ایٹمی طاقت بنایا
تم ہم میں سے تھے
اور ہمیں تم پر فخر تھا
ہم نے تمہیں پوجا کی حد تک چاہا
ہم نہیں جانتے تمہارے ساتھ کیا ہوا؟
ہم سچ اور جھوٹ کو الگ کرنے کے
ہنر سے نا آشنا ہیں
ہمارے ساتھ اتنی بار جھوٹ بولا گیا
کہ ہمیں سچ کی پہچان نہیں رہی؟

ہم نہیں جانتے کہ کس چیز نے تمہیں سچ کہنے سے روکا ہے؟
تم نے جو کہا
وہ ہمیں سچ نہیں لگتا
پتا نہیں یہ ہماری اندھی عقیدت
اور محبت ہے
یا تمہاری ذات کی سچائی اور خلوص
ہم حقیقت نہیں جانتے
پھر بھی ہم تم سے شرمندہ ہیں
ہاں! ڈاکٹر عبدالقدیر ہم تم سے بہت شرمندہ ہیں۔
یہ جاننے کے باوجود کہ ہماری شرمندگی
تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی
پھر بھی ہم تم سے شرمندہ ہیں
ہمارے سر تمہارے سامنے جھکے ہیں
اور ہماری آنے والی نسلیں
شاید ہمیں کبھی معاف نہ کریں

''السلام علیکم۔'' اپنے دھیان میں کھویا ہوا وہ چوہدری عظمت اللہ کے ساتھ صحن تک چلا آیا تھا۔ عادلہ کی آواز سن کر چونک کر اس نے سر اٹھایا۔

''وعلیکم السلام۔''

عادلہ کے گندمی رنگ کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی تھی اور سیاہ آنکھوں کی چمک یکدم بڑھ گئی تھی۔

''کیسی ہیں آپ؟'' عبدالعلی نے بمشکل اپنے آپ کو خیالات سے آزاد کیا۔

''فائن۔'' وہ مسکرائی۔

''آپ بہت دنوں بعد آئے۔''

''بس مصروفیت تھی۔''

اس نے ایک گہری نظر عادلہ پر ڈالی۔ بے نام سی خوشی اس کے چہرے پر رقص

کر رہی تھی۔کئی بار اس نے محسوس کیا تھا کہ عادلہ اس کے لیے اپنے دل میں کوئی خاص جذبہ رکھتی ہے۔عادلہ اچھی لڑکی تھی۔وہ اس کی عزت کرتا تھا اور اس کے خیالات کو پسند کرتا تھا لیکن اس کے علاوہ اس نے اس کے لیے کبھی نہیں سوچا تھا۔گو وہ عنیزہ کی خواہش سے بھی کسی حد تک باخبر تھا لیکن ابھی اس کی زندگی میں کسی دوسرے فرد کی گنجائش نہ تھی۔

''بابا جان کدھر ہیں؟'' چوہدری عظمت اللہ نے پوچھا۔

''بڑے کمرے میں ہیں'ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔'' عادلہ نے بتایا۔

''اچھا تم فٹافٹ اچھی سی چائے پلواؤ'اچھی سی چائے کا مطلب جانتی ہونا۔ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ہم بابا کے کمرے میں ہیں۔آؤ یار!''

وہ عبدالعلی کو اشارہ کرتے ہوئے بڑے کمرے کی طرف بڑھا۔

صحن کو طے کرنے کے بعد برآمدہ آتا تھا۔برآمدے کے آگے گرل تھی اور سامنے ہی دو کمرے تھے ایک کمرہ بائیں طرف تھا۔دائیں طرف کچن تھا اور صحن کے ایک طرف کچھ کیاریاں بنی ہوئی تھیں۔جن میں گلاب اور موتیا کے پھول کھلے ہوئے تھے۔اوپر بھی دو کمرے تھے یہ کمرے چوہدری عظمت اللہ کی شادی کے بعد بنوائے گئے تھے۔عبدالعلی نے ایک سرسری نظر صحن اور پھر برآمدے پر ڈالی۔یہ ایک ایسا ہی گھر تھا جیسے عام متوسط گھرانوں کے ہوتے ہیں۔

''آپ جب بھی آتے ہیں ضرور یہاں رک کر پورے گھر کو ایک نظر دیکھتے ہیں۔'' عادلہ کی نظر بڑی گہری تھی۔عبدالعلی بے اختیار مسکرایا۔

''میں یہاں اس گھر کے صحن میں رک کر اس اپنائیت کو کھوجتا اور محسوس کرتا ہوں جو یہاں آ کر ہوتی ہے۔'' عادلہ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

''اس گھر میں ہمیشہ آپ کو اپنائیت ہی ملے گی۔بھلے اور کچھ......''

''تھینکس'' عبدالعلی اس پر ایک نظر ڈالتا چوہدری عظمت اللہ کے پیچھے صحن اور برآمدہ پار کر کے بڑے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''ارے میرا بیٹا آیا ہے۔'' ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے بابا یکدم اٹھے اور اسے گلے سے لگایا۔

''بہت دنوں بعد آئے ہو۔''

''بس بابا! مصروفیت ہی رہی۔''

''بہت اچھا لکھ رہے ہو لیکن یہ عظمت اللہ''

انہوں نے بیٹھتے ہوئے عظمت اللہ کی طرف اشارہ کیا۔

''بزدل ہے۔سچ کہتے ہوئے ڈرتا ہے۔سچ اس طرح ڈر ڈر کر بولتا ہے جیسے جھوٹ بول رہا ہو اور سچ کو مصلحت کے ملبوس میں چھپا دیتا ہے۔'' عظمت اللہ نے کان کھجاتے ہوئے عینک ناک کی پھننگ پر رکھی اور سر جھکا لیا۔

دراصل چوہدری عظمت اللہ نے بتیس سال کی عمر میں ہی زندگی کو بہت قریب سے دیکھ لیا تھا۔جرنلزم میں فرسٹ پوزیشن لے کر گولڈ میڈل جیت کر جب وہ ایک اخبار سے منسلک ہوا تو بہت جلد اس نے جان لیا کہ اس ملک میں جینے کے لیے ضروری ہے کہ سچ کو سچ نہ کہا جائے بلکہ وہ کہا جائے جو مصلحت کا تقاضا ہو۔

لیکن اتنی سی بات جاننے اور سمجھنے کے لیے اسے تین اخباروں سے نکلنا پڑا تھا اور اب جا کر اس نے حقیقت جانی تھی۔

وہ ان لوگوں میں سے تھا جو سچ کی حقیقت جانتے تھے۔جو برائی سمجھتے تھے۔لیکن سمجھنے کے باوجود وہ کھل کر سے برا کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے۔وہ جانتا تھا کہ عبدالعلی کا قلم بھی ایک دن ہار جائے گا اگر شیخ صاحب اس کے لکھے گئے میں اتنی قطع و برید نہ کرتے تو اب تک ضرور اس کی چھٹی ہو گئی ہوتی۔جب آخری بار اس کی جاب ختم ہوئی تھی تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اپنے قلم کو اتنا آزاد نہیں چھوڑے گا۔اس کا ایک بیٹا تھا'ایک چھ ماہ کی بیٹی تھی اور اس نے ان کے لیے بہت سے خواب دیکھ رکھے تھے اور ان خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے ضروری تھا کہ وہ اپنے قلم کو مصلحت کا ملبوس پہنا دے۔بابا کو اس کا نیا انداز پسند نہ تھا۔وہ اسے بزدل سمجھتے تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے'جو وہ جانتا تھا۔

اس ملک میں سب کچھ آزاد ہوتے ہوئے بھی کچھ آزاد نہ تھا۔نہ قلم نہ زمین نہ ہاتھ سب کچھ گروی رکھا ہوا تھا ان کے پاس جو خود کو سپر پاور کہتے تھے اور نہیں جانتے تھے۔سپر پاور تو صرف اللہ کی ذات ہے۔

''آپ کیا دیکھ رہے تھے بابا؟'' عبدالعلی ان کی بات نظرانداز کرتے ہوئے ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''کیا دیکھ رہا تھا؟'' ان کے لہجے میں دکھ سا اتر آیا۔
''یہاں عراق سے متعلق خبریں دکھا رہے تھے وہی دیکھ رہا تھا۔ نجف اور کوفہ کے دفاع کے لیے مقتدی الصدر نے جمعہ کے خطبہ کے بعد تقریر کی اور اس کے بعد فلوجہ پر حملہ کے بارے میں خبر دکھائی ہے کہ اتحادیوں نے فلوجہ پر ہیلی کاپٹر سے بم گرائے، کئی عراقی شہید ہو گئے۔'' عبدالعلی کا دل بھی دکھ سے بھر گیا۔
''ہاں بابا! عراق میں امن وانصاف کا تو نشان تک نہیں رہا۔ امریکی جارحیت اور اس کی ظالمانہ کارروائیوں کے خلاف حریت پسند مسلمانوں کے ردعمل میں شدت آ رہی ہے۔''

''اور ابھی یہ شدت اور بڑھے گی۔ فدائی حملوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، وہ بہت طول کھینچے گا...... بہت۔'' بابا بہت افسردہ تھے۔
''آپ سے کہا تھا بابا مت دیکھا کریں یہ سب۔ اس روز بھی آپ کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا'' چوہدری عظمت اللہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔
حالانکہ جب بغداد پر حملہ ہوا تھا تو ہر وقت حالات سے باخبر رہنے کے لیے اس نے خود ہی کیبل لگوایا تھا حالانکہ وہ اس کے سخت خلاف تھا اور کیبل کے اثرات سے متعلق اس نے کئی کالم بھی لکھے تھے۔
بہر حال کیبل کا زیادہ استعمال صرف نیوز چینل کے لیے ہوتا تھا اور یوں بھی ٹی وی بڑے کمرے میں تھا جہاں بابا کا مستقل ٹھکانہ تھا۔ اس لیے بچوں کے کیبل سے متاثر ہونے کا امکان کم تھا یوں بھی عباد ابھی صرف پانچ سال کا تھا۔ عادلہ کو ٹی وی سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ یوں وہ خود کو تسلی دے لیتا تھا کہ بہر حال جب عباد بڑا ہو گا تو وہ کنکشن ختم کروا دے گا۔ فی الحال حالات سے باخبر رہنے کے لیے یہ ضروری تھا۔
''تم اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھا کرو۔''
چوہدری ہدایت اللہ نے ناراضگی سے اسے دیکھا تو عبدالعلی کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔
''کیا ہمارا اتنا بھی فرض نہیں بنتا کہ ہم ان کے حالات سے باخبر رہیں۔ ہم کچھ نہیں کر رہے ان کے لیے تو روئیں بھی نہ۔ کیوں عبدالعلی بیٹا! یہ اسلامی ملک آخر کیوں متحد

نہیں ہوتے، یہ آواز کیوں نہیں اٹھاتے۔ تم کیوں نہیں لکھتے عبدالعلی اللہ نے تمہیں قلم دیا ہے لکھنے کی طاقت عطا کی ہے پتر! الفاظ دیے ہیں پھر تم کیوں نہیں لکھتے کہ یہ سب اسلامی ملک متحد ہو کر ایک طاقت بن جائیں۔''
''بابا۔''
عبدالعلی نے بے بسی سے انہیں دیکھا ان کی سادگی پر اسے پیار بھی آیا اور رونا بھی۔
''آپ کو کیا پتا ہمارے لفظ کھوکھلے ہیں اور ہمارے قلم مجبور، یہ کسی دل میں کوئی جذبہ نہیں جگا سکتے، ہم سب بے حس ہو چکے ہیں یہ اسلامی ملک اگر متحد ہوتے تو مسلمانوں پر اتنی تباہی کیوں نازل ہوتی بابا۔
ہم نے اپنے اڈے امریکیوں کو دیئے تا کہ وہ یہاں سے ستاون ہزار آٹھ سو حملے افغانستان کی سرزمین پر کر لے۔ ہم نے چھ سو سے زائد افراد کو کیوبا بھجوایا محض اس شبے میں کہ ان کا تعلق القاعدہ سے ہے ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جنہوں نے القاعدہ کا نام تک نہ سنا تھا لیکن۔
ہم دوسروں کے سروں سے چادر کھینچ کر سمجھتے ہیں کہ ہم محفوظ ہیں۔''
وہ یکدم جذباتی ہو گیا تو بابا نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔
''نہ نہ پتر...... بدگمان نہیں ہوتے۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کبھی تو بھائی کے دل میں بھائی کا درد جاگے گا۔ ایسا نہیں سوچتے یہ تو مایوسی ہے۔ ناامیدی ہے۔''
''مگر کوئی تو آس ہو بابا کہیں سے تو کوئی روشنی کی کرن پھوٹے۔''
''جھلا نہ ہو تو۔'' بابا دھیمے سے ہنسے۔
''روشنی ہے تو، کیا حماس کے فدائین، کیا عراق میں ہونے والے اکا دکا فدائی حملے، روشنی کی وہ کرن نہیں ہیں جن سے مردہ ضمیر جاگیں گے؟ جو غیرت، حمیت کو بیدار کریں گے۔''

''پتا نہیں بابا۔'' چوہدری عظمت اللہ نے بیزاری سے کہا۔
''ابھی تو یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ یہ خودکشی ہے یا شہادت۔''
''تمہیں تو فیصلہ نہیں کرنا یہ۔'' ان کے لہجے میں ناراضگی در آئی۔

''جنہوں نے فیصلہ کرنا ہے' وہ فیصلہ کر کے ہی اپنے سینے سے بم باندھتے ہیں۔''

''مگر اس کا فائدہ بابا؟'' چوہدری عظمت اللہ نے بحث کی۔ ''دو یہودی ایک فدائی حملے میں ہلاک ہوتے ہیں تو دس فلسطینی بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ پندرہ عراقی مرتے ہیں اور ایک دو اتحادی یا امریکی مر جاتے ہیں تو کیا فائدہ' نقصان کس کا زیادہ ہو رہا ہے۔''

''یہ نفع ونقصان' سود و زیاں کی بات نہیں ہے۔ یہ جذبہ وایمان کی بات ہے یہ عزت سے اور آزادی سے جینے کی بات ہے یہ گیدڑ کی سولہ سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے' والی بات ہے۔ پر تیری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کیوں عبدالعلی پتر!''

انہوں نے عبدالعلی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی جذباتی کیفیت کے زیر اثر تھا۔

تب ہی عادلہ ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ چوہدری عظمت اللہ نے تپائی جو قدرے فاصلے پر پڑی تھی اٹھا کر سامنے رکھی عادلہ نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ' نمکو اور سموسے تھے۔ ایک ڈش میں پھلکیاں تھیں۔

''یار لو کچھ۔'' عظمت اللہ نے باؤل اس کی طرف بڑھایا۔

''یہ عادلہ پھلکیاں بہت مزے کی بناتی ہے۔''

''نہیں عظمت! میں صرف چائے لوں گا۔''

''لیکن دن میں بھی تم نے کچھ نہیں کھایا' کچھ تو لے لو یہ سموسہ۔''

''نہیں' ایک بسکٹ لے لیتا ہوں کچھ بھی جی نہیں چاہ رہا۔'' عادلہ جو ابھی تک کھڑی تھی۔ اس نے چائے دانی سے چائے کپ میں ڈالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

''تھینکس۔''

''آج کل کیا ہو رہا ہے؟''

عبدالعلی نے ذہن کو ریلیکس کرنے کی کوشش کی۔

''جاب کی تلاش۔'' عادلہ' عظمت اللہ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ارے ہاں' تمہارے انٹرویو کا کیا بنا؟'' بابا کو اچانک یاد آیا۔

''پتا نہیں۔'' عادلہ نے کندھے اچکائے۔

''دے دیا تھا لیکن امید کم ہے۔ انہوں نے کچھ خاص سوال نہیں کیے۔ لگتا ہے

سلیکشن پہلے ہی ہو چکی ہے۔''

''چلو خیر ہے پھر سہی۔ جابز تو نکلتی ہی رہتی ہیں' اخبارات بھرے ہوتے ہیں اشتہارات سے۔''

''اور پتہ نہیں یہ جابز کن کو ملتی ہیں۔'' عادلہ نے تلخی سے کہا۔

وہ پڑھائی مکمل کرنے کے بعد تقریباً بیسیوں جگہ انٹرویو دے چکی تھی۔ یہ عارضی جاب جو وہ کر رہی تھی یہ بھی عظمت اللہ نے کسی سے کہہ کر دلوائی تھی۔

''مل جائے گی' مل جائے گی تمہیں بھی۔''

بابا نے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے اسے تسلی دی۔

وہ ہمیشہ پر امید رہتے تھے۔ پچیس سال تک انہوں نے ایک اسکول میں پڑھایا تھا اور بڑی صاف ستھری زندگی گزاری تھی۔ جب پاکستان بنا تو وہ تین چار سال کے تھے انہیں پاکستان اور قائداعظم سے عشق تھا۔ ان کے والد تحریک آزادی کے پر جوش رکن تھے سو ان کے لہو میں بھی یہ شامل تھا۔ چوہدری عظمت اللہ اور عادلہ ان کی دو ہی اولادیں تھیں۔ عادلہ' عظمت اللہ سے سات سال چھوٹی تھی۔ ابھی میٹرک میں تھی جب والدہ کا انتقال ہو گیا تھا اور چوہدری ہدایت اللہ اور عظمت دونوں نے ہی اس کے لاڈ اٹھاتے تھے اس لیے اس میں خود اعتمادی بہت تھی۔

''عادلہ!''

عبدالعلی کو اچانک خیال آیا کہ شیخ صاحب خواتین کے صفحے کے لیے خاتون انچارج رکھنا چاہ رہے تھے۔ عادلہ کے دل کی دھڑکنیں یکدم مرتعش ہوئیں۔

عبدالعلی کا اس طرح نام لے کر پکارنا اسے بہت اچھا لگا۔

''آپ کو لکھنے سے کچھ دلچسپی ہے۔ یا لکھنے سے نہ بھی ہو۔ آپ خواتین کا صفحہ ترتیب دے لیں گی۔ اتنا مشکل نہیں ہوگا۔ ہم ہوں گے نا وہاں آپ کی ہیلپ کر دیں گے۔ ہمارے اخبار کے لیے ایک خاتون کی ضرورت ہے۔ خواتین کے صفحے کے لیے۔''

''میں کر لوں گی...... میں لکھ بھی لوں گی۔ مجھے بہت اچھا لگتا ہے لکھنا۔'' اس کی سیاہ آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''کیوں بابا کر لوں اخبار کی جاب؟''

''کرلو۔''

بابا نے کبھی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ پھر یہاں تو عظمت تھا، عبدالعلی تھا۔

''ٹھیک ہے میں بات کروں گا شیخ صاحب سے۔'' عبدالعلی نے خالی کپ میز پر رکھا۔

''اب چلوں۔''

''ارے کہاں چلے، کھانا کھا کر جانا۔'' عظمت اللہ نے جو بڑے دھیان سے گردوپیش سے بے خبر سموسہ پلیٹ میں رکھے کھا رہا تھا چونک کر سر اٹھایا۔

''نہیں یار! کھانا گھر پر ہی کھاؤں گا نانو اور عینی انتظار کرتی ہیں۔''

''فون کردو...... کیا پک رہا ہے عادلہ؟''

وہ خالی پلیٹ میز پر رکھ کر عادلہ سے مخاطب ہوا۔

''بھابھی پکا رہی ہیں۔ قیمہ کریلے ہیں۔ ساتھ میں آلو کی بھجیا بھی ہے۔''

''کھیر بھی بنالو، عبدالعلی کو پسند ہے۔''

''لیکن۔''

عبدالعلی نے کچھ کہنا چاہا لیکن عظمت اللہ نے ٹوک دیا۔

''چپ بیٹھے رہو اور مجھے چائے ڈال کر دو۔ میں چائے پی کر فون کر دیتا ہوں تمہارے گھر۔''

''میرے پاس موبائل ہے۔'' عبدالعلی نے جیسے ہار مان لی اور اس کے لیے چائے ڈالنے لگا۔

''بابا! آج آپ کے شاگرد نہیں آئے؟'' چائے پیتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''آج ان کی چھٹی ہے، جمعہ ہے نا۔'' بابا کے پاس کچھ بچے ٹیوشن پڑھنے آتے تھے۔

''اور چائے پئیں گے آپ؟'' عادلہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں شکریہ۔''

اس کی نظریں عادلہ کی نظروں سے جا ملیں۔ چمکتی سیاہ آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں جو رنگ دمک رہے تھے، وہ ان رنگوں کے معنی سمجھتا تھا بلکہ اس نے ان سے

نظریں چرالیں اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

''تو تم کل واپس جا رہے ہو؟'' عنیزہ نے ناشتہ ٹیبل پر لگاتے ہوئے پوچھا۔

اسجد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ویسے تمہیں میرے آنے یا جانے سے کیا فرق پڑتا ہے، ہے نا۔'' اس نے ایک گہری نظر عنیزہ پر ڈالی۔

بالوں کی ایک لٹ چٹیا سے نکل کر دائیں رخسار پر لہرا رہی تھی۔ گلابی رخساروں پر چمک تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے لٹ کو کان کے پیچھے کیا اور اسجد کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم ناشتے میں سلائس لو گے یا......''

''کیوں، مجھے یہ پراٹھے کاٹتے ہیں کیا۔''

اس کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔ اسے اپنی بات نظرانداز کیے جانے پر بہت غصہ تھا۔ عنیزہ نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی لیکن اسجد نے اس کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ کو دیکھ لیا اور یکدم نرم لہجے میں بولا۔

''عینی! جب تم مسکراتی ہو تو بہت اچھی لگتی ہو۔'' عنیزہ ٹپٹا گئی۔

''عینی۔'' اس کی آواز بھاری ہو گئی۔

''عینی! تم بہت خوبصورت ہو۔ اتنی جتنا کہ کسی شاعر کا خیال، جتنا کسی مصور کا تخیل۔''

''اسجد۔'' عینی نے بمشکل نظریں اٹھائیں اور تیز دھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''ارشاد۔'' دایاں ہاتھ دل پر رکھ کر وہ تھوڑا سا جھکا۔

''فضول باتیں مت کرو۔'' وہ جھینپ گئی۔

''ہائے! سارے رومینس کا بیڑا غرق کر دیا تم نے۔'' وہ جھلا گیا۔

''کس قدر احمق لڑکی ہو تم۔ ہاں! اگر میں کسی اور لڑکی سے یہ سب کہتا تو وہ آسمانوں پر اڑنے لگتی۔'' وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''اور میں ''کسی اور لڑکی'' نہیں ہوں۔''
عنیزہ کی دھڑکنیں اعتدال پر آ گئی تھیں اور وہ اسجد کے چہرے پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔
''اس بات نے تو مار دیا ہے۔'' اسجد نے زیر لب کہا۔ عنیزہ نے گھور کر اسے دیکھا۔
''تم سنجیدہ نہیں ہو سکتے اسجد۔''
''مائی گاڈ! ابھی جب تم سے بات کر رہا تھا تو اتنا سنجیدہ تھا جتنا زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔'' عینی یکدم پلٹ گئی اسجد کی نظروں کی حدت نا قابل برداشت ہو گئی تھی۔
اس نے ٹی وی لاؤنج میں ہی کھڑے کھڑے آواز دی۔
''اب آ بھی جائیں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔''
پہلے نانو اور ان کے پیچھے عبدالعلی اپنے کف لنکس لگاتا اپنے کمرے سے نکلا۔
''ارے میرا بچہ آیا ہے۔''
نانو نے اسجد کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر چوما۔
''تم نے پہلے کیوں آواز نہیں دی عینی میں تو بس تلاوت کر ہی چکی تھی یونہی ستانے کو ذرا ٹیک لگائی تھی۔''
''ان کو تو غصہ آ رہا ہو گا کہ ایک پراٹھا اور بنانا پڑے گا۔''
''نہ نہ میری عینی ایسی نہیں ہے۔ بالکل اپنی ماں جیسی ہے فراخ دل۔ سادا مزاج' محبت کرنے والی۔''
''اچھا لیکن ہم سے تو محبت نہیں کرتیں۔'' اسجد نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔
''بچے! میری عینی تو ہر ایک سے محبت کرتی ہے۔''
''اور یار' تم سناؤ کب تک واپسی ہے؟'' عبدالعلی اس کے برابر ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔
''کل صبح نکلوں گا۔''
''بچے تو ابھی سب سو رہے ہوں گے۔''

''ہاں گیارہ بجے سے پہلے کس نے اٹھنا ہے اور ہم ٹھہرے سحر خیز فوجی بندے۔ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی سے دل بہلا رہا تھا کہ آملیٹ اور پراٹھوں کی خوشبو اور کھینچ لائی۔''
''ارے بچو! باتوں میں ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے شروع کرو۔''
نانو نے دونوں کی پلیٹ میں پراٹھے رکھے۔
''اور عینی بیٹا! تم بھی آ جاؤ کہاں چلی گئیں۔''
''نانو چائے کو دم دے کر آ رہی ہوں۔''
''ایک راز کی بات بتاؤں دادو!'' نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے اسجد نے کہا۔
''عینی جیسی چائے اور پراٹھے اور کوئی نہیں بنا سکتا۔۔۔۔۔ کتنی بار اپنے بیٹ مین سے کہا کہ آج ناشتے پر پراٹھے اور آملیٹ ہی کھلا دو۔۔۔۔ مگر یہ والا مزا نہیں آیا اور نہ ہی بازار سے خریدے ہوئے اچار میں یہ خوشبو ملی۔''
''یہ اچار تو میں خود ڈالتی ہوں بیٹا!''
''عینی کو بھی سکھا دیں۔ سسرال میں کام آئے گا۔''
اس نے بڑی معصومیت سے اندر آتی عینی کو دیکھا جو اسے گھورتے ہوئے نانو کے پاس ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی اور عبدالعلی کو دیکھ رہی تھی۔
''بھائی! آپ کو آج جانا ہے' آپ کی چھٹی نہیں ہے کیا؟''
''ہاں چھٹی تو ہے لیکن مجھے جانا ہے۔''
''ویسے علی! یار یہ اخبار کی جاب کچھ بور نہیں ہے؟''
''نہیں' ساری بات دلچسپی کی ہوتی ہے۔ جہاں دلچسپی ہو وہاں کچھ بھی بور نہیں ہوتا۔'' عبدالعلی نے ٹشو سے ہاتھ صاف کیے۔
''بھائی اور لیں نا آپ نے تو بالکل ذرا سا لیا ہے پھر سارا دن بھوکے رہیں گے۔''
''نہیں' آج جلد آ جاؤں گا اور باقی کا سارا دن اسجد کے نام۔''
''رئیلی عبدالعلی یار خوش کر دیا۔'' اسجد یکدم خوش ہو گیا۔ وہ عبدالعلی سے بہت بے تکلف تھا گو عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔ نانو بھی خوش ہو گئیں
''شکر ہے تم بھی کچھ دیر گھر پر نظر آؤ گے ورنہ میں تو ترس ہی گئی ہوں تم سے باتیں

کرنے کو' یہ اخبار کی نوکری۔۔۔۔۔تمہارے ماموں نے بھی کتنا منع کیا تھا اور کتنا جی چاہتا تھا میرا کہ اپنے ماں باپ کی طرح تم بھی ڈاکٹر بنو۔''

''نانو! میرا جس طرح کا مزاج اور رجحان تھا میں ڈاکٹر نہیں بن سکتا تھا۔''

''چلو ڈاکٹر نہیں بنے تھے تو کہیں کوئی اچھی نوکری کرتے' تاجدار نے کہا بھی تھا کہ وہ کسی اچھے ادارے میں تمہیں جاب دلوا دیں گے۔''

''ہاں! پاپا کہہ رہے تھے عبدالعلی! کہ تمہارا اخبار بھی بس ایویں سا ہی ہے تنخواہ بھی کچھ خاص نہیں۔''

''ہاں۔۔۔۔۔لیکن وہاں میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے' کہہ لیتا ہوں۔'' سب نہیں لیکن کچھ تو کہہ لیتا ہوں اسجد! اور اگر نہ کہوں تو دم گھٹ جائے میرا۔ مر جاؤں میں۔''

''اللہ نہ کرے بچے! صبح سویرے منہ سے اچھی بات نکالتے ہیں۔''

نانو دہل گئیں۔ عنیزہ نے چائے بنا کر عبدالعلی اور اسجد کے سامنے رکھی۔

''ویسے یار عبدالعلی!'' اسجد نے چائے کا کپ اٹھایا۔

''وہاں میس میں کچھ لوگ تمہارے کالمز کی بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن ایک بات تو بتاؤ یہ جو کچھ تم لکھتے ہو۔ یہ سب کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہی سب کچھ ہو رہا ہے۔ تمہارے پاس کیا ثبوت ہے اس کا۔ تم تو عراق سے ہزاروں میل دور یہاں بیٹھے ہو لیکن تمہارے کالم پڑھ کر لگتا ہے جیسے عراق میں بیٹھ کر لکھ رہے ہو اور پھر اتنا تاثر کیسے آ جاتا ہے۔''

''ثبوت اسجد! مائی کزن! ثبوت یہ ٹی وی چینلز جو سب دکھا رہے ہیں۔ بتا رہے ہیں اور اخبارات میں جو لکھ رہے ہیں۔ ساری دنیا کے اخبارات میں سب چھپ رہا ہے۔ کئی ویب سائیٹ ایسی ہیں جو لمحہ لمحہ کی خبریں دیتی ہیں اور پھر میرا دل ہے جو ان سب کو دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے اور جب میں خون دل میں اپنا قلم ڈبو کر لکھتا ہوں تو تاثر خود پیدا ہو جاتا ہے اور وہ غیر نہیں ہیں۔ اسجد! ہمارے اپنے ہیں۔ ہم ایک خدا' ایک رسول' ایک کتاب کے ماننے والے ہیں اسجد پھر ہمارا دل ان کے لیے کیوں نہ تڑپے' آنکھیں کیوں نہ آنسو بہائیں۔'' عبدالعلی جذباتی ہو گیا

''لیکن پاپا پارات کو کہہ رہے تھے کہ میڈیا بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے جیسے اب جنوبی وزیرستان کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ پاکستانی فوج امریکہ کے ساتھ مل کر اس پر چڑھائی کا ارادہ رکھتی ہے وغیرہ وغیرہ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔''

''کیا تم نہیں جانتے اسجد کہ ہم نے اپنوں کو خود اپنے ہاتھوں زنجیریں پہنا کر امریکہ کو سونپ دیا وہ چھ سو جوان جو کیوبا بھیجے گئے کیا ہمارے اپنے نہ تھے؟ اتنے ہی اپنے جتنے جنوبی وزیرستان کے رہنے والے ہیں۔''

''لیکن علی! وہ تو غیر ملکی تھے ان کا تعلق القاعدہ سے تھا۔''

''کیا ہمارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے اسجد۔ اگر ایسا تھا بھی تو عدالتوں میں اس کا فیصلہ ہوتا لیکن کیا ہماری عدالتیں اتنی ہی نا اہل ہیں کہ ہمارے اپنوں کا فیصلہ دوسرے کریں۔ لوگ تو اپنے مجرموں کو بھی دوسرے ممالک کے حوالے نہیں کرتے اور ہم نے اپنوں کو دوسروں کے آگے ڈال دیا جن کا جرم ابھی ثابت نہیں ہوا تھا۔

جانتے ہو اسجد! ان چھ سو میں ایک عبدالرحمٰن بھی تھا۔۔۔۔۔یہ لڑکا یونیورسٹی میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔ اپنے ملک سے دور وہ یہاں فزکس کی تعلیم حاصل کرنے آیا تھا لیکن اس کا جرم یہ تھا کہ وہ مصر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی سی بہن تھی ایک بوڑھا نابینا باپ تھا' ایک چھوٹا بھائی تھا اور ایک ماں تھی جس کی باتیں کرتا وہ کبھی نہ تھکتا تھا۔ ایک یونیورسٹی فنکشن میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور یوں ہمارے درمیان دوستی کا تعلق اور رشتہ بہت گہرا ہو گیا تھا۔ اسے سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اسامہ بن لادن کو اتنا ہی جانتا تھا جتنا تم اور میں جانتے ہیں۔ وہ اسکالرشپ پر یہاں آیا تھا۔ اس کے عزائم بہت بلند تھے۔ وہ سائنس دان بننا چاہتا تھا۔

لیکن اس کا جرم یہ تھا کہ مصر میں اس کے بوڑھے باپ پر الزام لگایا گیا کہ اس نے اسلامی عسکریت پسندوں کو پناہ دی تھی اور اسے گرفتار کر لیا گیا اس کے خاندان پر تشدد کیا گیا اور اس روز وہ بہت بے چین تھا جب چھوٹی بہن نے اسے فون پر روتے ہوئے بتایا تھا۔

''وہ بابا کو پکڑ کر لے گئے ہیں اور بھائی کو بھی۔ ماں کو انہوں نے ٹھڈے مارے ہیں۔''

اس روز اس نے واپسی کی کوشش شروع کر دی تھی۔ حالانکہ ابھی اس کا رزلٹ نہیں آیا تھا اور ابھی اسے کچھ دن اور رکنا تھا یہاں۔ وہ شاید ایئر پورٹ پر ٹکٹ لینے گیا تھا کہ اسے گرفتار کر کے خفیہ والوں کے حوالے کر دیا گیا۔ میں نے دوسرے روز کے اخبارات میں پڑھا۔ ایک مصری طالب علم کو القاعدہ کا رکن ہونے کے شبہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ میں اس کی رہائش گاہ پر گیا وہ وہاں نہیں تھا۔

وہ ساری چیزیں جو اس نے بڑے شوق سے اپنی بہن کے لیے خریدی تھیں وہ یونہی پیکٹوں میں بند رہ گئیں اور اسے شاید کیوبا بھیج دیا گیا...... کیپٹن اسجد تاجدار! وہ اتنا ہی معصوم اور انجان تھا جتنے کہ تم ـــــ لیکن ہم نے۔" وہ تلخی سے ہنسا۔ "ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ ہم نے اس بڑی طاقت کو خوش رکھنا ہے خواہ ہمیں اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے کاٹ کر اپنے سر اس کے سامنے رکھنے پڑیں۔"

وہ سب ساکت بیٹھے اسے سن رہے تھے۔ وہ خاموش ہوا تو کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا البتہ نانو نے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کر اٹھتے ہوئے عبدالعلی کی طرف بہت محبت و شفقت سے دیکھا اور دردمندی سے بولیں۔

"بچے! اتنا حساس نہ بن، نہیں تو زندگی مشکل ہو جائے گی۔"

"اور زندگی اب کون سا آسان ہے۔" عبدالعلی نے تلخی سے سوچا۔

ہر لمحہ دکھ دیتی اور اذیت دیتی ـــــ زندگی۔

اور وہ چوہدری عظمت اللہ کہتا تھا۔

"عبدالعلی! تیرے لیے زندگی بہت آسان ہے اور خوبصورت ــــ تیرے باپ کا اتنا پیسہ ہے تیرے اکاؤنٹ میں، تو چاہے تو زندگی بہت خوبصورت ہو جائے گی تیرے لیے لیکن تجھے خود شوق ہے زندگی کو مشکل بنانے کا۔ تو کیوں دوسروں کے غم میں ہلکان ہوتا ہے۔ پہلے تجھے افغانستان کا غم تھا۔ پھر تو مہینوں ایمل کانسی کے لیے روتا رہا۔ پھر سقوط بغداد پر تیرے لفظوں نے بین کیا اور اب تجھے اہل عراق کا غم ہے۔ تو نے عبدالقدیر خان کے لیے لفظوں کو لہو رلایا۔ یار عبدالعلی زندگی کو سوکھا کر لے اور ان سارے دکھوں کی گرد دل سے جھاڑ دے اور مزے کر۔" لیکن اس کے دل کی ساخت اللہ نے نہ جانے کیسی بنائی تھی کہ ہر دکھ اس کے اندر رفت ہو جاتا تھا۔

"عینی بیٹا! میں نیچے جا رہی ہوں۔ تم برتن سمیت کر بریانی کے لیے گوشت نکال دینا۔ پھر نیچے آ کر ماموں سے مل لو۔ تاجدار بہت شوق سے بریانی کھاتا ہے۔"

"اور دادو! میں بھی۔" اسجد نے خالی کپ عنیزہ کی طرف بڑھایا۔

"پلیز ایک کپ اور بنا دو۔ پھر تو وہاں جا کر اسحاق خان کے ہاتھوں کا بنا جوشاندہ ہی پینا ہے۔"

"او کے اسجد۔" عبدالعلی جو ابھی تک اپنی شدید جذباتی کیفیت کے زیر اثر خاموش کھڑا تھا دھیرے سے بولا۔

"انشاءاللہ واپسی پر پئیں گے۔"

"بھائی! لنچ گھر پر ہی کرنا۔ ماموں بھی ہوں گے۔"

"اور بریانی بھی بنے گی۔" اسجد نے لقمہ دیا۔

"آ جاؤں گا۔"

عبدالعلی نے جانے سے پہلے ہمیشہ کی طرح عنیزہ کے قریب جا کر اس کے سر پر پیار کیا اور ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ نانو کے ساتھ ہی عبدالعلی بھی سائیڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھاتا باہر نکل گیا۔

عنیزہ نے چائے بنا کر اسجد کے سامنے رکھی اور اٹھی تاکہ فریزر سے گوشت نکال سکے کہ اسجد نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔

"بیٹھو مجھ سے بھاگتی کیوں ہو۔"

اسجد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا جو کچھ دیر پہلے بالکل غیر ارادی طور پر تھام لیا تھا لیکن عنیزہ کو لگ رہا تھا۔ جیسے اس کا ہاتھ جل رہا ہو۔

"مجھے کام کر کے نیچے جانا ہے ماموں سے ملنے۔"

"پاپا کہیں بھاگے نہیں جا رہے۔ یہیں ہیں اور کل صبح جائیں گے۔" اس نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔

"آخر تم کیا چاہتے ہو اسجد؟"

"تمہیں چاہتا ہوں۔" اسجد شریر ہو گیا۔

"تم کبھی سنجیدہ نہیں ہو سکتے اسجد۔"

''میں سچ مچ سنجیدہ ہوں عینی! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے بہت سوچا ہے بہت غور کیا ہے زندگی کے ہر راستے پر مجھے تم کھڑی نظر آتی ہو۔ تمہارے بغیر زندگی کا سفر بالکل بے معنی ہے۔''

''اور وہ میجر حمزہ کی حسین و دلکش بیٹی۔''

''ارے لعنت بھیجو اس پر۔'' اسجد نے اس انداز میں کہا کہ عنیزہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''عینی! کیا تم محبت کو سمجھتی ہو؟''

''ہاں' ڈراموں کہانیوں اور افسانوں میں پڑھی اور دیکھی ہے۔''

''وہ تخیل ہوتا ہے لیکن میں سچ مچ کی محبت کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں تمہاری محبت میں ڈوب چکا ہوں۔ اوہو' ٹھیک طرح سے اظہار کرنا بھی نہیں آتا مجھے۔'' وہ جھنجلایا۔

''تو کس نے کہا ہے اظہار کرنے کو۔'' عنیزہ مسکرائی وہ اس کی اس کیفیت کو انجوائے کر رہی تھی اور دل کے اندر خوشگوار دھڑکنوں کا رقص جاری تھا۔ محبت سے بھلا کون منکر ہو سکتا ہے اور وہ کب سے اسجد سے بھاگ رہی تھی لیکن کب تک بھاگ سکتی تھی۔ دل نے انوکھے انداز میں دھڑک کر اس کی محبت کا اعتراف کر لیا تھا۔

''بتاؤ عینی! میں کیا کروں؟'' اسجد نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیا کرنا چاہیے؟'' عینی نے ٹرے میں خالی کپ اور پلیٹیں رکھتے ہوئے اسے دیکھا۔

''مجھے پاپا اور مما سے بات کرنا چاہیے' ہے نا۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

''بالکل۔'' عینی نے بے خیالی میں سر ہلا دیا۔

''کیا واقعی؟'' اسجد نے چونک کر اس کے رخساروں پر پھیلتے رنگوں کو دیکھا۔

''تم بہت پیاری لگ رہی ہو عینی! ذرا پھر سے کہو ابھی کیا کہا تھا''

''تمہارا سر۔'' عنیزہ نے ٹرے اٹھائی۔

''ارے یہ کپ بھی لے جاؤ۔''

''رکھ دو ٹیبل پر۔'' اس نے کچن میں جاتے ہوئے کہا۔

''اٹھا لوں گی۔'' اسجد کے سامنے مزید ٹھہرنا اسے مشکل لگ رہا تھا اور وہ بے حد خوش خوش سا بیٹھا تھا۔

اظہار کا یہ انوکھا سا انداز دل کو بہت بھایا تھا۔

برق و شرر ہے امتحاں ' حوصلہ کلیم کا
دوست کی بارگاہ میں طور بھی اک مقام ہے
مے کدہ جمال میں کیا ہیں رسوم مے کشی
آنکھ تو سیر ہو چلی 'دل وہی تشنہ کام ہے

دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عنیزہ نے برتن سمیٹ کر سنک میں رکھے اور بالوں کو انگلیوں سے درست کرتی ہوئی ماموں سے ملنے کی غرض سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ لاؤنج کے بیچوں بیچ کھڑی جہاں آرا دبے لفظوں میں اسجد کو ڈانٹ رہی تھیں۔

''مجھے یہ پسند نہیں ہے اسجد! نانو نیچے آ گئی تھیں تو تمہیں وہاں اکیلے عنیزہ کے پاس بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔''

''مما۔''

اسجد نے دبا دبا سا احتجاج کیا۔ اس نے وہیں سیڑھیوں پر کھڑے کھڑے ٹی وی لاؤنج میں نظر ڈالی۔ لاؤنج خالی تھا یقیناً نانو' ماموں کے بیڈروم میں ہوں گی

''اسجد میں سب سمجھتی ہوں لیکن جو تم سوچ رہے ہو وہ ہرگز نہیں ہوگا۔''

''ارے مما! کیا آپ نجومی ہو گئی ہیں۔ میری سوچ کی کیسے خبر ہو گئی آپ کو۔'' اسجد نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

''میں سیریس ہوں اسجد۔'' جہاں آرا کے لہجے میں سختی تھی۔

''میں نے تمہارے اور اسعد کے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔'' اور عنیزہ کو لگا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے جن خوشگوار دھڑکنوں نے دل کے آنگن میں جو رنگ بکھیرے تھے وہ سارے رنگ یکدم پھیکے پڑ گئے ہوں۔

''اور میں اسی لمحے سے ڈرتی تھی اسجد لیکن تم۔''

اس نے نچلے ہونٹ کو بے دردی سے دانتوں تلے کچل ڈالا اور تیزی سے واپس مڑی لیکن رخساروں تک آ جانے والے آنسوؤں پر اسے اختیار نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

''یہ فرح ہاشمی ہیں''۔ شیخ صاحب نے عبدالعلی کی طرف دیکھا۔

''ہم نے جو لیڈی رپورٹر کے لیے اشتہار دیا تھا اس کے لیے آئی ہیں۔''

عبدالعلی نے جو کسی کام سے شیخ صاحب کے کمرے میں آیا تھا ایک اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی۔

''شیخ صاحب میں......''

''بیٹھو عبدالعلی۔'' انہوں نے کرسی کی طرف اشارا کیا۔

''پہلے ان سے بات ہو جائے پھر تمہاری بات بھی سنتا ہوں۔''

''تو مس فرح! آپ پر ایک بات واضح کر دوں ہم فی الحال بہت زیادہ سیلری نہیں دے سکتے۔ تنخواہ تین ہزار ہو گی۔''

''او کے۔'' اس نے کندھے اچکائے۔

''اس سے پہلے آپ نے کسی اخبار میں کام کیا ہے؟''

شیخ صاحب نے سوال کیا عبدالعلی خاموشی سے ایک طرف کرسی پر سر جھکا کر بیٹھ گیا تھا۔

''نہیں سر میں نے کسی اخبار میں کام نہیں کیا اور میں آپ پر ایک بات واضح کر دوں میں نے نہ تو جرنلزم میں ماسٹرز کیا ہے اور نہ ہی اخبارات کے متعلق کچھ زیادہ جانتی ہوں۔ میں نے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے۔''

''اور پھر بھی آپ اس جاب کے لیے آ گئی ہیں۔'' شیخ صاحب کو حیرت ہوئی۔

''دراصل۔'' لڑکی نے سر جھٹک کر پیشانی پر جھک آنے والے بالوں کو پیچھے کیا

''میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ میں جو سوچتی ہوں اور محسوس کرتی ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ اس کے لیے کسی اخبار سے منسلک ہو جاؤں تو۔''

''لیکن ہم نے لیڈی رپورٹر کے لیے اشتہار دیا تھا۔'' شیخ صاحب نے الجھ کر

اسے دیکھا۔

''تو میں اگر ضرورت پڑی تو رپورٹنگ بھی کر لوں گی۔''

''آپ نے اشتہار پڑھا تھا؟'' شیخ صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''ہاں! سرسری نظر سے دیکھا تھا لیکن جب اشتہار دیکھا تھا تو ذہن میں جاب کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔''

اس نے لاپروائی سے کہا۔

''دراصل ہمارے گھر میں اردو اخبار نہیں آتا۔ اپنی ایک دوست رابعہ کے گھر دیکھا تھا آپ کا اخبار اور مجھے آپ کے اخبار کی یہ بات بہت پسند آئی کہ اس میں بے لاگ تبصرہ ہوتا ہے۔ حالات حاضرہ پر اور میں بھی لکھنا چاہتی ہوں۔''

''ہمارے اخبار میں ایک صفحہ خواتین کے لیے بھی ہوتا ہے اسے بھی ترتیب دینا اور دیکھنا ہو گا۔''

''سر آئی تھنک کہ میں کر لوں گی۔''

''آپ نے اردو اخبار کبھی نہیں پڑھا۔ آپ نے انگلش میں ماسٹرز کیا ہے تو پھر ایک اردو اخبار میں کیسے کام کریں گی؟''

شیخ صاحب سوال پر سوال کر رہے تھے اور عبدالعلی سوچ رہا تھا یہ آواز اتنی مانوس سی کیوں لگ رہی ہے جیسے پہلے بھی یہ آواز سن رکھی ہو یہ لہجہ بھی آشنا سا لگ رہا تھا۔ اپنی جان پہچان کی سب خواتین کے متعلق اس نے سوچ لیا تھا۔ تیز تیز بولتی ہوئی یہ لڑکی۔

''سر پروین شاکر نے بھی انگریزی میں ماسٹرز کیا تھا لیکن وہ اردو کی ایک اچھی شاعرہ تھیں۔'' لڑکی مسکرائی۔

''آپ نے کبھی کوئی آرٹیکل لکھا ہو تو اگر ساتھ لائی ہیں تو دکھائیں۔''

''سر! میں نے یہ ایک آرٹیکل لکھا تھا ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے متعلق، یہ سارے الزامات جو ان پر لگائے گئے ہیں ان پر تجزیہ و تبصرہ ہے میری فرینڈ رابعہ کہتی ہے کہ......''

اور عبدالعلی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وین کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تیز تیز بولتی لڑکی ''بی بی رابعہ میرا دل چاہتا ہے کہ کسی طرح میں ڈاکٹر قدیر سے مل سکوں۔ ان سے پوچھ سکوں اصل حقیقت کیا ہے؟''

اور کبھی کسی لڑکی کو دیکھنے کی خواہش اتنی شدت سے عبدالعلی کے دل میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جتنی اپنے پیچھے بیٹھی اس لڑکی کو جو بڑے بولڈ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کر رہی تھی یہ سوچے بغیر کہ وہ وین میں بیٹھی ہے۔

رابعہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔فرح۔

یکدم ہی عبدالعلی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ شولڈر بیگ سے پیپر نکال رہی تھی۔ سانولی رنگت' شولڈر کٹ بال' چھوٹی سی ناک جو اس کے چہرے کے نقوش پر بجی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا دہانہ' میک اپ سے بے نیاز چہرے پر ایک چمک سی تھی۔ درمیانی سی آنکھیں نہ بہت بڑی نہ چھوٹی۔ لیکن پلکیں بہت گھنی اور اوپر کو مڑی ہوئیں۔ سادا سے شلوار سوٹ میں ملبوس جس کا دوپٹہ گلے میں پڑا زمین کو چھو رہا تھا۔ عام سے نقوش کے ساتھ بھی اس میں ایک جاذبیت اور کشش تھی عبدالعلی کو لگا جیسے اس ایک بھرپور نظر نے دل میں کہیں ہلکی سی ہلچل مچا دی ہو۔ جیسے کوئی پانی میں کنکر پھینکے اور کچھ دیر بعد ہی پانی معمول پر آجائے۔

''سر یہ۔'' اس نے آرٹیکل نکال کر میز پر رکھا اور ایک نظر عبدالعلی پر ڈالی۔ شاید اس نے اس کی محویت محسوس کر لی تھی۔ عبدالعلی نے ٹپٹا کر نگاہیں جھکا لیں۔

''ہوں۔'' شیخ صاحب نے سرسری نظر سے پہلا صفحہ دیکھا۔

''آپ کی اردو تو بہت اچھی ہے جبکہ بقول آپ کے آپ نے اردو اخبار اور اردو لٹریچر بہت کم پڑھا ہے۔''

''ایسا ہی ہے۔'' وہ بیگ کے اندر کچھ ٹٹول رہی تھی اور عبدالعلی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آگئی۔ ویگن میں سفر کرنے والی کا دعویٰ تھا کہ اس کے گھر اردو اخبارات نہیں آتے تھے صرف انگریزی...... اور پتا نہیں لوگ اتنے منافق اور جھوٹے کیوں ہوتے ہیں بلا وجہ جھوٹ محض اپنا آپ چھپانا حالانکہ یہ لڑکی اگر خود کو کسی طبقے کا ظاہر نہ بھی کرے تب بھی اس میں کچھ ایسا ہے جو اٹریکٹ کرتا ہے اور عبدالعلی کو لگا جیسے چند لمحے پہلے جو دل میں لحہ بھر ارتعاش سا پیدا ہوا تھا وہ شاید دل کا دھوکا تھا۔

''سر! کیا یہ مضمون چھپ سکتا ہے؟'' بیگ کی زپ بند کر کے اب وہ شیخ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''نہیں' یہ تو اب پرانی بات ہو چکی۔''

''کتنی پرانی سر! اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ' بل کھا کر رہ گئی۔

''کیا زندہ قومیں اپنے محسنوں کو اتنی ہی جلدی بھلا دیتی ہیں۔ کیا ہمیں بحیثیت قوم یہ حق نہیں ہے کہ ہم جان سکیں کہ ہمارے محسن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' عبدالعلی نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کے سانولے رخساروں پر سرخی تھی۔

''سر! یہ آرٹیکل مجھے دکھائیں میں دیکھوں گا کہ اس میں کتنی گنجائش ہے۔''

''یہ عبدالعلی صاحب ہیں جو ہمارے اخبار میں ''سچ تو یہ ہے'' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں۔'' لڑکی کی آنکھیں یکدم چمکنے لگیں اور وہ عبدالعلی کو دیکھنے لگی۔

''میں نے آپ کے صرف دو کالم پڑھے رابعہ کے گھر...... وہاں سب ''ندائے اسلام'' بہت شوق سے پڑھتے ہیں آپ کے وہ دونوں کالم زبردست تھے۔ یوں لگ رہا تھا آپ جو کچھ لکھ رہے ہیں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ اور محسوس کر رہے ہیں۔''

''تھینکس۔'' عبدالعلی نے نگاہیں جھکا لیں۔

''میرا خیال ہے انہیں دیکھ لیتے ہیں۔''

شیخ صاحب نے جیسے خود سے کہا۔ تین دن ہو گئے تھے اشتہار دیے اور یہ آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ ایک تو تنخواہ کچھ زیادہ پرکشش نہ تھی اور دوسرا ابھی اخبار کو نکلے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ دفتر بھی کوئی خاص نہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے تین کمرے تھے۔ ایک میں شیخ صاحب تھے دوسرے میں چوہدری عظمت اللہ' محب اللہ خان اور عبدالعلی بیٹھتے تھے۔ تیسرے کمرے میں مجاہد صاحب اور دوسرے دو تین کارکن تھے۔ جب عادلہ کو رکھا گیا تھا تو عبدالعلی والا کمرہ جو نسبتاً بڑا اور کشادہ تھا اسی میں عادلہ کی ٹیبل بھی لگا دی گئی تھی' البتہ ہارڈ بورڈ سے پارٹیشن کر دی گئی تھی۔ عادلہ کو چند دن پہلے ایک پرکشش تنخواہ کے ساتھ اچھی جاب مل گئی تھی۔ اس نے یہاں صرف دو ماہ ہی جاب کی تھی۔

''ٹھیک ہے مس فرح! آپ آجایئے کل سے۔ مس عادلہ جو آپ سے پہلے خواتین کا صفحہ ترتیب دیتی تھیں انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ چار بجے سے پانچ بجے تک اخبار کو وقت دیا کریں گی تو وہ بھی آپ کو گائیڈ کر دیں گی پھر بھی کچھ پرابلم ہوں تو عبدالعلی صاحب ہیں' عظمت ہیں' محب ہیں سب بہت مخلص ہیں آپ کی رہنمائی کر دیا کریں گے۔''

''تھینک یو سر۔'' اس کے چہرے کی چمک بڑھ گئی تھی۔ کھڑے ہوتے ہوئے اس
نے شولڈر بیگ کندھے پر لٹکایا۔ زمین پر لٹکتا دوپٹا درست کیا پیشانی تک آ جانے والے
بالوں کو سر جھٹک کر پیچھے کیا۔ عبدالعلی نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں ایک بے نیازی اور
لاپروائی سی تھی جو کم از کم متوسط طبقے کی لڑکیوں میں اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''او کے اللہ حافظ! میں کل انشاءاللہ آ جاؤں گی لیکن سر۔'' وہ کچھ جھجکی

''میں دس بجے تک آ پاؤں گی۔'' شیخ صاحب چند لمحے خاموش رہے۔

''ویسے تو سب آٹھ بجے تک آ جاتے ہیں لیکن جیسے آپ کو سہولت ہو۔'' اور وہ
شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''ہاں تو عبدالعلی! تم کیوں آئے تھے؟''

''سر آپ نے میرا کالم مسترد کر دیا تھا کیوں؟''

عبدالعلی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

''ہاں بھئی! کچھ اور لکھو۔ ہر کالم میں ایک ہی بات عراق، فلسطین، فدائی، میری
جان یہ سلسلہ تو اب چلتا ہی رہے گا۔ اب کیا ہر روز ہم ایک ہی بات لکھتے رہیں گے کہ آج
فدائی حملے میں اتنے عراقی شہید ہوئے آج اتنے' بور ہو گیا ہوں یار۔'' عبدالعلی نے تاسف
سے انہیں دیکھا۔

''سر! شاید آپ نے پورا آرٹیکل نہیں پڑھا میں نے لکھا تھا کہ یہ جو فدائی حملوں
میں تیزی آ گئی ہے تو امریکہ کو سوچنا چاہیے کہ اب حکومت بنا دی جائے۔ عراقیوں کو ان کا
ملک سونپ دیا جائے۔''

''تو تمہارا کیا خیال ہے عبدالعلی! کہ امریکن حکومت سونپ کر خاموشی سے اپنے
مقاصد حاصل کیے بغیر عراق سے نکل جائیں گے؟ پاگل ان کے پروگرام بہت لمبے اور
طویل ہیں انہوں نے پوری منصوبہ بندی کر رکھی ہے کہ کب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔''

محب اللہ خان جانے کب اندر آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلپ بورڈ تھا اور ایک
تصویروں کا لفافہ۔

''سر یہ ایک نظر دیکھ لیں۔''

اس نے لفافہ اور کلپ بورڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور عبدالعلی کے ساتھ والی کرسی پر

بیٹھ گیا۔ عبدالعلی نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور
آنکھوں میں تھوڑی سرخی۔ عبدالعلی محسوس کر رہا تھا کہ وہ جب سے اپنے علاقے سے آیا
تھا بہت پریشان تھا۔ دو ایک بار عبدالعلی نے پوچھا بھی تو وہ ٹال گیا۔

''یونہی وہاں کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔''

''بیک وقت دو میچ۔'' شیخ صاحب نے بلند آواز سے پڑھا۔

''بھئی یہ دوسرا میچ کون سا ہے محب اللہ خان! میں نے تو تمہیں راولپنڈی کے میچ
کے متعلق لکھنے کو کہا تھا جو انڈیا اور پاکستان کے درمیان ہوا۔ ٹی وی پر دیکھا تھا مزا آ گیا۔''

''پڑھ لیں سر۔''

محب اللہ خان کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

''جس وقت پوری قوم انہماک سے راولپنڈی میں ہونے والا میچ دیکھ رہی تھی۔
گیندے کے پھول اور ہولے کے رنگ سجائے لڑکے لڑکیاں رقص کر رہے تھے۔ سیٹیاں بجا
کر نعرے لگا کر تالیاں پیٹ پیٹ کر کھلاڑیوں کو داد دی جا رہی تھی۔ عین اسی وقت ایک اور
میچ بھی ارض پاک کے قبائلی علاقے میں ہو رہا تھا جسم و جان اور گولہ بارود کا میچ' سنسناتی
گولیوں اور آگ برساتے بموں کا میچ۔'' شیخ صاحب نے برا سا منہ بنایا۔

''یار! تم لوگوں کو لاشوں اور گولیوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ پوری قوم خوش ہے
، ناچ رہی ہے، رنگ رلیاں منا رہی ہے اور تم نے خوشیوں کے ناتے کہاں جا کر ملا دیے۔''

''سر! جب ہمارے ارد گرد خون بہہ رہا ہو اور ارد گرد گولیاں چل رہی ہوں تو ہم کیسے
نظریں چرا سکتے ہیں۔'' عبدالعلی نے جواب دیا۔

''پر یہ تو ایک سیدھا سادا کرکٹ میچ تھا۔ پوری قوم پاگل ہو رہی ہے اس میچ کے
لیے۔''

''پوری قوم اگر ایک غلط راہ پر چل رہی ہے تو کیا ہم بھی اس بھیڑ چال میں شامل
ہو جائیں؟'' گو عبدالعلی کم گو تھا مگر جب بحث پر آتا تو شیخ صاحب قائل ہو جاتے تھے۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے لگا دو یہ مضمون۔'' انہوں نے تصویروں والا لفافہ کھولا۔

سب سے اوپر راولپنڈی کے میچ کی جھلکیاں تھیں۔ بینرز اٹھائے تالیاں پیٹتے
لوگ۔ ایک لڑکی اپنی گلاسز سر پر لگائے وکٹری کا نشان بنائے کھڑی تھی۔

''اور سر اس میں کچھ اور تصویریں بھی ہیں جو مجاہد صاحب نے اپنے ایک دوست سے حاصل کی ہیں جو ایک بڑے روزنامے کا فوٹو گرافر اور رپورٹر ہے اور آج کل وانا میں ہے۔ اسے بھی دیکھ لیجئے۔''

شیخ صاحب جانتے تھے کہ ایسی تصاویر مجاہد صاحب کہاں سے حاصل کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے وسائل اتنے زیادہ نہ تھے اس لیے وہ بڑی فراخدلی سے مجاہد کو اجازت دے دیتے تھے کہ وہ اپنے رپورٹر دوست سے دفتر کے فون پر رابطہ رکھے۔

انہوں نے تصاویر نکالیں۔ ''پہلی تصویر ایک بوڑھے قبائلی کی تھی جس کا لباس پھٹا ہوا تھا جس کی پگڑی کھل کر آدھی سنگلاخ زمین پر اور آدھی اس کے چہرے کے گرد لپٹ گئی تھی۔ وہ گولی کھا کر سیدھا گرا تھا اور اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

''شیخ صاحب نے ایک جھرجھری سی لی۔'' دوسری تصویر پہاڑوں کے دامن میں کچے مکانوں کی تھی ٹوٹی دیواروں والے مکان۔ ایک بوڑھی عورت چہرہ چھپائے ایک ٹوٹے مکان کے پاس گھٹنوں پر چہرہ رکھے بیٹھی تھی۔ اس گھر کے ساتھ کیا کچھ ختم ہو گیا تھا کون جانتا ہے۔

''یہ تصویر بھی اس رقص کا پوز دیتی وکٹری کا نشان بناتی لڑکی کی تصویر کے ساتھ ہی چھپے گی۔''

عبدالعلی کھڑا ہو گیا۔ شیخ صاحب، عبدالعلی سے اختلاف نہیں کر سکتے تھے کہ ایک وقت پر جب وہ اخبار بند کرنے لگے تھے اور ان کا لگایا ہوا سرمایہ سارا کا سارا تقریباً ڈوب چکا تھا۔ بیوی الگ منہ پھلائے بیٹھی تھی ایسے میں عبدالعلی نے نہ صرف ذاتی طور پر دلچسپی لے کر بلکہ مالی مدد کر کے ان کو سہارا دیا تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اب زیادہ سرمایہ عبدالعلی کا ہی لگا ہوا تھا اس میں لیکن عبدالعلی نے کبھی جتایا نہ ذکر کیا۔ بلکہ انہی دنوں بڑی بیٹی کی شادی میں بھی عبدالعلی نے بارات کا سارا خرچ برداشت کیا تھا۔

''تمہاری فیملی کہاں رہتی ہے محب اللہ خان؟''

''وانا سے بیس پچیس کلومیٹر دور ہے ہمارا گاؤں'' عبدالعلی کے ساتھ ہی محب اللہ بھی باہر آ گیا تھا۔

''تم نے بہت اچھا لکھا۔'' عبدالعلی نے سراہا۔

''ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔

''بابا! چائے تو پلوائیے۔''

عبدالعلی نے اندر فرش پر بیٹھے بابا کرماں والے سے کہا تو وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابھی لایا کرماں والیو۔''

اور عبدالعلی تھکا تھکا سا کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا...... محبّ اللہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا اپنی میز کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

''کرنل صاحب! اسعد آ جائے تو میں چاہتی ہوں دونوں کی شادیاں ایک ساتھ کر دوں۔''

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھے چہرے پر کسی کریم کا مساج کرتے ہوئے جہاں آرا نے ذرا سا رخ موڑ کر کرنل تاجدار سے کہا۔

''کیا اسعد نے آنے کے بارے میں کچھ کہا ہے؟'' انہوں نے اخبار سے ذرا کی ذرا نظریں ہٹا کر جہاں آرا کی طرف دیکھا۔

''ہاں صبح آپ واک پر گئے تھے تو اس کا فون آیا تھا کہہ رہا تھا ٹکٹ لے کر سیٹ کنفرم کروانے کے بعد آنے کی ڈیٹ بتائے گا۔''

''اوہ تو گویا صاحبزادے کو بھی خیال آ گیا ہمارا۔''

''خیال کیوں نہیں آئے گا اسے۔'' جہاں آرا کو برا لگا۔

''لیکن یہاں کیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ ہزار کی جاب مل جاتی اسے۔ یہاں ایک ڈاکٹر اور ایک اسکول ماسٹر کی تنخواہ ایک جیسی ہے۔''

''آپ ایک اسکول ماسٹر کا ذکر اتنی تحقیر سے مت کریں جہاں آرا۔'' کرنل تاجدار کو برا لگا۔

''یہی اسکول ماسٹر ہیں جنہوں نے آپ کے بیٹے کو اس قابل بنایا کہ وہ ڈاکٹر بن سکے۔''

''آپ تو بات پکڑ لیتے ہیں۔'' جہاں آرا نے چڑ کر جواب دیا۔

''میں آپ سے اسعد اور اسجد کی شادی کی بات کر رہی تھی۔ کچھ دیر کو اخبار رکھ

دیں۔''

''جی فرمائیے۔'' وہ اخبار رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

''کیا کوئی لڑکی دیکھ لی ہے آپ نے اسعد کے لیے؟''

''اسعد کی بات تو بہت پہلے سے میں نے آپا جان سے کر رکھی ہے ان کی عینا کے لیے۔''

''آپ نے اسعد سے بھی پوچھا یا خود ہی فیصلہ کر لیا؟'' کرنل تاجدار یکدم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

''میں جانتی ہوں اس کی پسند۔ اس کا رجحان بچپن سے ہی اپنے ننھیال کی طرف ہے اور عینا کی تو وہ ہمیشہ بہت تعریف کرتا ہے۔''

''تعریف کرنا اور بات ہوتی ہے جہاں آرا بیگم اور عمر بھر کا ساتھی چننا اور بات

''اسعد سے بھی پوچھ لوں گی۔ جہاں آرا بیگم اب نرمی سے ہاتھوں پر مساج کر رہی تھیں۔

''لیکن مجھے پتا ہے کہ وہ میری پسند سے انکار نہیں کرے گا۔ صبح بھی وہ کہہ رہا تھا کہ مستقل رہائش کے لیے اس کی ترجیح پاکستان ہی ہے۔''

''بہرحال مزید بات آپ اسعد کے آنے پر ہی آگے بڑھائیے گا اور رہی اسجد کی بات تو میرا خیال ہے پہلے علینہ اور اسعد کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں پھر اسجد کے لیے سوچیں گے۔'' اپنی طرف سے بات ختم کر کے انہوں نے دوبارہ اخبار اٹھا لیا۔

''اسجد کے لیے میں نے لڑکی دیکھ لی ہے۔ پتا ہے کون؟'' وہ جوش میں ان کے بیڈ کے قریب آ گئیں۔

''مسز بدر ہاشمی کی بیٹی۔ اتنی بڑی جائداد کی اکلوتی وارث ہے۔ اتنی بے تحاشا دولت' آپ نے نام سنا تو ہو گا مسز بدر ہاشمی کا۔ ہماری این جی او کی بھی وہی چیئر پرسن ہیں

''جہاں آرا بیگم۔'' کرنل تاجدار نے مضبوط آواز میں کہا۔

''اسعد کی شادی جہاں مرضی چاہے کریں لیکن اسجد کی شادی عنیزہ سے ہو گی۔''

''ہرگز نہیں۔'' جہاں آرا تڑپ اٹھیں۔

''مجھے نہ وہ لڑکی عنیزہ پسند ہے اور نہ ہی علی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں لیکن یہ نہیں ہو گا کرنل صاحب۔''

''علینہ کے لیے میں نے نہیں کہا میں صرف عینی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

گو انہیں عبدالعلی اور عنیزہ دونوں سے ہی بہن کے بچے ہونے کے ناتے انسیت اور محبت تھی لیکن عبدالعلی سے وہ کچھ ناراض تھے کیونکہ ان کی خواہش کے برعکس انہوں نے جرنلزم کو بطور پیشہ چنا تھا۔ ہاں اگر وہ انجینئر یا ڈاکٹر بن جاتا تو وہ اس کے متعلق سوچتے بھی لیکن اب نہیں۔ البتہ عنیزہ کے لیے دو سال پہلے ہی انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے اپنی بہو بنائیں گے۔ عنیزہ کی تربیت ان کی ماں نے کی تھی اور وہ جانتے تھے کہ وہ اسجد کی بہترین شریک حیات ثابت ہو گی۔

''لیکن مجھے عینی ہرگز پسند نہیں ہے۔'' وہ ان کے سامنے ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

''صرف اس لیے کہ وہ میری بھانجی ہے' میری مرحوم بہن کی بیٹی جن سے اس کی زندگی میں بھی آپ کی کبھی نہ بنی تھی۔'' جہاں آرا تلملا کر رہ گئیں۔

''آپ جو بھی سمجھیں۔'' ان کا انداز لاپرواہ سا تھا۔ گو آگ اندر تک بھڑک اٹھی تھی۔

''آپ کے دل میں اپنی عزیز از جان بھانجی کی محبت بہت زیادہ ہی ہے تو اس کی بارات کا خرچ اٹھا لیجئے گا اور میں کسی شادی دفتر سے رابطہ کر کے کسی اچھی جگہ اس کی شادی کروا دیتی ہوں۔''

''شٹ اپ۔''

کرنل تاجدار نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کہا اور بمشکل اپنے غصے پر قابو پا کر جہاں آرا کی طرف دیکھا جو بظاہر بڑی مطمئن سی بیٹھی ابھی تک ہاتھوں کو ملے ہوئے انگلیوں سے سلا رہی تھیں۔

''ان دونوں کے ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہے کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور

جائیداد زمین اس کے علاوہ ہے۔ وہ ہمارے محتاج نہیں ہیں۔'' وہ بولے تو تمسخرانہ انداز میں ہنسیں اور سوچا۔

''اگر ذاتی اکاؤنٹ میں اتنی رقم ہوتی تو عبدالعلی صبح و شام چند ہزار روپوں کے لیے خوار نہ ہوتا۔''

وہ روز اول سے ہی آصفہ سے جیلس تھیں۔ اس کی تعلیم' اس کا سلیقہ' اس کا حسن وہ خوامخواہ ہی احساس کمتری کا شکار ہوگئی تھیں حالانکہ آصفہ کا اخلاق بہت اچھا تھا اور باوجود اس کے کہ جہاں آرا خالصتاً ان کی اپنی پسند تھی اماں اور آصفہ نے کبھی جہاں آرا کو احساس کمتری نہیں دلایا تھا۔

پھر جب ان کی شادی میجر ڈاکٹر عابد سے ہوگئی تب آصفہ سے ان کا جلاپا اور بڑھ گیا تھا۔ انہوں نے کرنل تاجدار سے کہا تھا کہ وہ ان کی چھوٹی بہن کے لیے ڈاکٹر عابد سے بات کریں۔ تب انہوں نے رسان سے منع کر دیا تھا اور بتایا تھا کہ ان لوگوں نے آصفہ کے لیے پروپوزل دیا ہے۔

آصفہ ڈاکٹر تھیں اور خود ان کی تعلیم صرف انٹر تک تھی۔

''ازدواجی زندگی کے پچیس سال اگر بہت خوشگوار نہ سہی تو ناخوشگوار بھی نہ تھے۔''

اخبار سامنے رکھے رکھے کرنل تاجدار نے سوچا۔ انہوں نے کبھی جہاں آرا کے معاملات میں دخل نہ دیا تھا۔ ان کی کتنی خواہش تھی کہ عنیزہ اور عبدالعلی ان کے ساتھ ہی رہیں۔ کم ازکم عبدالعلی ان کے ساتھ ہی رہتا تو اتنا خودسر نہ ہوتا اور وہ اپنی خواہش کے مطابق اسے تعلیم دلوا کر علینہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیتے لیکن صرف جہاں آرا کی وجہ سے وہ مجبور ہوگئے تھے جو انہیں ساتھ رکھنے کو تیار نہ تھی لیکن اب اسجد کے معاملے میں کم ازکم جہاں آرا کا رویہ سخت ناگوار تھا۔

انہوں نے اخبار سے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا جو بے حد مطمئن اور پرسکون سی بیٹھی تھیں۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ بھئی۔''

ان کا خیال تھا علینہ ہوگی جو سونے سے پہلے انہیں شب بخیر کہنے ضرور آتی تھی لیکن دروازے پر گھبرائی ہوئی سی عنیزہ کھڑی تھی۔

''کیا ہوا عینی؟'' وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔

''وہ ماموں' نانو کی طبیعت اچانک بہت خراب ہوگئی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہی ہیں۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

''چلو میں آتا ہوں۔''

انہوں نے جلدی سے سلیپر پہنے' جہاں آرا مڑ کر عنیزہ کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں عنیزہ کے لیے اتنی نفرت تھی کہ لمحہ بھر کو وہ ٹھٹکے اور پھر عنیزہ کے پیچھے تیزی سے باہر نکل گئے۔ عنیزہ تقریباً بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی تھی اور جب وہ اوپر پہنچے تو وہ نانو کے بیڈ کے پاس دوزانو بیٹھی ان کے ہاتھ سہلا رہی تھی۔

''اماں جان' اماں جان!'' کرنل تاجدار نے ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر آواز دی پھر نبض دیکھی۔ ہارٹ بیٹ بہت تیز تھا۔

''بہت گھبراہٹ ہے پتر!' انہوں نے بمشکل کہا۔

''بلڈ پریشر۔'' انہوں نے آنسو بہاتی عنیزہ کی طرف دیکھا۔

''اماں جان کو بلڈ پریشر کا مسئلہ تو نہیں تھا؟''

''تھا۔'' عنیزہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کبھی کبھی ہائی ہو جاتا ہے وہ ٹیبلٹ لیتی ہیں۔

ڈاکٹر حسن راجہ کی پیشنٹ ہیں۔''

''اوہ۔''

انہوں نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر فون کی طرف بڑھ گئے۔ ڈاکٹر حسن راجہ ان کے گھر سے کچھ ہی فاصلہ پر رہائش پذیر تھے ان سے پرانے تعلقات تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ آگئے۔

''سوری ڈاکٹر! آپ کو اس وقت تکلیف دی۔''

ڈاکٹر حسن راجہ نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''تکلیف کیسی کرنل صاحب۔'' وہ مسکراتے ہوئے بلڈ پریشر چیک کرنے لگے۔ عنیزہ ایک طرف خاموش کھڑی تھی۔

''خطرے کی تو کوئی بات نہیں ڈاکٹر!'' کرنل تاجدار فکرمندی سے بولے۔

"نہیں بس کچھ بی پی زیادہ ہے میں یہ انجکشن لگا رہا ہوں کچھ دیر تک گھبراہٹ کم ہو جائے گی اور یہ سو جائیں گی۔ بیٹا! آپ سے کہا تھا اس روز بھی غذا میں نمک بہت کم کر دیں۔" وہ بات کرتے کرتے عنیزہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"نانو! بالکل پرہیز نہیں کرتیں انکل نمک خود ہی ڈال لیتی ہیں اگر کم ہو تو۔"

"یہ تو صحیح نہیں ہے اماں جان! پرہیز بہت ضروری ہے۔" ڈاکٹر حسن نے ان کی طرف دیکھا۔

انجکشن کے بعد کچھ دیر وہ بیٹھے کرنل تاجدار سے باتیں کرتے رہے۔ عنیزہ نے چائے کا پوچھا تو انہوں نے منع کر دیا۔ نانو کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی تو ڈاکٹر حسن اٹھ کھڑے ہوئے۔ "او کے اب میں چلوں گا۔" انہوں نے ایک بار پھر بی پی چیک کیا۔

"پہلے سے کچھ کم ہے۔ بہرحال کچھ دیر تک زیادہ بہتر محسوس کریں گی۔"

ڈاکٹر حسن کو گیٹ تک چھوڑ کر کرنل تاجدار واپس آئے تو عنیزہ بیڈ کے پاس بیٹھی ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے سہلا رہی تھی۔

"یہ عبدالعلی ابھی تک نہیں آیا۔" وہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئے۔

"آج ہفتہ ہے' صبح پرچہ نکالنا ہوتا ہے تو بھائی کچھ دیر سے آتے ہیں۔"

کرنل تاجدار نے برا سا منہ بنایا اور اماں جان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ دل ہی دل میں انہیں شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ ماں کی بیماری سے بے خبر تھے۔

ڈاکٹر حسن نے انہیں بتایا تھا کہ ان کا دل بھی پھیل رہا ہے۔ بہرحال یہ عمر کا تقاضا ہے۔ دو چار گھڑی ماں کے پاس بیٹھ کر وہ سمجھتے تھے کہ فرض ادا ہو گیا اور کیسی ماں تھیں ان کی جو کبھی کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتی تھیں۔

"جاؤ بیٹا! جا کر سو جاؤ۔ انہوں نے گھبرا کر کہا۔

"میں ٹھیک ہوں اب۔ بس گھبراہٹ زیادہ ہو گئی تھی اور یہ گھبرا گئی۔"

"سو جاؤں گا اماں جان! ابھی کچھ ایسی دیر نہیں ہوئی اور ڈاکٹر حسن کہہ رہے تھے آپ ٹینشن نہ لیا کریں کسی بھی قسم کی۔ کوئی پریشانی ہے کیا؟"

"پریشانی کیا ہونی ہے بچے بس۔" انہوں نے عنیزہ کی طرف دیکھا۔

"چاہتی ہوں زندگی میں یہ اپنے گھر کی ہو جائے۔ عبدالعلی تو لڑکا ہے' یہ میرے

بعد اکیلی ہو جائے گی بالکل۔"

عنیزہ کے دل کو کچھ ہوا۔ "خدا نہ کرے نانو کو کچھ ہو میں بھلا ان کے بغیر کیسے رہوں گی۔" اس نے ہول کر سوچا۔

"میں ہوں نا اماں جان! آپ فکر نہ کریں عینی کی۔"

"کیسے فکر نہ کروں۔ علی ہے تو اپنے ہی کاموں میں الجھا رہتا ہے پھر وہ لڑکا ہے کوئی خالہ' پھوپھی' ماں نہیں جو اس کا سوچے' کس سے کہوں کہ اس کے لیے کوئی لڑکا......"

"یہ نانو کو کیا ہوا ہے بھلا۔" عنیزہ نے نانو کو دیکھا۔

"بھلا یہ کون سا وقت ہے ان باتوں کا۔" وہ وہاں سے اٹھ کر بلا وجہ کچن میں چلی گئی۔

"باہر کوئی لڑکا دیکھنے کی کیا ضرورت ہے اماں جان! اسجد ہے نا۔"

کرنل تاجدار نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو ان کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں لیکن دوسرے ہی لمحے بجھ گئیں۔

"جہاں آرا کا رجحان نہیں ادھر' میں نے ایک بار بات کی تھی یونہی سرسری سی۔"

"میں ہوں نا اماں جان! آپ یہ فکر چھوڑ دیں۔ عینی میری ذمہ داری ہے۔"

کرنل تاجدار ہولے ہولے ان سے کہہ رہے تھے اور کچن میں فرج کے پاس کھڑی عنیزہ وہیں بیٹھ گئی۔

"اب بھلا ماموں کو کیا پتا آنٹی جہاں آرا کے خیالات کا۔" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ آ گئی۔

☆☆☆☆

"ویسے شیخ صاحب! آپ تنخواہیں بہت کم دیتے ہیں۔" فرح نے سموسوں کی پلیٹ شیخ صاحب کی طرف بڑھائی۔

"اتنے دنوں میں مجھے اتنا تو اندازہ ہو گیا ہے کہ آمدنی اتنی بھی کم نہیں ہے۔ کم از کم مدنی صاحب شروع سے آپ کے ساتھ ہیں ان کی تنخواہ ضرور بڑھانی چاہیے' پانچ بچے ہیں ان کے۔"

"اور آپ کو پتا ہے مس فرح! میرے سات بچے ہیں چھ لڑکیاں اور ایک لڑکا لڑکا

سب سے چھوٹا ہے اور لڑکیاں شادی کے قابل۔ دو کی شادی ہوگئی پیچھے چار باقی ہیں۔'' شیخ صاحب نے سموسہ اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھا۔

''تو شیخ صاحب! آخر آپ کو اتنے بچے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ تو اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔'' فرح نے سنجیدگی سے پوچھا۔

محب اللہ خان اور چوہدری عظمت اللہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی جبکہ عبدالعلی سنجیدہ سا بیٹھا چائے پیتا رہا۔ بابا کرماں والا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تو شیخ صاحب نے جھینپ کر اسے جھڑکا۔

''مس فرح! بس بیگم کی خواہش تھی کہ بیٹا ہو جائے۔''

''اور اگر بیٹا نہ ہوتا تو؟''

فرح سنجیدہ لگ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ہنسی مچل رہی تھی۔

''پھر سات آٹھ نو لڑکیاں۔''

''توبہ کریں مس فرح! میں نے تو کہہ دیا تھا بیگم سے اب جو ہمارا نصیب اس کے بعد نہیں۔''

شیخ صاحب نے کبابوں کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

''بچیاں تو پڑھ رہی ہوں گی۔''

''نہ جی، تین تو دس جماعتیں پڑھ کر فارغ ہو چکیں ایک بیٹی اور بیٹا پڑھ رہا ہے۔''

''کمال ہے شیخ صاحب! آپ تعلیم کی افادیت سے منکر ہیں۔ آج کل کے دور میں بھلا دس جماعتیں۔ بچیاں پڑھ لکھ کر بااعتماد ہوتی ہیں زندگی میں کام آتی ہے یہ تعلیم۔''

عبدالعلی نے بغور فرح کو دیکھا جو شرارت بھول کر بے حد سنجیدگی سے شیخ صاحب کو قائل کر رہی تھی کہ وہ بچیوں کو مزید تعلیم دلوائیں۔

فرح میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہفتہ بھر میں ہی اس نے سب کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ اب تو اسے مہینہ ہو گیا تھا آئے ہوئے۔ آج آفس میں اس نے بابا کرماں والے کی سالگرہ کی پارٹی ارینج کی تھی۔ وہ پورے ستر سال کے ہو گئے تھے۔

''اس قدر کٹھن ہے زندگی۔ اتنے آنسو ہیں ایسے میں اگر تھوڑا سا ہنس بول لیا جائے تو یہ آنسو قابل برداشت ہو جائیں گے۔'' یہ اس کی منطق تھی۔ سب نے ہی اس کی

بات سے اتفاق کیا تھا۔ بابا کرماں والا نیا سوٹ پہنے بہت خوش تھا اور ان سب نے ہی اسے کچھ نہ کچھ گفٹ دیا تھا عبدالعلی کو فرح نے متاثر کیا تھا۔ کئی بار اس نے دل میں فرح کے لیے انوکھا سا جذبہ محسوس کیا تھا۔

شیخ صاحب کچھ دیر بعد اٹھ گئے انہیں اپنی بڑی بیٹی کو سسرال سے لانا تھا لیکن اٹھنے سے پہلے وہ مدنی صاحب کی تنخواہ میں پانچ سو کا اضافہ کر گئے تھے اور یہ فرح کا کمال تھا۔

''ایسی پارٹیاں ہوتی رہنا چاہیں۔ دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔'' چوہدری عظمت اللہ نے شیخ صاحب کے جانے کے بعد رائے دی۔

''ہاں ضرور فرح، فرح! تم ایسا کرو ہم سب کی تاریخ پیدائش نوٹ کر لو۔'' مجاہد حسین نے فرح کو دیکھا۔

''نوٹ کروا دینا۔''

''اگلے ہفتے عبدالعلی کی برتھ ڈے ہے۔'' عادلہ نے انکشاف کیا اور یہ لڑکی کیسے اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں کا دھیان رکھتی تھی۔

عبدالعلی نے عادلہ کو دیکھا۔ نظریں ملنے پر عادلہ کی پلکیں جھک گئیں اور رخسار گل رنگ ہو گئے۔ لیکن پتا نہیں کیوں وہ اس کے لیے اپنے دل میں کوئی جذبہ محسوس نہیں کرتا تھا وہ عظمت کی بہن تھی۔ بس اتنا ہی خیال تھا اسے عادلہ کا یا پھر عینی کی دوست تھی۔

''تو پھر ڈن، عبدالعلی کی برتھ ڈے سیلیبریٹ کریں گے۔''

''نہیں مجھے پسند نہیں ہے دوسروں پر برڈن ڈالنا'' عبدالعلی نے چونک کر کہا۔ وہ بہر حال اس کی مالی حیثیت جانتا تھا۔

''تو ٹھیک ہے مت ڈالیں برڈن کسی پر، اپنی جیب سے سب کو لنچ کروا دیں۔'' اس نے فوراً ہی فیصلہ سنا دیا۔ وہ یوں ہی بے تکلف اور بولڈ تھی۔

''بس یار! اب اور کچھ نہ کہنا۔''

محب اللہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتے عبدالعلی کو دیکھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

یہ لڑکی اپنے انداز اپنی گفتگو اور حد سے بڑھے ہوئے اعتماد سے ہرگز نہیں لگتی تھی

کہ اس کا تعلق کسی متوسط گھرانے سے ہوگا۔

''اور لنچ ہم اپنی پسند کے ہوٹل میں کریں گے۔'' سب نے تالیاں بجا کر اس کی تائید کی۔

عبدالعلی نے کچھ نہیں کہا جانے اس کا دھیان کہاں تھا۔ عادلہ کے آفس میں آج چھٹی تھی اس لیے وہ صبح سے ہی آ گئی تھی۔ اسے لکھنے سے دلچسپی تھی وہ کوئی تخلیقی کام کرنا چاہتی تھی اس لیے اپنی مرضی سے آتی تھی۔

''بابا! تم نے شادی نہیں کی؟''

فرح، عبدالعلی کو خاموش دیکھ کر بابا کرماں والے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی عادلہ سگھڑ لڑکیوں کی طرح ٹیبل پر پڑی ڈسپوزایبل پلیٹیں اور کپ اکٹھے کر رہی تھی۔

''کی تھی فرح بی بی۔'' بابا کرماں والے کی سیاہ رنگت جیسے چمک اٹھی۔

''بچے وغیرہ ہیں؟''

''نہ جی، بچے وچے کدھر سے آئے۔ کرماں والی دوسرے دن ہی نس (بھاگ) گئی تھی اپنے مامے کے پتر کے ساتھ۔''

''پھر آپ کو دوسری شادی کر لینا چاہیے تھی۔''

بس جی فرح بی بی! میں نے سوچا کیا خبر کبھی واپس ہی آ جائے تو بس شادی نہیں کی دوبارہ۔'' عبدالعلی کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی جبکہ فرح بڑی سنجیدگی سے اسے دوسری شادی کا مشورہ دے رہی تھی باقی سب کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ فرح کی آمد نے یہاں اس آفس میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی یہ چوہدری عظمت اللہ اور مجاہد حسین کا یکساں خیال تھا۔ حالانکہ شروع شروع میں اس کے لمبے لمبے جذباتی مضمون دیکھ کر وہ بہت جز بز ہوتا تھا۔

''رپورٹنگ اور افسانے میں فرق ہوتا ہے بی بی!'' اس سے بات کرتے ہوئے خوانخواہ ہی اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا تھا شاید اس پہلے روز کی چھوٹی سی بے ایمانی کی وجہ سے ۔ ورنہ تو فرح کی بولڈنیس اسے پسند آئی تھی۔

عادلہ نے میز صاف کر کے بچا کھچا سامان شاپر میں ڈال کر بابا کرماں والے کو دے دیا۔

''گڈ''

فرح نے توصیفی نظروں سے اسے دیکھا۔

''مدنی صاحب اس ہفتے کی خبریں اکٹھی کر لی تھیں آپ نے؟''

''آج تو پرچہ نکل گیا اور ابھی پورے چھ دن ہیں اگلے پرچے کی تیاری کے لیے۔'' چوہدری عظمت اللہ کو پیٹ بھرنے کے بعد اب نیند آ رہی تھی اور وہ گھر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

''اور یہ چھ دن مسلسل کام۔''

مدنی صاحب نے اپنے کمرے سے لا کر خبروں کا پلندہ عبدالعلی کی طرف بڑھا دیا یہ ہفتے بھر میں مختلف اخبارات میں چھپنے والی خاص خاص خبریں تھیں۔

''ذرا ہیڈ لائن تو پڑھنا۔'' عظمت اللہ نے کہا۔

''اسلامی کانفرنس کے مندوبین نے کہا کہ اقوام متحدہ عراق میں اپنا کردار ادا کرے۔''

غزہ کی پٹی پر ایک فدائی حملے میں چھ افراد ہلاک۔ نجف اشرف میں دھماکے۔''

مزار شریف میں اتحادیوں اور طالبان میں جھڑپ۔

وانا میں زئی خیل قبیلوں اور سیکورٹی فورس کے درمیان بات چیت'' عبدالعلی نے ساری خبروں کی ہیڈ لائن پڑھیں۔

''میری سمجھ میں یہ سب نہیں آتا۔'' فرح نے ہیڈ لائنز سن کر کہا۔

''تمہارے پاس چونکہ عقل کی کمی ہے، اس لیے تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکتی۔''

مجاہد حسین نے اسے چھیڑا۔ وہ اس سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔

''تمہارے پاس عقل ہے نا، تو مجھے سمجھا دو۔''

''میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے۔ مجھے ابھی اپنی ریل دھلنے دینی ہے۔''

''وقت نہیں ہے یا عقل کی کمی ہے''۔ فرح ہنسی۔

''بالکل سامنے کی بات ہے بی بی! یہ سب کچھ یہ ساری دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہ سب ایک واحد طاقت ہے جو کروا رہی ہے اور ہم سب اس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں

بلکہ مجبور ہیں کھیلنے پر۔''

''کیوں مجبور ہیں' کیا ہمارے پاس ذہن نہیں ہے' سوچ نہیں ہے؟''

''وہ ان کے پاس ہی گروی رکھی ہے اور یوں بھی سب کے پاس تمہارے جیسی سوچ نہیں ہے۔'' مجاہد نے پھر اسے چھیڑا لیکن وہ یکدم بے حد سنجیدہ سی ہو کر عبدالعلی کو دیکھنے لگی۔

''علی! آپ حالات حاضرہ پر تبصرہ اور تجزیہ کرتے ہیں۔ آپ مجھے بتائیں کہ آخر ایک اتنی بڑی طاقت کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ اپنے ملک سے سینکڑوں میل دور دوسرے ملک پر فوج کشی کر رہا ہے جبکہ اس میں اس کا اپنا نقصان بھی ہو رہا ہے۔''

''اپنا نقصان۔'' عبدالعلی تلخی سے ہنسا۔

''آٹے میں نمک کے برابر۔ سو کے مقابلے میں ایک یا دو امریکی یا اتحادی وہ بھی کبھی کبھار ہلاک ہو جاتے ہیں اور وہ ایک بی بی نے جو چند تابوتوں کی تصویریں چھاپ دیں تو تہلکہ مچ گیا دنیا بھر میں اور وہ جو عراق کے مردہ خانوں میں لاشیں بھری پڑی ہیں۔ کھیل کے میدانوں کو قبرستان بنایا جا رہا ہے۔ گھروں کے آنگنوں میں دفن کیا جا رہا ہے۔ وہ فائدہ جو وہ حاصل کریں گے اس کے مقابلے میں یہ معمولی نقصان تو کچھ بھی نہیں ہے فرح بی بی!''

اس نے دراز کھول کر کچھ فوٹو اسٹیٹ کاغذوں کا پلندہ اس کی طرف بڑھایا۔

''اس میں Black Water اس ایجنسی کے متعلق تفصیلاً لکھا ہے جو امریکہ کے لیے کمانڈو بھرتی کرتی ہے۔ نارتھ کیرولینا میں موپوک کیمپ میں انہیں تربیت دی جاتی ہے اور ان کمانڈوز کا تعلق زیادہ تر چلی اور جنوبی افریقہ سے ہے لیکن بہت جلد بلیک واٹر ساری دنیا میں اپنی شاخیں قائم کر کے چچا سام کے لیے کمانڈوز اور گوریلے بھرتی کرے گی۔ ایک کمپیوٹر اخبار Yaleglobalon نے بھی کہا ہے کہ سیکورٹی ایجنسیاں کنٹرول رسک اور روبی کون عراق جیسے ملک کے لیے کمانڈوز فراہم کر رہی ہیں۔''

''اور یہ ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔'' مجاہد حسین اپنا کیمرہ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

''کل کو کوئی ایسی شاخ ہمارے ملک میں قائم ہو گئی تو اس میں بھرتی ہونے والوں

کی لائن لگ جائے گی کہ ہم سب ڈالر سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔''

''اور کیا خبر تم بھی اسی لائن میں کھڑے ہو۔''

''ہو سکتا ہے۔ دوستو! میں کل اس ایجنسی کے دفتر کے باہر کھڑا ہوں۔ اس لیے شیخ صاحب کو چاہیے کہ اپنے اخبار کے لیے کسی اچھے سے فوٹو گرافر کی تلاش ابھی سے کرنا شروع کر دیں۔''

اس نے میز پر پڑی اپنی بائیک کی چابیاں اٹھائیں اور ایک تلخ سا قہقہہ لگا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

فرح نے رپورٹ کی کاپی بیگ میں ٹھونستے ہوئے عبدالعلی کی طرف دیکھا۔

''یہ میں گھر جا کر پڑھوں گی۔ آپ مجھے امریکہ کے مفاد کے متعلق بتانے لگے تھے۔''

''یہ دانہ و دام کی کہانی بہت پرانی ہے۔ عقاب ننھے سے ایک پرندے کے منہ سے دانہ جھپٹ رہا ہے۔''

عبدالعلی نے تلخی سے سوچا اور فرح کی طرف دیکھا جو پوری آنکھیں کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس تھا' کچھ جان لینے کی خواہش۔

عبدالعلی کو لگا جیسے اس نے ایک بیٹ مس کر دی ہو وہ جب بھی نظر بھر کر فرح کو دیکھتا تھا تو اسے لگتا جیسے اندر دل میں کہیں ہلچل سی برپا ہو گئی ہو۔

''دراصل کچھ عرصہ پہلے مجھے اس سب سے کچھ دلچسپی نہ تھی۔ یونیورسٹی سے آ کر لمبی ڈرائیو پر جانا۔ کسی اچھی جگہ سہیلیوں کے ساتھ لنچ کرنا ہلہ گلہ کرنا اور بس موویز دیکھنا۔''

اس نے کندھے اچکائے۔ عبدالعلی کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ بل کھا کر معدوم ہو گئی۔ تاہم جب وہ بولا تو اس کی آواز میں کوئی تلخی یا طنز نہ تھا۔

''جیسا کہ سب کو پتا ہے یہ دراصل تیل کی جنگ ہے اور ساری دنیا کے تجزیہ نگاروں کا یہی کہنا ہے اور اس کے پیچھے ایک طویل عرصہ کی منصوبہ بندی ہے۔ ساری دنیا کے تیل پر قبضہ کرنا اور ساری دنیا پر حکومت کرنا' یہ تو بہت لمبی ہو جائے گی' میں اس وقت صرف عراق کی بات مختصراً کرتا ہوں۔ جب ۱۹۷۲ء میں بعث پارٹی نے اقتدار سنبھالا تو عراق سے تیل نکالنے والی امریکہ اور برطانیہ کی یہود نواز کمپنیوں کو فارغ کر دیا اور اپنی عراقی پٹرولیم

کمپنی IPC بنائی تو عراق کے زرمبادلہ کی رقم ۳۵ کھرب ڈالر تک پہنچ گئی اور یہ رقم فوج کو جدید اسلحے سے لیس کرنے، نئے اسکول، عمارتیں اسپتال اور سڑکیں بنانے میں صرف ہونے لگی ۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک سے کیمیائی ہتھیار خریدے گئے ۔ سائنس دانوں کو دوسرے ملکوں کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھیجا گیا۔''

وہ بول رہا تھا اور سب خاموشی سے سن رہے تھے ''سعودی عرب، عراق اور دوسرے تیل نکالنے والے ممالک کے تیل پر قبضہ، مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی آرزو، یہ ہے اس ساری کہانی کی حقیقت اور یہ آج کی بات نہیں ہے ۔ نہ جانے کب سے یہ منصوبہ بندی کی جارہی تھی فرح بی بی! نہ جانے کب سے۔'' عبدالعلی کے لہجے میں تھکن تھی۔

''یہ دانہ ودام کی کہانی بہت پرانی ہے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی اور چوہدری عظمت اللہ کی طرف دیکھا۔

''تم تو جانے کا کہہ رہے تھے؟''

''ہاں بس جارہا ہوں'' اس نے اٹھتے ہوئے عادلہ کو اشارہ کیا۔

''میں دو تین دن نہیں آؤں گی ۔ آفس میں کام زیادہ ہے۔'' عادلہ نے اٹھتے ہوئے فرح کو مخاطب کیا۔

''تمہارا دوستی کا پیام لے کر آنے والے انڈین بچوں کے انٹرویو والا آرٹیکل میں نے دیکھ لیا تھا۔ عبدالعلی کو بھی دکھا دینا۔'' فرح نے سر ہلا دیا وہ خاموش بیٹھی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''آپ کا کیا پروگرام ہے؟'' محب اللہ خان نے فرح سے پوچھا۔

عادلہ، چوہدری عظمت اللہ کے ساتھ چلی گئی تھی اور اسے ایک اکیلی لڑکی کا یہاں بیٹھنا پسند نہیں آرہا تھا۔

''میرا خیال ہے، آپ بھی جائیں۔ ہم بھی کچھ دیر تک چلے جائیں گے۔'' فرح نے چونک کر اسے دیکھا اور سر ہلا دیا اور پھر عبدالعلی سے پوچھا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ تمام اسلامی ممالک۔'' اس کا رنگ عبدالعلی کو زرد سا لگا۔

''پہلے عراق، سعودی عرب، ایران مختلف حکمت عملیوں سے۔''

''ناؤ ریلیکس فرح!'' عبدالعلی مسکرایا۔

''اب یہ آج کل میں تو نہیں ہونے والا، ابھی عراق کے معاملات تو سدھار لے امریکہ، جہاں ہر روز لاشوں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔''

''پلیز عبدالعلی! فار گاڈ سیک مزید کچھ نہ کہو مجھے یہ بتاؤ کیا ہم کچھ نہیں کر سکتے؟ کیا ان ملکوں کو خبردار نہیں کر سکتے تم اتنے تجزیے کرتے ہو اتنے مضمون لکھتے ہو؟'' وہ غیرارادی طور پر اسے تم کہہ کر بات کرنے لگی۔ ایک اس کے سوا وہ سب سے ہی بے تکلف تھی۔

''کیا تمہارے قلم میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ تم ان سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کر دو۔ جو غفلت کی نیند پڑے ہیں۔ جو امریکہ کے عزائم سے بے خبر ہیں۔''

عبدالعلی کو اس کی سادگی اور معصومیت پر ہنسی آ گئی۔

''میں کیا اور میرا قلم کیا۔ میں تو آج تک اپنے ملک کے کسی فرد میں کوئی احساس نہیں جگا سکا۔ کسی دوسرے ملک کے لوگوں میں کیا احساس جگاؤں گا۔''

''نہیں خیر، تمہارے وہ کالم پڑھ کر میں تو بہت متاثر ہوئی تھی۔''

فرح نے اسی معصومیت سے کہا اور اپنی بے اختیار مسکراہٹ چھپانے کے لیے عبدالعلی جھک کر دراز میں کچھ تلاش کرنے لگا۔

''ساری بات یہ ہے فرح ہاشمی! کہ سب کو سب پتا ہے۔ کیا سعودی حکمران نہیں جانتے جو کھیل ان کے ساتھ کھیلا جارہا ہے؟ کیا پاکستان اور ایران بے خبر ہے اس سے پہلے کیا صدام حسین نہیں جانتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ لیکن مجبوری یہ ہے کہ ہم سب اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوگا ہمارا۔ ہم ساری دنیا کے مسلمانوں کا؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

علی کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہ تھا اس لیے وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر میز پر بکھرے کاغذوں کو اکٹھا کرنے لگا۔

محب اللہ اور مدنی صاحب دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے ۔ بابا کرماں والا زمین پر بیٹھا اپنے گفٹ کھول کر دیکھ رہا تھا۔

''یہ وہ انڈین بچوں سے ملاقات والا آرٹیکل ہے۔'' بابا کرماں والے نے

سارے گفٹ شاپر میں ڈالے اور دھیان سے فرح کی بات سننے لگا' جو عبدالعلی کو ان بچوں کی ٹیچرز اور بچوں کی باتیں بتا رہی تھی۔

''کرماں والیو! کیسے دوستی ہو سکتی ہے بھلا ہندو اور مسلمان کی، یہ سب تو بس اوپر اوپر سے ہی ہے۔''

''نہیں بابا جی!'' فرح نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ نے نہیں دیکھا ہماری حکومت اور عوام کتنے خوش ہیں اس دوستی سے۔''

''خوش ہیں جی'' سچ مچ خوش ہیں؟'' بابا کرماں والے کو حیرت ہوئی۔

''نہ جی۔''

اس نے بے یقینی سے پہلے فرح اور پھر عبدالعلی کو دیکھا۔

''پر میں تو خوش نہیں ہوں جی میں تو دوستی نہیں کر سکتا۔ نہ ہندو سے نہ سکھ سے۔ نہ جی نہ میں بھلا کیسے محبت کر سکتا ہوں ان سے، کیا میں بھل (بھول) گیا ہوں اپنی ماں کو، اپنی بہن کو جسے سکھ اٹھا لے گئے تھے اور اپنے باپ کو جسے لالہ رام چند نے چھری گھونپ دی تھی۔ نہ جی نہ حکومت کر لے دوستی' عوام خوش ہو جائیں۔ پر میں نہیں خوش ہو سکتا۔ کیسے خوش ہو سکتا ہوں جبکہ کرماں والی میری بہن ابھی تک......''

اور وہ شاپر گود میں رکھے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

☆ ☆ ☆

وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے کچھ گنگنا رہا تھا اور اس کی بھاری آواز لاؤنج میں گونج رہی تھی۔ سیڑھیاں اترتی عنیزہ ایک لمحہ کو ٹھٹکی۔

''یہ اسجد کی آواز کتنی خوبصورت ہے اور اگر یہ ٹی وی پر گانے لگے تو'' اس نے سوچا تب ہی اسجد نے آنکھیں کھول دیں اور سیڑھیوں پر کھڑی عنیزہ کو دیکھا تو آنکھیں چمک اٹھیں۔

''وہاں کیوں کھڑی ہو گئی ہو۔ کیا مجھ سے پردہ کرنے لگی ہو، لیکن میرا خیال ہے ابھی تو ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔''

وہ شرارت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحہ کو وہ شپٹائی۔ اس نے سوچا کہ وہ واپس اوپر چلی جائے لیکن پھر وہ خاموشی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔ اسجد کو آئے دو دن ہو گئے تھے

اور وہ اس سے بچ رہی تھی' لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ کب ممکن تھا۔ اسعد امریکہ سے آ گیا تھا اور آج اس کے آنے کے سلسلے میں نانو اور وہ نیچے ہی مدعو تھیں۔

''عنیزہ!'' اسجد اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ وہ آخری سیڑھی کے پاس کھڑی تھی۔

''دو دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے اور تم نے موقع ہی نہیں دیا حکایت دل کہنے کا۔'' اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

''اسجد! شاید تمہیں نہیں معلوم آنٹی نے تمہارے لیے لڑکی پسند کر لی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''مگر شادی تو مجھے کرنی ہے' مما نے نہیں۔ لہٰذا لڑکی بھی مجھے ہی پسند کرنا ہے جو میں کر چکا ہوں۔''

''اسجد! تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔''

''تم نہیں سمجھتی ہو عینی! اور شاید تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تب ہی......میں نے تم سے کہا تھا......''

''پلیز۔'' عنیزہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

''آنٹی آ رہی ہیں شاید۔''

لاؤنج سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ جہاں آرا کسی سے بات کرتی ہوئی ٹی وی لاؤنج کی طرف آ رہی تھیں۔

وہ تیزی سے لونگ روم میں گھس گئی۔

''ہاں تو اسعد بیٹا! میں کہہ رہی تھی کہ کل سب عزیزوں کو دعوت دے دوں اور تمہاری اور عینا کی منگنی کا اعلان بھی کر دوں اس دعوت میں۔''

''لیکن مما ابھی چار دن ہوئے ہیں مجھے آئے ہوئے' ایسی جلدی بھی کیا ہے۔''

''جلدی کہاں تم یہاں ہوتے تو اب تک تمہاری شادی کر چکی ہوتی پھر آپا جان بھی کب سے منتظر ہیں۔''

''کیا مطلب' کیا آپ نے خالہ جان سے بات کر رکھی ہے؟'' اسعد نے گھبرا کر انہیں دیکھا۔

‘‘ہاں تو میں نے بہت عرصہ سے تمہارے اور عینا کے لیے سوچ رکھا ہے؟’’

‘‘لیکن مما’’ وہ روہانسے ہو گئے۔

‘‘آپ نے کم از کم مجھ سے تو پوچھا ہوتا۔ زندگی میں نے گزارنی ہے۔’’

‘‘تو اب پوچھ لیتی ہوں' کیسی لگتی ہے تمہیں عینا؟’’

‘‘مما! میں عینا سے شادی نہیں کر سکتا۔’’

‘‘کیا؟’’ انہوں نے بے حد حیران ہو کر اسعد کی طرف دیکھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا۔

‘‘کیوں کیا کمی ہے عینا میں؟’’

‘‘مما! کوئی کمی نہیں ہے یقیناً نور العین بہت اچھی ہو گی لیکن میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔’’ انہوں نے بے بسی سے کہا۔

‘‘مگر میں آپا سے بات کر چکی ہوں۔’’

‘‘تو یہ میری غلطی تو نہیں ہے۔’’ اب اسعد کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔

‘‘اس کی کوئی وجہ تو ہو گی اسعد؟’’ ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

‘‘ہاں ہے وجہ۔’’ اسعد ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اسجد کی طرف دیکھا جو خاموشی سے صوفے میں دھنسا دونوں کے مکالمے سن رہا تھا۔

‘‘پاپا کب آ رہے ہیں؟’’

کرنل تاجدار کھاریاں سے سیدھے ایئر پورٹ آئے تھے اور اسے ریسیو کر کے واپس کھاریاں چلے گئے تھے۔

‘‘کل سنڈے ہے نا آج شام کو آ جائیں گے۔’’

‘‘اسجد! تم پہلے تو اتنے سنجیدہ نہ تھے؟’’

‘‘اب بھی نہیں ہوں۔’’ وہ مسکرایا۔

انہوں نے جہاں آرا کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور اب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

‘‘اسجد! پلیز میرے کمرے میں آ نا' مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔’’

اور وہ جہاں آرا کی طرف دیکھے بنا اسجد کو اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کرتے

ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اسجد جاتے ہوئے جہاں آرا کے پاس رکا جو بے حد پریشان سی بیٹھی تھیں اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

‘‘ریلیکس مما۔’’ جہاں آرا نے غصے سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

‘‘وہ وہاں پسند کر آیا ہو گا کوئی میم اور تم یہاں اس کنگال پر مر رہے ہو' لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔’’

اسجد نے ایک تاسف بھری نظر ان پر ڈالی اور اسعد کے کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں اسعد کے انکشاف نے ایک لمحے کے لیے اسے حیران کر دیا تھا۔

‘‘میں لنڈا سے شادی کر چکا ہوں۔ وہ اگلے ہفتے آ رہی ہے۔ اسے میرے ساتھ ہی آنا تھا لیکن پچھلے دنوں عراق میں ہونے والے خودکش حملے میں اس کا بھائی مارا گیا۔ ابھی وہ فلورنس گئی ہوئی ہے۔ اپنے والدین کے پاس۔’’

‘‘آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہئے تھا جب آپ نے شادی کی تھی۔’’ اسجد نے اسعد کی طرف دیکھا۔

‘‘میرا خیال تھا گھر جا کر میں زیادہ بہتر طریقے سے اپنا کیس لڑ سکوں گا اور پھر یہ شادی بھی بالکل اچانک ہوئی۔ وہ فلورنس کی رہنے والی ہے اور کچھ دوستوں کے ساتھ تفریح کے لئے آئی ہوئی تھی۔ میری ملاقات اچانک ہی اس سے ہوئی تھی۔ اس کی ایک دوست بیمار ہو گئی تھی اور وہ اس کے ساتھ تھی اسے واپس جانا تھا اور میں چاہتا تھا وہ نہ جائے رک جائے یوں بس شادی ہو گئی لیکن وہ بہت اچھی ہے۔ بہت پیاری اور محبت کرنے والی۔’’

‘‘وہ تو ٹھیک ہے لیکن مما۔’’ اسجد پریشان ہو گیا تھا۔

‘‘تم' تم کر لو عینا سے شادی۔’’

‘‘میں......؟’’ اسجد حیرت سے بولا۔

‘‘نہیں بھائی! یہ ممکن نہیں ہے۔’’

‘‘تو مما کو روکو۔ وہ تو منگنی کا اعلان کرنے پر تلی بیٹھی ہیں میرے انکار کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ کل کی دعوت میں یہ اعلان کر دیں گی۔’’ وہ اپنی ماں کی نیچر کو خوب جانتا تھا۔

‘‘تو پھر اس کا ایک ہی حل ہے کہ فی الفور مما کو اپنی شادی سے آگاہ کر دیں۔’’

"تم بتا دو مما کو۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ لنڈا کے آنے سے پہلے حالات صحیح ہو جائیں۔"

"لیکن اگر مما نے لنڈا کو بطور بہو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو؟"

"تو میں لنڈا کے ساتھ واپس امریکا چلا جاؤں گا۔ حالانکہ میں پاکستان سیٹل ہونے کا سوچ کر آیا تھا۔"

"مما ہنگامہ تو بہت کریں گی۔ میرا خیال ہے بات شام کو پاپا کے آنے پر کی جائے تو حالات کے زیادہ بگڑنے کا امکان نہیں ہے۔ پاپا سنبھال لیں گے۔"

"جو مناسب سمجھو لیکن دھیان رکھنا مما ابھی جا کر عینا کو انگوٹھی نہ پہنا آئیں۔"

"اچھی بات ہے' دو دو کر لیجیے گا۔" وہ ہنسا۔

"اسجد! میں پریشان ہوں۔"

"پریشان میں بھی کم نہیں بھائی! کہیں آپ کا ڈھول مجھے نہ بجانا پڑے۔"

"تو بجا لینا میرے بھائی! بقول مما عینا اچھی لڑکی ہے اگر میں نے لنڈا سے شادی نہ کر لی ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہ تھا۔"

"اور اگر میرا دل پہلے ہی کسی کی محبت میں نہ ڈوب چکا ہوتا تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔"

"کیا کیا۔" اسعد نے آنکھیں پھاڑیں۔

"کون ہے وہ؟"

"ہے اک پردہ نشین۔" وہ ہنستے ہوئے باہر نکل گیا۔ اور پھر وہی ہوا جہاں آرا نے شادی کا سن کر بے حد ہنگامہ کیا۔ لنڈا کو گھر میں نہ آنے کا حکم سنایا۔ اسعد سے بات کرنا چھوڑ دی۔ کرنل تاجدار نے بھی معاملہ سنبھالنے کی کوشش کی۔

"اب وہ شادی کر چکا سو قبول کر لو۔"

"کیسے' کیسے اور وہ آپا جان' عینا۔"

"میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا کہ اسعد کی واپسی کا انتظار کر لو پھر بات کرنا۔"

کرنل تاجدار صرف چند گھنٹوں کے لیے آئے تھے۔ انہیں سمجھانے کی کوشش کر کے واپس چلے گئے' لیکن اسجد سے انہوں نے عنیزہ کے سلسلے میں بات کر لی تھی اور وہ بہت

مطمئن ہو کر گئے تھے۔

"بے فکر رہو۔" ماں کی طرف سے اس کے خدشات پر انہوں نے جاتے جاتے اسے تسلی دی تھی' سو وہ بے حد مطمئن تھا۔ عنیزہ نے بھی اس کا اطمینان محسوس کیا۔

"تو بس اتنی ہی تھی اس کی محبت' ڈر گیا آنٹی سے۔ کہاں تو اسے ڈھونڈتا پھرتا تھا اس سے بات کرنے کے بہانے تلاش کرتا تھا اور کہاں تین دن سے اوپر بھی نہیں آیا تھا۔" کچن میں چائے بناتی ہوئی وہ مسلسل اسجد کو ہی سوچ رہی تھی کہ بالکل اچانک اس نے پیچھے سے آ کر اسے پکارا۔

"عینی۔"

"فرصت مل گئی؟" عنیزہ نے مڑتے ہوئے بے اختیار کہا۔

"اوہ' تو میرا انتظار تھا۔" اسجد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"جی نہیں' مجھے کیا ضرورت تھی انتظار کرنے کی۔"

"تم اپنی بات کی خود ہی نفی کر رہی ہو۔" وہ مسکرایا۔

"تم بیٹھو نانو کے پاس۔" "تمہیں یاد کر رہی تھیں۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

"تم چائے بنا لو' میں دیکھوں گا کہ تم کیسے چائے بناتی ہو۔" وہ کچن میں آ گیا تو عنیزہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

"باہر چل کر بیٹھو نا۔"

"میں تم سے ملنے آیا ہوں عینی۔" اس نے اسٹول کھینچا اور اس پر بیٹھ کر مسکراتی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"اور اگر اس وقت آنٹی آ جائیں تو بھاگ اٹھو گے۔"

"ہم بھاگنے والوں میں سے نہیں ڈیئر عنیزہ! ہم ساتھ نبھانے والوں میں سے ہیں۔" اس کی نظریں عنیزہ کے چہرے پر تھیں جو گل رنگ ہو رہا تھا۔ اس نے چائے دم کی اور ٹرے میں کپ رکھے۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے اپنا مخصوص شعر گنگنانے لگا۔

میکدہ جمال میں کیا ہیں رسوم مے کشی
آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے

عنیزہ نے شوگر پاٹ ٹرے میں رکھا۔

''چلو نانو کے کمرے میں۔''

''عینی! میں جو تمہاری محبت میں مجنوں بنا ہوا ہوں تو کوئی ایک لفظ تم بھی کہہ دو تا کہ دل کی تشنگی کم ہو۔''

''اسجد! تم بھی بس الٹی سیدھی ہانکتے رہتے ہو۔ سب کچھ جانتے ہو تم کہ آنٹی۔''

''یہاں آنٹی کا کیا کام بھئی میں جو تم سے کہہ رہا ہوں' کیا میرے لیے تمہارے دل میں کچھ نہیں ہے؟''

''کیا فائدہ کچھ کہنے کا۔''

''فائدہ کیوں نہیں' تمہارے لفظوں کے سہارے یہ چھ ماہ کاٹ دوں گا۔ اگر مما نے کچھ گڑبڑ بھی کی تو یہ احساس تو رہے گا نا کہ تم نے بھی۔''

''کیا یہ بتانا ضروری ہے اسجد!'' عنیزہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''خیر اتنا ضروری بھی نہیں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''لیکن ذرا دل خوش ہو جاتا۔''

''آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے۔'' گنگناتے ہوئے اس نے عنیزہ کے ہاتھ سے ٹرے پکڑ لی۔

''ویسے ہو بہت ظالم' بھئی ایک فوجی کی زندگی کا کیا بھروسہ...... یہ ہی سوچ کر کہہ دیتیں کہ کیا خبر پھر۔''

''فضول باتیں ضرور کرو گے تم۔''

اس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

اسجد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ ایک بار جی چاہا کہ پاپا کے ساتھ ہونے والی کمٹمنٹ بتا دے' لیکن پھر ارادہ بدل دیا اور یونہی گنگناتے ہوئے ٹرے اٹھائے نانو کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ سب اسکرین پر نظریں جمائے ساکت بیٹھے تھے۔

''خدا کے لیے بند کرو' بند کرو اسے۔'' عادلہ کی آواز لرز رہی تھی۔

''its too much'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ فرح

نے ٹی وی آف کر دیا۔

امریکی چینل سی بی ایس کے پروگرام سکسٹی منٹس میں ابوغریب جیل میں قیدیوں پر ہونے والے مظالم کے سلسلے میں ایک تصویری رپورٹ پیش کی گئی تھی اور بعد میں برطانوی اخبار ڈیلی مرر نے یہ رپورٹ خرید کر چھاپ دی تھی اور اس ظلم کے خلاف ساری دنیا میں احتجاج ہو رہا تھا اور اسی رپورٹ کی کچھ جھلکیاں ایک مقامی چینل پر دکھائی جا رہی تھیں اور وہ سب دیکھ رہے تھے۔

''ناؤ ریلیکس عادلہ!''

فرح نے اٹھ کر عادلہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

عادلہ نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''اور ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے یہ ہماری بے بسی کی انتہا ہے۔ نا فرح!'' عادلہ نے تائید طلب نظروں سے فرح کو دیکھا۔

''ہاں اور ہم جو کر سکتے ہیں وہ بھی نہیں کر رہے عادلہ بی بی! پوری دنیا میں اس ظلم کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے اور یہ احتجاج کرنے والے کون ہیں؟'' اس کے لہجے میں تلخی آ گئی۔

''یورپین' امریکی' برطانوی یہ سب ہمارے مسلمان بھائیوں پر ہونے والے ظلم پر احتجاج کر رہے ہیں اور یہ ان ہی کا احتجاج ہے جس کی وجہ سے امریکی صدر نے عراق کے عوام سے معافی مانگی۔ لیکن ہم سب اسلامی ملک اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ کسی اسلامی ملک میں میری معلومات کے مطابق کوئی احتجاجی جلوس نہیں نکلا۔ کسی نے اس امر کی مذمت نہیں کی' تو پھر اگر ساری دنیا میں مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا جا رہا ہے تو رونا کیسا؟ یہ ہمارے اپنے اعمال ہیں۔ ہماری بے حسی ہے۔''

''آخر ہم' ہم مسلمان ممالک نے کیوں احتجاج نہیں کیا؟'' عادلہ نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہم سب کو خوف تھا کہ کہیں امریکہ بہادر ان سے ناراض نہ ہو جائے اور ظاہر ہے ہم اسے ناراض کرنا افورڈ نہیں کر سکتے۔'' محب اللہ خان نے جو صبح سے خاموش اور پریشان سا بیٹھا تھا تلخی سے بولا۔

''اور یہ ظلم کی انتہا ہے' ہے نا۔''

عظمت اللہ نے عبدالعلی اور محب اللہ کی طرف باری باری دیکھا اور پھر دونوں کی طرف سے جواب نہ پا کر اپنی ٹیبل کے پاس جا کر قلم اٹھالیا۔

''یقین نہیں آتا یار! مجھے یقین نہیں آ رہا اس سب پر۔''

''تمہیں' تمہیں بھلا کیوں یقین آئے گا اس لیے کہ تمہاری مصلحت کبھی بھی امریکہ کو غلط قرار نہیں دیتی۔'' محب اللہ خان نے غصے سے قلم ٹیبل پر پٹخ دیا۔

''وہ تمہیں تو قلعہ جنگی میں ہونے والے مظالم کا بھی یقین نہیں تھا۔ تم نے تو کنٹینروں میں جیتے جاگتے انسانوں کو بند کر دینے والی بات پر بھی یقین نہیں کیا تھا۔ اور تمہیں یہ بات بھی جھوٹ ہی لگتی تھی کہ وہ لوگ زندہ انسانوں کی شہ رگوں میں پٹرول بھر کر رقص بسمل کا تماشا دیکھتے ہیں اور تم تو جمی ڈوران Jami Doran کی ڈاکومنٹری فلم ''افغان مساکر دی کانوائے آف ڈیتھ'' سے بھی منکر ہو گئے تھے' جو اس نے نجیب اللہ قریشی کے ساتھ مل کر خود افغانستان جا کر بنائی تھی۔

۳۵ ممالک نے یہ فلم دکھائی اور جسے دیکھ کر برطانیہ میں کسی نے کہا تھا۔ ''مجھے انسان ہونے پر شرمندگی ہوتی ہے'' اور تم کہتے رہے نہیں یار! بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے میرا دل نہیں مانتا۔ نہیں یار! یہ خوامخواہ امریکہ جیسے ملک کو بدنام کرنے کی سازش ہے۔ یہ قلعہ جنگی' شبدان اور کنٹینرز میں مرنے والے لوگ۔ یار یہ سازش ہے'' محب اللہ خان طنز سے ہنسا۔

''اور ابھی سب کچھ جو تم نے دیکھا ہے تم اس سے بھی منکر ہو گے اور سوچ رہے ہو گے ضرور کسی نے غلط فلم بنائی ہے۔ ٹرک ہے کیمرے اور کمپیوٹر کی سازش ہے۔'' محب اللہ نے ایک طنزیہ نظر اس پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

چوہدری عظمت اللہ کا سر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کی عینک ناک کی پھننگ سے پھسل کر ہونٹ تک آ گئی تھی اور وہ اس سے بے نیاز کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہا تھا۔

''میں بھی کیا کروں میں امریکہ سے نفرت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے عہد میں امریکہ کا ساتھی ہوں۔ میں نے پڑھا تھا کہ جرات' غیرت' عزت' حیا الفاظ ہیں سارے اور ایجاد ہیں احمق لوگوں کی اور میں تو امریکہ جا کر ڈالر کمانا چاہتا ہوں تا کہ اپنے گھر کی غربت

دور کر سکوں۔''

''تم کچھ محسوس نہ کرنا عظمت یار! محب اللہ کبھی کبھی جذباتی ہو جاتا ہے۔ قلعہ جنگی میں ہاتھ پاؤں باندھ کر جن قیدیوں پر نشانہ بازی کی مشق کی گئی تھی ان میں سے ایک محب اللہ کا چچازاد بھی تھا جو محض جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر افغانستان چلا گیا تھا۔''

''میں نے مائنڈ نہیں کیا۔'' چوہدری عظمت اللہ کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کلپ بورڈ پر نئے کاغذ لگائے اور ''دہشت گردی'' کے خلاف کالم لکھنے لگا۔ اس کا موضوع تھا ''دہشت گردوں کا خاتمہ ضروری ہے۔''

☆ ☆ ☆

''کیا بات ہے محب! تم پریشان ہو کئی دنوں سے......؟''

''وانا کی صورت حال دن بدن خراب ہو رہی ہے عبدالعلی! اور مجھے ابو حذیفہ کی پریشانی ہے۔''

''یعنی تمہارے بہنوئی؟''

''ہاں لیکن عبدالعلی ابو حذیفہ غیر ملکی ہے۔ وہ یمن سے ان دنوں افغانستان آیا تھا جب روس اور افغانستان کی جنگ ہو رہی تھی۔ جذبہ جہاد سے سرشار وہ ایک سچا مسلمان تھا جب وہ ہمارے گھر آیا تھا تو زخمی تھا۔ میرے بابا جان نے اسے بیٹا بنا لیا اور پھر کچھ عرصہ بعد اس کی شادی میری بہن سے کر دی اس کا کسی بھی تنظیم سے تعلق نہیں' وہ القاعدہ یا اسامہ کو نہیں جانتا مجھے ڈر ہے کہ اس سب معاملے میں کہیں......وہ بہر حال ہے تو غیر ملکی نا لیکن قسم لے لو یار وہ دہشت گرد ہرگز نہیں ہے۔''

''میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ تمہارے علاقے کے لوگ حکومت کے ساتھ افہام و تفہیم سے معاملہ طے کیوں نہیں کرتے اگر کچھ دہشت پسند وہاں پناہ لے چکے ہیں تو انہیں حکومت کے حوالے کر دیں۔''

فرح شولڈر بیگ کندھے پر ڈالے جانے کب اپنے کیبن سے باہر آ گئی تھی۔

''کون جانے وہ دہشت گرد ہیں یا......'' محب اللہ خان منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''یہ فیصلہ کرنا تو حکومت کا کام ہے محب اللہ! تم لوگ انہیں حکومت کے حوالے کر دو۔ بغیر ثبوت کے تو وہ انہیں دہشت گرد قرار نہیں دے گی نا۔''

''حکومت کی اپنی مصلحتیں اور اپنی مجبوریاں ہیں اور ہماری اپنی اقدار' اپنی حمیت و غیرت۔''

''لیکن افہام و تفہیم سے بھی معاملہ طے پا سکتا تھا اس کے لیے اتنی خونریزی کی کیا ضرورت ہے۔'' فرح کو اس بات کا از حد دکھ تھا کہ اپنی ہی افواج اپنے ہی ملک کے ایک حصے میں اپنے ہی مسلمان بھائیوں پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہو گئی ہے۔

''یہ حکومت کی باتیں ہیں۔''

''سارا قصور حکومت کا تو نہیں ہو گا تم لوگوں نے ہی مذاکرات کرنے سے انکار کر دیا ہو گا۔''

محب اللہ نے فرح کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور میز پر پڑا والٹ اٹھا لیا۔

''او کے عبدالعلی! میں شاید کل گھر جاؤں گا اگر نہ آیا تو شیخ صاحب کو بتا دینا۔''

''انشاء اللہ! سب ٹھیک ہو گا پریشان مت ہونا۔''

عبدالعلی نے محب اللہ خان کو تسلی دی اور بابا کرماں والے کو آواز دی۔

''بابا جی! آفس لاک کر دیں۔ ہم جا رہے ہیں۔''

بابا کرماں والا آفس کے اوپر ہی ایک کمرے میں رہتا تھا۔

''ٹھیک ہے جی۔''

عبدالعلی اور فرح آگے پیچھے ہی آفس سے نکلے تھے۔ محب اللہ خان کی بائیک باہر نہیں تھی گویا وہ جا چکا تھا۔

''علی پلیز! آج میرا ڈرائیور چھٹی پہ تھا آپ ذرا مجھے اسٹاپ تک ڈراپ کر دیجیے گا۔''

عبدالعلی نے ایک طنز بھری مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مس فرح!'' اس کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے ہوئے بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''یوں تو آپ بہت بولڈ ہیں اور سچ کہتے ہوئے ذرا بھی نہیں ہچکچاتیں۔ لیکن خود

اپنی ذات کو آپ نے جھوٹ کے ملمع میں کیوں چھپا رکھا ہے۔ یقین کریں اس ملمع کے بغیر بھی آپ کی شخصیت میں بہت شائننگ ہے۔''

فرح نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا۔ ''میں نے دنیا میں جھوٹ اور منافقت سے زیادہ نفرت کسی شے سے نہیں کی مسٹر عبدالعلی! کیا آپ بتائیں گے کہ آپ نے یہ سب کچھ کیوں کہا؟''

''اس لیے مس فرح! کہ آپ اپنی گفتگو سے اس طرح ظاہر کرتی ہیں جیسے آپ کا تعلق کسی بہت دولت مند فیملی سے ہے۔ آپ کی ذاتی گاڑی ہے۔ جبکہ میں نے خود آپ کو ویگن میں سفر کرتے دیکھا ہے۔'' فرح لمحہ بھر اسے دیکھتی رہی پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ہنسنے سے اس کے دائیں گال میں پڑنے والا بھنور ہمیشہ کی طرح اسے بہت دلکش بنا رہا تھا۔

''میں تو اکثر ویگن میں بلکہ بس میں بھی سفر کرتی رہتی ہوں' آپ نے صرف ایک بار مجھے دیکھا؟ جب مجھے رابعہ کے ساتھ انارکلی جانا ہوتا ہے یا اچھرہ تو میں اس کے ساتھ ویگن یا بس میں ہی جاتی ہوں' اور بانو بازار کی چاٹ مجھے بہت پسند ہے مجھے شاپنگ نہ بھی کرنی ہو تو میں رابعہ کے ساتھ چاٹ کھانے جاتی ہوں۔ رہی ذاتی گاڑی کی بات تو یہ اس وقت سے میرے پاس ہے جب میں میٹرک میں تھی جہاں آپ کے اخبار کا آفس ہے وہاں پارکنگ کی کوئی جگہ نہیں ہے اس لیے میں ڈرائیور کے ساتھ گاڑی واپس بھیج دیتی ہوں۔''

عبدالعلی نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ سادہ سی شارٹ شرٹ اور ٹراؤزر کے ساتھ وہ کسی عام سے گھرانے کی لڑکی ہی لگ رہی تھی۔

''آپ تو صحافی ہیں' جانتے ہوں گے کہ مسز بدر ہاشمی اتنی بھی کنگال نہیں ہیں کہ ان کی بیٹی کے پاس ایک ذاتی گاڑی تک نہ ہو۔'' عبدالعلی چونکا۔

''آپ......''

''ہاں' بدقسمتی سے میں مسز بدر ہاشمی کی اکلوتی بیٹی فرح ہاشمی ہوں۔''

''سوری۔'' عبدالعلی کو شرمندگی ہوئی کہ اس نے خوامخواہ اسے جھوٹا کہا۔

''کوئی بات نہیں۔'' وہ مسکرائی۔

وہ اس کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''آپ نے بدقسمتی کیوں کہا۔ مسز بدر ہاشمی کی بیٹی ہونا تو خوش قسمتی ہے۔ اتنی بڑی

برنس ٹائیکون......"

"لیکن میں اسے بدقسمتی سمجھتی ہوں۔ کاش میں مسز بدر ہاشمی کے بجائے کسی غریب مزدور کی بیٹی ہوتی۔"

عبدالعلی کو حیرت ہوئی لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ اسے فرح کے ذاتی معاملات میں دخل دینا اچھا نہیں لگا لیکن اس نے محسوس کیا کہ فرح کی ہنستی ہوئی آنکھوں میں یکدم کرب سا چھا گیا ہو۔ وہ ہونٹ بھینچے سامنے دیکھ رہا تھا اور اس روز فرح کے منع کرنے کے باوجود اس نے اسے اس کے گھر ڈراپ کیا۔

"آیئے پلیز کچھ دیر تو بیٹھیے ایک کپ چائے ہو جائے۔" فرح نے اصرار کیا تو وہ خاموشی سے گاڑی اندر پورچ میں لے گیا' جہاں پہلے ہی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔

"ڈیفنس میں اتنا بڑا اور شاندار گھر۔" عبدالعلی دل ہی دل میں بے حد شرمندہ سا ہوا۔ ڈرائنگ روم کی ڈیکوریشن دیکھ کر وہ مبہوت سا رہ گیا۔ ایک چھوٹے سے درخت نے اسے بے حد امپریس کیا۔ اصل زمرد سے تراشا ہوا درخت تھا جس پر یاقوت اور نیلم کے ننھے منھے پھول بنے ہوئے تھے اور پھولوں پر اصلی ہیرے کی کنیاں شبنم کے قطروں کی صورت دمک رہی تھیں۔

"ونڈرفل۔" عبدالعلی کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

"کیا یہ رئیل اسٹون ہیں؟"

"ہاں۔" فرح کے انداز میں لاپروائی تھی۔

"یہ بہت قیمتی ہوگا؟"

"ہاں اور یہ انشورڈ ہے بلکہ اس ڈرائنگ روم کی اکثر اشیاء انشورڈ ہیں۔"

"فرح! یہ تین ہزار روپے کی ملازمت......"

"صرف اپنا کتھارسس کرنے کے لیے۔" فرح نے اسے اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔

"وہ چند گھنٹے جو میں وہاں گزارتی ہوں میرے لیے بہت انمول ہوتے ہیں مجھے لگتا ہے جیسے وہاں میری روح آزاد ہے اور یہاں گھر میں جو بہت بڑا ہے مجھے بہت گھٹن ہوتی ہے عبدالعلی!" اس کی سیاہ آنکھیں لمحہ بھر کو دھندلائیں مگر پھر وہ سر جھٹکتے ہوئی بولی۔

"خیر آپ بتائیں کافی یا چائے؟"

"جو جی چاہے۔"

عبدالعلی' فرح کے متعلق سوچ رہا تھا کہ آخر یہ لڑکی اتنی دولت' اتنی آسائش کے ہوتے ہوئے بھی مطمئن کیوں نہیں ہے اس وقت وہ اپنے گھر کے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھی اس فرح ہاشمی سے بالکل مختلف لگ رہی تھی جو آفس میں نظر آتی تھی مطمئن خوش باش ہنستی مسکراتی۔

چائے کا کہہ کر فرح اس کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھی۔

"آپ میرے متعلق سوچ رہے ہیں نا؟"

"ہاں۔" عبدالعلی نے اعتراف کر لیا۔

"میری کہانی کوئی ایسی خاص نہیں ہے عبدالعلی! مسز بدر ہاشمی میری ماں ہیں لیکن وہ مجھے ماں نہیں لگتیں کبھی بھی نہیں لگیں۔ بس وہ مجھے عورت لگتی ہیں' صرف عورت جسے پیسے کی' شہرت کی اور اپنے حسن کی تعریفیں بٹورنے کی ہوس ہوتی ہے۔ میری ماں کے پاس بے تحاشہ دولت ہے لیکن پھر بھی اسے پیسے کی ہوس ہے۔ جب میرے پپا کا انتقال ہوا تو وہ اس وقت یہاں کے پندرہویں نمبر پر تھے لیکن تم جانتے ہو علی! مما نے اس کے باوجود مزید دولت کی ہوس کی اور یہودیوں کی قائم کردہ ایک این جی او کی کرتا دھرتا بن گئیں۔

یہ این جی او بلکہ زیادہ تر این جی اوز کو یہی لوگ سپورٹ کر رہے ہیں۔ میں ایک بار گئی تھی مما کے ساتھ' وہاں میری ملاقات ایک فیشن ایبل خاتون سے ہوئی تھی۔ جو دبئی میں موجود این جی او میں عیسائی مشنریز کی طرف سے متعین تھی اور مسلمانوں کے خلاف سیمینار منعقد کرواتی تھی اور مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ اس نے مجھے بھی قائل کرنے کی کوشش کی کہ حضرت عیسیٰ......"

"خیر چھوڑو۔" وہ ہنسی۔

"تم بھی کیا کہو گے' کیا باتیں لے بیٹھی ہو۔"

"نہیں تم کہو فرح! میں سن رہا ہوں۔" عبدالعلی بے حد سنجیدہ تھا۔

وہ پچھلے کئی مہینوں سے پاکستان میں موجود این جی اوز پر کام کر رہا تھا۔

"میری مما کے اکاؤنٹ میں ہر ماہ ہزاروں ڈالر جمع ہوتے ہیں اور یہ این جی

او' جس میں مما ہیں اسلام کے خلاف مواد چھاپ کر چوری چھپے تقسیم کرواتی ہے۔ عیسائی ہو جانے والوں کے لیے مختلف مراعات ہیں۔ مثلاً امریکہ میں جاب' گرین کارڈ، اعلیٰ تعلیم۔۔۔۔۔۔۔''

''لیکن کوئی مسلمان مذہب نہیں بدلتا فرح! چاہے وہ کیسا بھی ہو۔''

''ہاں میں بھی یہی سمجھتی تھی۔ پپا بتاتے تھے کہ پاکستان بننے سے پہلے ان کے ایک رشتہ دار نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا تھا اور اپنا خاندان چھوڑ کر اس عیسائی مشنری کے پاس چلا گیا تھا جس نے اسے عیسائی کیا تھا۔ دراصل وہ بہت غریب تھے اور اسے اعلیٰ تعلیم کا شوق تھا۔ بعد میں ایک بار وہ پپا کو کراچی میں ملا تھا۔ اتنی بڑی داڑھی اور پیشانی پر سجدے کا نشان' اس نے پپا کو بتایا کہ تعلیم اور پیسے کی خاطر اس نے مذہب تبدیل کر لیا تھا' لیکن دل مطمئن نہیں ہوتا تھا تب وہ واپس آ گیا لیکن ان دنوں پاکستان بن گیا تھا اور اسے اپنے عزیزوں کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں۔ لیکن عبدالعلی! مجھے خود اس خاتون نے بتایا کہ افغانستان میں اور انڈونیشیا میں کتنے ہی مسلمانوں نے مذہب بدل لیا ہے۔''

عبدالعلی حیران سا بیٹھا تھا۔ تب ہی چائے آ گئی اور اس کے لیے چائے بناتے ہوئے فرح مسکرائی۔

''تم حیران ہو عبدالعلی!'' وہ اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

''کہ میں نے مسز بدر ہاشمی کی بیٹی نے تین ہزار روپے کی جاب کیوں کی؟'' وہ ہنسی۔

''مجھے اپنی مما سے نفرت ہے عبدالعلی! یو نو یہ عورت' یہ وہ عورت ہے جس نے میری پھوپھی سے اس کے منگیتر کو چھین لیا تھا۔ صرف اس لیے کہ میری پھوپھی کا منگیتر بہت خوبصورت تھا اور وہ عام سی شکل وصورت والی لڑکی تھی' میرے جیسی' اور میری مما سمجھتی تھیں کہ ہر خوبصورت شے پر ان کا حق ہے۔

میرے پپا بھی کم خوبصورت نہ تھے۔ لیکن جب سنان حیدر امریکہ سے آیا جو میرے پپا کا سگا چچا زاد تھا اور بچپن سے ہی میری پھوپھی سے منسوب تھا تو میری مما نے انہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔

میری مما کو اس سے شادی نہیں کرنا تھی لیکن وہ اسے پھپھو سے چھین لینا چاہتی تھیں اور وہ اس میں کامیاب ہو گئیں۔''

''سنان حیدر نے پھپھو سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور پپا نے ان کو ایک روز سنان حیدر کے ساتھ دیکھ لیا...... پاس پاس بیٹھے باتیں کرتے یوں کہ سنان حیدر کا ہاتھ مما کے ہاتھ میں تھا۔ تب اس روز گھر میں بہت ہنگامہ ہوا۔ پپا بہت بولے۔ مما نے صاف صاف کہہ دیا چونکہ افروز معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہے اس لیے سنان کا ان کی طرف مائل ہونا قدرتی بات ہے۔ ورنہ انہیں سنان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی انہیں سنان سے کوئی لگاؤ ہے' تب پپا خاموش ہو گئے لیکن اگلے روز انہیں شدید ہارٹ اٹیک ہوا اور دس روز بعد ایک اور اٹیک میں وہ زندگی سے ہار گئے۔

پھپھو ان کے بعد اپنے چھوٹے بھائی کے پاس ناروے چلی گئیں اور پھر کبھی نہیں آئیں اور یہاں میں ہوں' مما ہیں اور یہ اتنا بڑا گھر۔'' وہ ہنسی عجب دل میں چبھتی ہوئی ہنسی تھی۔ دل کو پگھلاتی اور پانی پانی کرتی۔

عبدالعلی دکھ سے اسے دیکھتا رہا۔ کتنی بے دردی سے اس نے اپنے متعلق سچ بولا تھا۔

''ناؤ ریلیکس فرح۔''

''میں بالکل ریلیکس ہوں علی! تم بے فکر رہو۔ یہ سب آج کی بات نہیں ہے۔'' اس نے پلکیں جھپکائیں' لیکن اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو رہی تھی۔ تب ہی پہلے گیٹ کھلنے اور پھر پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''شاید مما آ گئی ہیں۔ حالانکہ عموماً اس وقت وہ جم میں ہوتی ہیں۔''

''او کے' میں چلتا ہوں۔'' عبدالعلی اٹھ کھڑا ہوا۔

''ارے بیٹھو نا علی؟ مما کو اس بات کی کبھی پروا نہیں ہوتی کہ میرے ساتھ کون ہوتا ہے اور کون نہیں۔''

عبدالعلی کو اس کی آنکھوں میں التجا سی نظر آئی اور وہ بیٹھ گیا۔ تب ہی ایک خاتون اندر داخل ہوئیں' اتنا مکمل حسن' عبدالعلی کی نظر ایک لمحہ کو اٹھی تھی پھر وہ سر جھکائے نیچے دیکھنے لگا۔

سیاہ ساڑھی میں ملبوس وہ خاتون بے تحاشا حسین تھیں اور ہرگز معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ فرح جیسی لڑکی کی ماں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تیس سال کی لگ رہی تھیں۔

''اوہ تم یہاں ہو''۔ وہ ایک قدم آگے بڑھیں۔

''یس مما''۔ فرح کا چہرہ سپاٹ تھا۔

''یہ میرا دوست علی ہے۔''

''تھینک گاڈ تم نے بھی کوئی دوست بنایا۔'' انہوں نے ایک تنقیدی نظر اس پر ڈالی۔

''غالباً پورچ میں تمہاری ہی گاڑی ہے'' علی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اوکے' تم لوگ گپ شپ لگاؤ، مجھے تو ابھی جانا ہے جم...... آج جمشید صاحب ایک زبردست ڈنر دے رہے ہیں۔ ''تم چلو گی؟''

''نو'' فرح کا لہجہ اور چہرہ ہنوز سپاٹ تھا۔

''ارے ہاں''۔ وہ جاتے جاتے مڑیں۔

''ایک زبردست لطیفہ سنو ہنی! وہ ہیں نا بیگم جہاں آرا وہی کرنل تاجدار کی مسز انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے اسجد کے لیے تمہیں مانگنا چاہتی ہیں' یعنی بدر ہاشمی کی اکلوتی بیٹی کو'' وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔

''یعنی بدر ہاشمی کی بیٹی ایک معمولی سے کیپٹن سے بیاہی جائے؟ انہیں بات کرنے سے پہلے سوچ لینا چاہیے تھا میں نے تو تمہارے لیے جمشید صاحب کے بیٹے خلدون کا انتخاب کر رکھا ہے۔''

فرح خاموش بیٹھی رہی اس نے کوئی تبصرہ کیا نہ ہی عبدالعلی نے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ اسجد اس کا کزن ہے۔ اس رات جب عبدالعلی گھر واپس آ رہا تھا تو مسلسل فرح کے متعلق سوچ رہا تھا اور یہ انکشاف اسے مسلسل پریشان کر رہا تھا کہ وہ فرح سے محبت کرنے لگا ہے۔ فرح جو اس کی دسترس سے بہت دور تھی' بھلا بدر ہاشمی کو کب گوارا ہو گا کہ ان کی بیٹی عبدالعلی جرنلسٹ سے بیاہی جائے جبکہ اسجد اور آنٹی کا کتنا تمسخر اڑا رہی تھیں' جبکہ آنٹی کو بدر ہاشمی کی دوستی پر بڑا ناز تھا۔ اس نے فرح کا خیال اپنے ذہن سے جھٹکنا چاہا۔

''یہ لڑکی تمہارے لیے نہیں ہے عبدالعلی! اور بدر ہاشمی نے تمہیں ہی سنایا تھا۔''

اس نے دل کو سمجھایا لیکن فرح ہاشمی نے اچانک ہی دل میں اپنی مسند سنبھال لی تھی اور اس کی بے بسی سے بے نیاز دل میں براجمان مسکرائے جا رہی تھی۔ تب بے بس ہو کر اس نے ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا اور ذہن کو آزاد چھوڑ دیا فرح کے متعلق سوچنے کو۔

☆ ☆ ☆

باہر ٹی وی لاؤنج میں رونق لگی تھی۔ اسعد' لنڈا' علینہ' عبدالعلی' کرنل تاجدار اور نانو کی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔

گوشت کو دہی لگاتے ہوئے عنیزہ نے سوچا اگر آج اسجد بھی یہاں ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔ تصور میں یکدم اسجد آ گیا۔ مسکراتا' گنگناتا ہوا۔

''آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے۔''

دہی لگا کر اس نے گوشت ایک طرف کاؤنٹر پر رکھا اور تھوڑا سا جھانک کر باہر دیکھا۔

جہاں آرا خاموش بیٹھی تھیں' باقی سب باتیں کر رہے تھے۔

اسعد کے آنے کی خوشی میں نانو نے سب کی دعوت کی تھی نانو بے حد خوش اور مطمئن تھیں۔ کل کرنل تاجدار نے ان سے اسجد اور عنیزہ کی بات کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ آنے والی اتوار کو وہ عنیزہ کو انگوٹھی پہنا دیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنے ایک دوست کرنل مصطفیٰ کے بیٹے سے علینہ کا رشتہ طے کر دیا تھا اور وہ چاہ رہے تھے کہ جب وہ لوگ علینہ کو انگوٹھی پہنانے آئیں تو عنیزہ کو بھی انگوٹھی پہنا دی جاتی۔ بھلا نانو کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا لیکن جہاں آرا کیسے راضی ہوئی تھیں۔ ان کے متعلق وہ لاعلم تھیں۔ اسجد نے سچ ہی کہا تھا۔

''تم دیکھنا عنیزہ! بہت جلد میں تمہیں اپنا بنا لوں گا۔''

وہ کچن میں کام کرتے ہوئے مسلسل اسجد کے متعلق سوچتی رہی اور اگر جہاں آرا نہ مانتیں اور اگر اسجد کی شادی مسز بدر ہاشمی کی بیٹی سے ہوتی تو؟ اور اسے لگا جیسے اس خیال سے ہی اس کا دل خالی ہو گیا ہو بالکل ویران۔

''اور ساری بات یہ ہے کہ کیپٹن اسجد تاجدار! کہ میں بھی تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔''

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ سب نے ہی ہر ڈش کی تعریف کی خصوصاً

لنڈا نے‘ اسے بریانی اور شامی کباب بہت پسند آئے تھے۔ گو اس میں مسالے بہت زیادہ تھے پھر بھی اسے سب ذائقہ دار لگا۔ جہاں آرا کھانا کھاتے ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

’’میں قہوہ بنا رہی ہوں آنٹی!‘‘

’’نہیں‘ میرے سر میں درد ہے اور میں اب آرام کروں گی۔‘‘ قہوہ پی کر کرنل تاجدار بھی چلے گئے کیونکہ انہیں صبح سویرے ہی کھاریاں کے لیے روانہ ہونا تھا۔ نانو بھی تھک گئی تھیں وہ آرام کے لیے چلی گئیں تو وہ برتن سمیٹ کر لاؤنج میں آ گئی۔ عبدالعلی اور اسعد باتیں کر رہے تھے۔ وہ لنڈا کے پاس بیٹھ گئی۔ اسے لنڈا اچھی لگی تھی سادہ اور خوش اخلاق یہ اطالوی لڑکی بے حد خوبصورت تھی‘ اگر اسعد نے اسے پسند کر لیا تھا تو وہ تھی ہی ایسی پسند کیے جانے کے لائق۔

’’آپ کا اب کیا خیال ہے اسعد بھائی! یہیں سیٹل ہوں گے یا واپس نیویارک؟‘‘ اس نے اسعد کی طرف دیکھا۔

’’میرا ارادہ تو سیٹل ہونے کا تھا لیکن لنڈا نہیں مان رہی تاہم میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ کم از کم علینہ اور اسجد کی شادی تک رک جائے۔‘‘

علینہ اور عنیزہ کے رخسار اپنی شادی کے ذکر پر بیک وقت گل رنگ ہو گئے اور پلکیں جھک گئیں۔ لنڈا نے دلچسپی سے انہیں دیکھا۔

’’پاکستانی لڑکیاں بہت شرمیلی ہوتی ہیں۔‘‘ وہ بے ساختہ بولی تو عنیزہ مسکرا دی۔

’’تم یہاں کیوں نہیں رہنا چاہتی ہو لنڈا! ہمارا ملک بہت خوبصورت ہے۔‘‘

’’ہاں‘ لیکن مسلمان دہشت گرد ہوتے ہیں۔‘‘ لنڈا لگی لپٹی رکھنے کی عادی نہ تھی۔

’’ایک ایسے ملک میں جہاں دہشت گرد تیار ہوتے ہیں‘ انہیں تربیت دی جاتی ہو دہشت گردی کی‘ میں وہاں زندگی نہیں گزار سکتی۔‘‘

عبدالعلی کا رنگ سرخ ہوا اور اس کی آنکھوں میں اضطراب کی لہریں سی اٹھیں۔ اس نے بمشکل اپنے لہجے کو نرم رکھنے کی کوشش کی۔

’’بغیر ثبوت کے کسی بھی بات پر یقین کر لینا صحیح نہیں ہے۔ نہ مسلمان دہشت گرد ہیں اور نہ کبھی تھے۔ یہ پروپیگنڈہ ہے۔‘‘

’’مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔‘‘ لنڈا کی نیلی آنکھوں میں سرد مہری تھی۔

’’میرا بھائی ان ہی دہشت گردوں کے ایک فدائی حملے میں مارا گیا۔ سب نے کتنا منع کیا تھا اسے کہ وہ عراق جانے سے انکار کر دے لیکن اس کا نام اس بریگیڈ میں آ گیا تھا جو امریکہ کے اتحادیوں کی صورت میں بغداد بھیجا جا رہا تھا اور وہ خود بھی جانا چاہتا تھا کیونکہ وہ ایک خوبصورت گھر خریدنا چاہتا تھا‘ اسے دنیا دیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن......‘‘

اس کی آنکھوں کی سرد مہری میں ہلکی سی نمی نظر آئی۔ ’’لیکن فلوجہ میں ایک خودکش حملے میں۔۔۔۔۔۔۔ اس کی بیوی اور بچے انتظار کرتے رہے۔‘‘

اس نے پلکیں جھپک کر اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کی کوشش کی۔ عنیزہ نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے تسلی دی۔

’’مجھے آپ کے بھائی کا افسوس ہے۔‘‘

عبدالعلی بولا تو اس کی آواز ہلکی لیکن مضبوط تھی۔

’’لیکن اس کے باوجود میں کہوں گا‘ وہ عراقی جس نے اپنے سینے پر بم باندھ رکھا تھا وہ دہشت گرد نہیں بلکہ مظلوم تھا۔ دہشت گرد کون ہے لنڈا بھابی؟ افغانستان کے وہ سینکڑوں‘ ہزاروں لوگ جن پر موت مسلط کی گئی یا وہ جنہوں نے افغانستان میں ظلم کی انتہا کر دی۔ وہ جنہوں نے کوسوو‘ چیچنیا اور بوسنیا میں لاشوں کے انبار لگا دیے۔ یا وہ جنہوں نے محض تیل پر قبضہ کرنے کے لیے پہلے عراقی عوام کو خوراک اور دوائیوں سے محروم کیا‘ پھر انہیں ایک آمر سے نجات دلانے کے لیے قتل و خونریزی کا بازار گرم کر دیا۔ اصل دہشت گرد کون ہے۔ بی بی! اس کا فیصلہ تو تاریخ کرے گی بلکہ کر چکی ہے لیکن ہم سچ کو جھٹلا رہے ہیں دفاعی حملے دہشت گردی ہیں یا جہاد‘ میں اس پر بحث نہیں کرتا لیکن یہ جو عراق میں ہو رہا ہے یہ کیا ہے؟ کل رات فلوجہ اور باقوبہ میں امریکیوں نے جو ۲۴ عراقیوں کو شہید کر دیا وہ کیا ہے؟ حماس کے لیڈر احمد یاسین کو میزائل مار کر شہید کر دیا وہ کیا ہے؟ یہ ہے کھلی دہشت گردی‘ لنڈا بھابی! اور یہ آج سے نہیں ہے فلسطینی اسی سال سے اس دہشت گردی کا شکار ہو رہے ہیں۔ خود تمہارا اپنا مورخ ریمانڈ وڑیل لکھتا ہے۔ ۱۴ جولائی ۱۰۹۴ میں جب ہمارے آدمی برجوں اور دیواروں پر قابض ہوئے تو ہیکل سلیمانی میں مسلمانوں کی لاشیں خون میں لت پت تھیں۔ بیت المقدس کے رستے میں ہر جگہ مسلمانوں کے کٹے ہوئے سر تھے۔

افغانستان میں ہونے والے مظالم کی فلم بنانے والا جمی مسلمان نہیں تھا۔ لنڈا

بھابی! یہ فدائی حملے بے بسی کی، مظلومیت کی انتہا ہیں۔ دہشت گردی یہ ہے کہ عراق میں چن چن کر سائنس دانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے۔ سینکڑوں مارے جا چکے ہیں۔ بغداد یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد البرادی اور کئی دوسرے جب الجزیرہ ٹی وی پر عبداللطیف مایہ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ اسکالرز اور سائنس دان خاص حدف ہیں تو انہیں بھی مار دیا گیا۔

کیا یہ دہشت گردی نہیں ہے؟''

عبدالعلی نے ایک نظر لنڈا پر ڈالی۔

''اور لنڈا بھابی!'' عبدالعلی کی آواز بھرا گئی۔

''کل میں نے ایک غیر ملکی اخبار کی کٹنگ دیکھی، جس میں لکھا تھا عراقی اپنے سائنس دانوں اور سکالرز کو اپنے گھروں میں چھپا کر رکھتے ہیں اور اتحادی فوجوں کی آمد پر بھگا دیتے ہیں وہ کہتے ہیں۔ ہم لڑ رہے ہیں۔ شہید ہوں گے یا فتح یاب لیکن ایک روز آزادی کی تحریر لکھی جائے گی۔ تب تم واپس آ جانا۔ ہمارا خون اس گلستان کو آزاد کروانے کے لیے ضروری ہے اور تمہارا آباد کرنے کے لیے۔''

عبدالعلی کو لگا جیسے بہت سارے آنسوؤں نے اس کے حلق میں کڑواہٹ سی گھول دی ہو۔ وہ یکدم خاموش ہو گیا تھا۔ لنڈا سر جھکائے بیٹھی تھی۔

''ہم نے افغانستان جنگ پر احتجاج کیا۔ جلوس نکالے۔'' اس کی نیلی آنکھوں میں اب سرد مہری کے بجائے تاسف تھا۔

''ہاں، ہم اس کے لیے آپ کے شکرگزار ہیں۔'' عبدالعلی نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن اس کے باوجود کابل و قندھار میں خون ناحق بہتا رہا۔ لاشے تڑپتے رہے۔ بستیاں راکھ ہوتی رہیں اور اب عراق مین گاؤں کے گاؤں مردوں سے خالی ہو گئے ہیں۔ اپنے آپ کو عراقی عوام کا دوست کہنے والے امریکہ نے پورے عراق کو بقول عادل علامی گوانٹا موکیمپ بنا دیا ہے اور عبدالباری اتوان نے اپنے اخبار میں تب ہی تو لکھا ہے کہ نجات دہندہ آمروں سے زیادہ برے ہیں۔''

آپ کو کیا خبر لنڈا بھابی! عراق کی صبحیں اور شامیں بین کرتی ہیں، روتی ہیں۔ مجھے آپ کے بھائی کا سچ مچ بہت افسوس ہے، لیکن آپ بھی تو' آپ بھی تو ہمارے سینوں کے چاک دیکھیں ہمارے دل کے لہو پر نظر ڈالیں۔ ہمارے لخت لخت وجود پر مرہم

رکھیں۔'' اس نے تھک کر سر جھکا لیا۔ لنڈا سمیت سب خاموش بیٹھے تھے۔

صبح بغداد رو رہی ہے
کہ کیا ہوئیں وہ ساری گلیاں
کیا ہوئی روشنی وہ میری
وہ مسجدیں جن میں کل تک
جو سر جھکے تھے
وہ اب نہیں ہیں
نہ کوئی آواز آ رہی ہے
نہ کوئی ہنستا نہ بولتا ہے
ہر اک طرف آگ کے الاؤ
نہ کوئی گل ہے
نہ تتلیوں کی کوئی خبر ہے

''عبدالعلی بھائی!'' علینہ کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

''ایسی دکھی اور خوفناک باتیں نہ کیا کریں۔'' اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا وہ تھی بھی تو بہت نازک اور کمزور دل۔

عبدالعلی نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں شدت جذبات سے سرخ ہو رہی تھیں۔

''سوری۔'' لنڈا نے معذرت کی۔

''لیکن اس کے باوجود میں پاکستان میں سیٹل نہیں ہو سکتی۔''

''یہ الگ بات ہے۔'' عبدالعلی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''مما بہت ہرٹ ہوں گی۔'' اسعد نے لنڈا کی طرف دیکھا۔

''وہ پہلے ہی مجھ سے خفا ہیں۔ انہیں منانا تمہارا کام ہے اسعد! جو کچھ عبدالعلی نے کہا میں اسے مان بھی لوں کہ مسلمان دہشت گرد نہیں، پھر بھی میں یہاں نہیں رہ سکتی پلیز اسعد! میں تمہارے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔ مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔''

''او کے، او کے۔'' اسعد نے اسے تسلی دی۔

''اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔''

''کیا اسجد کا کوئی فون آیا؟'' عبدالعلی نے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''ہاں کل شام پپا نے نانو سے بات کر کے اسے فون کیا تھا بہت ایکسائٹڈ ہو رہا تھا۔''

''A beutifull Couple'' لنڈا مسکرائی اور عنیزہ کی طرف دیکھا۔

''چائے؟'' عنیزہ نے پوچھا۔

''کافی۔''

اسعد بے حد تھکن محسوس کر رہا تھا۔ عبدالعلی کی گفتگو نے ذہن و دل کو بوجھل کر دیا تھا۔

عنیزہ کافی بنا لائی تھی۔ کافی پیتے ہوئے اسعد اور عبدالعلی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے لیکن ماحول کا بوجھ پن کم نہ ہوا تھا' سب ہی اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے۔ کافی پی کر اسعد اٹھ کھڑا ہوا۔

''میرا خیال ہے اب سویا جائے۔''

عبدالعلی کو بھی صبح کراچی جانا تھا اور وہاں سے پھر حیدر آباد وغیرہ جانے کا پروگرام تھا۔ مختلف این جی اوز کے سلسلے میں اکٹھا کیے جانے والے مواد کے سلسلے میں۔

وہ عنیزہ کو صبح جلدی اٹھانے کی تاکید کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ لنڈا' اسعد اور علینہ بھی نیچے جا چکے تھے۔ عنیزہ بھی کچن کا دروازہ بند کر کے ٹی وی لاؤنج میں آئی تو ٹیبل پر پڑے اس کے موبائل کی بیل ہوئی اس نے نمبر دیکھا دوسری طرف اسجد تھا۔

وہ وہیں صوفے پر ٹک گئی۔

''بے وفا لڑکی کیسی ہو؟''

''میں بے وفا نہیں ہوں۔'' عنیزہ نے برا سا منہ بنایا۔

''اچھا کس حد تک وفا کی قائل ہو؟'' دوسری طرف اسجد غالباً مسکرایا تھا۔

''میں اس وقت سونے جا رہی ہوں'' عنیزہ نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

''عینی...... مجھے صبح پپا نے فون کیا تھا۔'' اس کی آواز یکدم بوجھل ہو گئی تھی۔

''میں کوشش کروں گا اس روز آنے کی تاکہ تمہیں اپنے ہاتھ سے انگوٹھی پہنا سکوں

میں نے کہا تھا نا کہ ہم ساتھ نبھانے والے لوگ ہیں۔ ویسے تم بھی خوش ہو نا؟''

''ناخوشی والی کیا بات ہے اس میں۔''

''ظاہر ہے ما بدولت کیپٹن اسجد کے ساتھ میں ناخوشی والی بات تو نہیں ہو سکتی۔ لیکن یار! اس چھوٹے سے ذومعنی جملے سے دل کی تشنگی نہیں مٹ سکتی کچھ اور کہو نا۔''

''مثلاً کیا کہوں؟'' عنیزہ نے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ آئی لو یو اسجد۔'' اسجد کا لہجہ شرارتی ہو گیا۔

''کہہ دوں گی۔''

''کب؟''

''جب تم آؤ گے۔''

''اپنا وعدہ یاد رکھنا۔''

اسجد نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا اور دھیرے سے گنگنایا۔

''آنکھ تو سیر ہو چلی دل وہی تشنہ کام ہے۔''

''اللہ حافظ۔'' عنیزہ نے فون رکھ دیا۔

اس سے اسجد سے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا' لیکن اسے اسجد کا فون کرنا اچھا بھی لگا تھا۔ شاید وہ اس کے فون کی منتظر بھی تھی۔ موبائل چارج کرنے کے لیے لگا کر لائٹ آف کر کے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ نانو سو چکی تھیں۔ وہ اپنے بیڈ پر لیٹ گئی لیکن سماعتوں میں اسجد کی بھاری آواز گونج رہی تھی اور دل جیسے وجود کے ہر حصے میں دھڑک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کل شام مغرب کے وقت مسجد کے قریب ایک بم دھماکہ ہوا جس میں مسجد میں نماز پڑھنے والے کئی نمازیوں کے ساتھ ایک ننھا بچہ اور ایک بوڑھی عورت جو مسجد کے پاس سے گزر رہی تھی ہلاک ہو گئی تھی۔ عبدالعلی کے سامنے اخبار کھلا ہوا تھا' جو کچھ دیر پہلے ہی ویٹر ناشتے کی ٹرے کے ساتھ دے گیا تھا۔

نچلے ہونٹ کو سختی سے دانتوں تلے دبائے وہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ سامنے اخبار میں ایک ننھے بچے کی تصویر تھی وہ سڑک پر یوں گرا ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ شاید وہ ماں سے پیسے لے کر خوشی خوشی کچھ خریدنے نکلا ہو؟ شاید وہ اپنی ماں

کا اکلوتا بیٹا ہو؟ لیکن۔

لوریاں سننے والا
دھماکوں کی آواز سن کر
لہو کی گلابی ردا اوڑھ کر سو گیا
نفرتوں کو حدف دیکھ لینے کی مہلت نہ تھی
غضب کا نشانہ ضروری نہیں
اور وہ جو کچے گھروندے کا مہتاب پارہ تھا
شب کا مقدر لکھا جا چکا

عبدالعلی نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اسے کراچی آئے چھ سات دن ہو گئے تھے اور ان چھ سات دنوں میں دو دھماکے' اتنی جانوں کا نقصان' کراچی میں ایک بار پھر خوف و ہراس کی فضا پھیلی تھی۔ چند سال پہلے جب وہ کراچی آیا تھا تب بھی لوگ ویسے ہی سہمے ہوئے اور خوفزدہ تھے اور ابھی کچھ زیادہ دن تو نہیں ہوئے تھے جب کراچی میں ایک بار پھر زندگی کے رنگ دکھائی دینے شروع ہوئے تھے۔ ویران ساحل نے ایک بار پھر رونق دیکھنی شروع کی تھی اور کیا یہ فرقہ واریت ہے؟

نہیں' ہرگز نہیں۔

یہ کھلی دہشت گردی ہے اور اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے صاف ظاہر ہے۔

کون امت مسلمہ کا دشمن ہے؟ کس نے شیخ احمد یاسین کو قتل کروایا؟

وہی ہاتھ جنہوں نے مفتی نظام الدین شامزئی کو مروایا' جنہوں نے مسجد میں نماز پڑھتے بے گناہ نمازیوں کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نے ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتاری۔ تب ہی موبائل کی بپ ہوئی۔ اس نے موبائل اٹھایا۔ دوسری طرف فرح تھی۔

''کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں' تم بتاؤ کب آ رہے ہو؟''

''شاید کل تک۔''

''رات دھماکے کی خبر سن کر میں تمہارے لیے بہت پریشان ہو گئی تھی۔ کتنی بار

ٹرائی کیا مگر تمہارا موبائل آف تھا۔''

''میں کل ہی حیدرآباد سے واپس آیا ہوں۔ بہت تھکا ہوا تھا اور آتے ہی سو گیا تھا اس لیے موبائل آف کر دیا تھا۔

''تمہارا کام ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''تقریباً۔''

''تو پھر وہاں کیا کر رہے ہو علی! پلیز جلدی آ جاؤ۔ سچ یہاں آفس میں بہت بوریت ہے۔ محبّ اللہ ابھی تک واپس نہیں آیا...... عادلہ بھی نہیں آ رہی۔ اس کے آفس میں آڈٹ ہو رہا ہے اور چوہدری عظمت اللہ مصلحت کے شیرے میں لپیٹ کر آرٹیکل اور کالم لکھ رہا ہے۔ بابا کرماں والا ابھی بہت اداس ہے۔''

''اور تم۔'' عبدالعلی کی آنکھوں میں شرارت ابھری۔

''میں بھی ظاہر ہے بہت اداس ہوں۔''

''میرے لیے فرح!''

''ہاں' تمہارے لیے۔''

فرح کوئی بات دل میں رکھنے کی عادی نہ تھی جب اس نے اپنے دل میں عبدالعلی کے لیے ایک الگ سا جذبہ محسوس کیا تو سیدھی اس کی ٹیبل پر آ گئی۔

''علی! ابھی ابھی کچھ دیر پہلے مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ یہ عجیب بات ہے نا۔''

وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ عبدالعلی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ایک بات جسے کہنے کے لیے وہ ایک ہفتے سے سوچ رہا تھا۔ وہ اس نے کتنی آسانی سے کہہ دی تھی حالانکہ وہ لڑکی تھی۔

''فرح! تم ہر بات کتنے آرام سے کہہ دیتی ہو۔''

''دراصل مجھے آنے والے کل کا بھروسہ نہیں۔ کیا خبر کل کیا ہو سو میں جب ذہن میں کچھ آئے کر گزرتی ہوں تم بتاؤ تمہیں یہ عجیب نہیں لگا؟''

''نہیں' اس لیے کچھ دنوں سے مجھے بھی یوں ہی لگ رہا تھا کہ تم ہی وہ خاص لڑکی

ہو جس کے انتظار میں دل نے ابھی تک کسی کی پذیرائی نہیں کی تھی۔"

"اور اگر میں تم سے نہ کہتی تو تم۔"

"ہاں شاید میں اس کا حوصلہ نہ کر پاتا۔"

اس نے اعتراف کیا۔ گو اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن بیتے ہوئے سارے دنوں میں جب سے وہ فرح کے گھر سے ہو کر آیا تھا وہ فرح کا بے حد خیال رکھنے لگا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ طنزیہ سی مسکراہٹ جو کبھی کبھی اس کے ہونٹوں پر آجاتی تھی، اب نہیں آئی تھی اس کے بجائے وہ دل ہی دل میں نادم ہو جاتا جبکہ فرح ویسی ہی تھی۔ کبھی عظمت اللہ کو تنگ کرتی، کبھی بابا کرماں والے کے پاس بے تکلفی سے بیٹھی گپ شپ کرتی۔ شیخ صاحب اور عظمت اللہ کے ساتھ اس کی خوب ٹھنتی تھی اسے اندازہ نہیں تھا کہ چند دنوں میں ہی وہ محبت کی اس منزل پر آجائے گا کہ فرح سے جدائی کا خیال ہی روح کو جکڑنے لگے گا۔

"ہیلو، کیا سو گئے؟"

"نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں نانو کو تمہارے گھر بھیجوں تو کیا ہوگا۔"

"کچھ نہیں؟" فرح دوسری طرف ہنسی۔

"وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔"

"فرح! میں سنجیدہ ہوں۔ تمہاری مما کبھی نہیں مانیں گی۔ اس روز وہ جس اسجد کا ذکر کر رہی تھیں وہ میرا کزن ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" دوسری طرف اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"لیکن تم نے ذکر تو نہیں کیا۔" عبدالعلی کو حیرت ہوئی۔

"بہت گہری ہو۔"

"شاید۔" وہ ہنسی۔

"مجھے عادلہ نے بتایا تھا عنیزہ ہے نا اس کی دوست بلکہ عادلہ نے خود پوچھا تھا مجھ سے کہ کیا اسجد نام کے کسی لڑکے کا پرپوزل آیا ہے تمہارے لیے؟"

"اوہ۔" عبدالعلی نے ایک گہری سانس لی۔

"تو میں نانو سے بات کروں؟"

"تم آجاؤ تو اس موضوع پر بات کریں گے۔"

"کیا تمہاری مما مان جائیں گی؟"

"ان کے ماننے نہ ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے عبدالعلی۔ میں تو مان جاؤں گی نا۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"فرح! مجھے بہت ڈر لگتا ہے بچھڑ جانے سے۔ میں بچپن میں بہت پیارے رشتوں سے بچھڑ گیا تھا۔ آج تک یہ خوف میری رگوں کو کاٹتا ہے۔"

"علی!" فرح سنجیدہ ہوگئی۔

"ہر شخص کو اپنے پیارے رشتوں سے کبھی نہ کبھی بچھڑنا ہوتا ہے۔ یہ ہی قانون قدرت ہے۔ میں بھی شاید کسی روز تم سے بچھڑ جاؤں۔"

"فرح! اچھی بات نہیں کر سکتی ہو تو مت کرو کوئی بات۔" عبدالعلی کو غصہ آگیا۔

فرح کی آواز بھاری تھی۔ اس نے ایک دم ہی فون رکھ دیا عبدالعلی کچھ دیر ساکت ریسیور تھامے بیٹھا رہا۔

اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔

عبدالعلی اٹھا اور ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزیں اکٹھا کرنے لگا۔ گو اس کا ارادہ مزید ایک روز رکنے کا تھا لیکن اب یکا یک ہی دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ سو اس نے آج ہی واپس جانے کا پروگرام بنالیا۔ اپنا سامان بریف کیس میں رکھتے ہوئے وہ مسلسل فرح کے متعلق سوچ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"محب یار! یہ کیا کیا تو نے؟ کیوں کیا؟ بغیر ملے چل دیئے۔ کوئی اس طرح بھی کرتا ہے اپنے پیاروں سے۔" عبدالعلی سرخ انگارہ آنکھوں سے محب اللہ خان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور چہرہ پرسکون تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ سب بڑی مشکلوں سے یہاں پہنچے تھے۔ وہ فرح، چوہدری عظمت اللہ، مجاہد حسین، مدنی صاحب۔ آج صبح ہی تو انہیں مجاہد حسین کے رپورٹر دوست نے محب اللہ کی موت کی اطلاع دی تھی اور جب وہ یہاں پہنچے تھے تو اس کا جنازہ تیار تھا۔

"کل کی فائرنگ میں زخمی ہو گیا تھا۔" انہیں بتایا گیا۔ "اور......"

"یار کوئی اس طرح بھی کرتا ہے اور ایسے۔۔۔۔۔۔۔" عبدالعلی نے جھک کر۔

اس کی پیشانی چوم لی۔

''ابھی تو مجھے تم سے بہت ساری باتیں کرنا تھیں یار!! اور تمہیں اپنے دل کے راز سے آگاہ کرنا تھا میں تو تمہارا منتظر تھا کہ تم آؤ اور میں تمہیں فرح کے متعلق بتاؤں۔ میں نے بھلا آج تک تم سے کوئی بات چھپائی تھی اور تم نے اتنے لمبے سفر پر جاتے ہوئے اللہ حافظ تک نہیں کہا یار۔''

عبدالعلی ضبط کیے کھڑا سرخ چہرے کے ساتھ اپنے مخلص رفیق کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایف اے سے اکٹھے تھے۔ کتنی طویل رفاقت لمحوں میں ٹوٹ گئی تھی۔

آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں میں مچل اٹھے تھے۔

''جنازہ اٹھاؤ۔'' کسی نے کہا۔

''نہیں' اخبار والے آئے ہیں۔ کچھ دیر رک جاؤ۔ دوست ہیں اس کے۔'' وہ سب اس کی چارپائی کے گرد کھڑے تھے۔ تھکے ہارے نڈھال سے۔ اسے کراچی سے آئے دوسرا دن تھا۔ جب محبّ اللہ خان کا فون آیا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا محبّ! تم آ کیوں نہیں رہے' اتنے دن لگا دیے؟''

''ابوحذیفہ مارا گیا اور میری ماں بھی۔'' اس کی آواز پھٹ رہی تھی۔

''وہ ہمارا کوئی نہ تھا لیکن سب کچھ تھا۔ وہ دہشت گرد ہرگز نہیں تھا مگر پھر بھی مارا گیا اور میری بہن بیوہ ہوگئی۔ اس کا بچہ یتیم ہوگیا عبدالعلی!''

اور عبدالعلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے' کن الفاظ میں اسے تسلی دے۔

چوہدری عظمت اللہ نے تبصرہ کیا تھا لیکن عبدالعلی کا سارا دن اداس رہا تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں کچھ دنوں کے لیے جنوبی وزیرستان چلا جاؤں'' اس روز اس نے فرح سے کہا تھا۔

''نہیں عبدالعلی! تم اب کہیں نہیں جاؤ گے۔'' فرح کے لہجے میں جانے کیا تھا کہ اس نے چونک کر فرح کو دیکھا تھا۔

''علی!'' فرح نے نظریں چرالی تھیں۔

''میرا جی چاہتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ میں زندگی کے بچے کھچے سارے لمحے اب تمہارے ساتھ گزاروں۔''

''تم نے ابھی بہت سارے لمحے میرے ساتھ گزارنے ہیں فرح اور یہ اس طرح کی فضول باتیں مت کیا کرو۔''

''تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''ان حالات میں میرا جانا بھی مشکل ہوگا اور تم کہاں' پھر تمہاری مما......''

''میری مما'' وہ عجب طرح سے ہنسی۔

''وہ تو خود آج کل امریکہ گئی ہوئی ہیں۔''

اور ابھی وہ پروگرام سیٹ ہی کر رہا تھا کہ وانا سے یہ اطلاع آ گئی۔

''محبّ! کیوں ہوا تمہارے ساتھ ایسا۔ تم تو بہت سچے پاکستانی تھے محبّ۔ میرے دوست ہم کسے الزام دیں۔''

''جنازہ اٹھاؤ دیر ہو رہی ہے۔'' کسی نے کہا تو وہ پیچھے ہٹ گیا۔

''کبھی کبھی جو کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔''

چوہدری عظمت اللہ نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تو اس نے چونک کر عظمت اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں وہ رو رہا تھا۔

فرح روتی ہوئی آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ بالکل اس کے ساتھ کھڑی تھی۔

''فرح۔'' اس نے بے بسی سے فرح کی طرف دیکھا۔

''یہ محبّ...... یہ ظالم مجھے بہت پیارا تھا فرح!'' فرح نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے یوں فرح کے ہاتھ تھامنے سے بڑا سہارا ملا۔ نہیں تو اسے لگ رہا تھا جیسے اس کا دل ڈوب جائے گا۔

''فرح میرا ہاتھ نہ چھوڑنا......نہیں تو''

''حوصلہ کرو علی!''

وہ سب رو رہے تھے۔ مجاہد حسین، چوہدری عظمت اللہ، مدنی صاحب، وہ صرف سال بھر سے ان کے ساتھ تھا جبکہ اس کا اور محبّ کا ساتھ تو بہت پرانا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں وہ رونا چاہ رہا تھا لیکن اس کے آنسو نہ جانے کہاں تھے۔

واپسی کے سفر میں وہ سب پہلے سے زیادہ نڈھال اور تھکے ہوئے تھے۔ وہ سب

فرح کی لینڈ کروزر میں آئے تھے۔

فرح کا یہ ڈرائیور اسی علاقے کا تھا۔ وہاں سے نکلتے ہوئے انہوں نے گولیوں کی آوازیں سنی تھیں۔

''اب ہم کبھی محبت کو نہ دیکھ سکیں گے۔ محبت جو کہتا تھا'' یارا! ہم جس کو ایک بار دوست کہہ دیں اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔'' مجاہد حسین نے دکھ سے کہا۔ وہ راستے بھر محبت کی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتے رہے۔ عبدالعلی خاموش بیٹھا رہا۔ فرح گاہے بگاہے اسے دیکھتی رہی۔

''علی! تم رونا چاہ رہے ہو تو رو لو۔ اس طرح آنسو پینے سے وہ زہر بن جائیں گے۔'' فرح نے اس سے کہا۔

''ہاں میں رونا چاہتا ہوں فرح! اپنے دوست کے بچھڑنے پر۔ لیکن میرے آنسو پتا نہیں کہاں کھو گئے ہیں۔'' پھر فرح ہولے ہولے محبت اللہ کی باتیں کرنے لگی۔ گو اس نے بہت کم وقت اس کے ساتھ گزارا تھا پھر بھی وہ سوچ سوچ کر بولتی رہی اور عبدالعلی کو پتا بھی نہ چلا کہ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگتے رہے۔

وہ سب افسردہ اور تھکے ہوئے تھے۔ سب کو ان کے گھروں کے پاس اتار کر فرح آخر میں جب عبدالعلی کے گھر پہنچی تو دور سے ہی گھر کے سامنے کھڑی گاڑیاں۔۔۔۔۔ گاڑیوں کے باہر کھڑے ڈرائیور۔۔۔۔ عبدالعلی کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔

''فرح! یہ سب لوگ میرے گھر کے سامنے کیوں ہیں؟''

''شاید نانو...... ہاں ان کی طبیعت خراب تھی۔''

''علی! پلیز حوصلہ کرو۔''

فرح خود بھی پریشان ہو رہی تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ علی کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ وہ کھلے گیٹ سے اندر بھاگتا چلا گیا۔ فرح اس کے پیچھے تھی۔ اندر لاؤنج میں عورتوں کا ہجوم تھا' ڈرائنگ روم' لونگ روم' لان سب بھرے ہوئے تھے۔ سب سے پہلے علینہ نے اسے دیکھا اور بھاگ کر اس کے پاس آئی اس کا چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں دوپٹا گلے میں لٹک رہا تھا۔

''علی بھائی!...... وہ اسجد...... اسجد۔''

''نہیں۔'' عبدالعلی چیخا۔

''نہیں' مت کہو ایسا۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسے وانا بھیجا گیا تھا چند روز قبل اور۔۔۔۔۔

''راستے میں ایک چائے خانے میں وہ چائے پینے کے لیے رکے تھے اور وہاں ٹی وی پر انہوں نے اس آپریشن کے انچارج کو سپاٹ چہرے کے ساتھ بتاتے سنا تھا۔

''جنگجوؤں کے ساتھ جھڑپ میں سیکورٹی فورسز کے چند افسروں سمیت چھ آرمی کے جوان کام آ گئے۔

''تو کیا۔۔۔۔۔۔۔ تو کیا ان چھ جوانوں میں اسجد بھی تھا وہ بے حسی سے اسکرین پر نظریں جمائے یہ سن رہا تھا اس سے بے خبر کہ ان چھ بندوں میں اسجد بھی ہے۔

اسجد جو اس کا کزن ہی نہیں دوست بھی تھا۔

اور پھر اسے عنیزہ کا خیال آیا۔

عنیزہ جس کے نام کے ساتھ چند دن پہلے ہی اسجد کا نام لگا تھا اور عنیزہ کتنی خوش تھی جب اس نے عنیزہ سے پوچھا تھا۔

''عینی! نانو اور ماموں جان تمہارے لیے جو سوچ رہے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے اس کے متعلق۔ تم خوش ہو نا؟'' اور اس کی پلکیں جھک گئی تھیں۔

''نانو نے میرے لیے بہتر ہی سوچا ہو گا بھائی۔''

خوشی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی اور کتنی مختصر عمر تھی اس خوشی کی، ابھی تو اس نے اپنے ہاتھ میں اسجد کے نام کی انگوٹھی بھی نہ پہنی تھی۔ اسجد کی ضد تھی کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے انگوٹھی پہنائے گا اس لیے منگنی کی تقریب کچھ لیٹ ہو گئی تھی۔ علینہ کے گرد بازو رکھے اس نے عنیزہ کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ ایک جگہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ علینہ کا ہاتھ پکڑے ہولے ہولے چلتا ہوا عنیزہ کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''عینی۔'' اس نے اس کا سرد ہاتھ پکڑا۔

وہ سپاٹ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''کیا ہمیشہ ہم سے ہمارے اپنے بچھڑتے رہیں گے۔ پہلے ماپاپا پھر محبت اور اب اسجد۔''

''عینی۔'' اس نے کھینچ کر اسے گلے لگایا اور اس کے ماتھے پر پیار کیا۔ لیکن عنیزہ یوں ہی ساکت بیٹھی رہی۔

''یہ تب سے ایسی ہی ہے علی بھائی! ۔۔۔۔'' علینہ نے بتایا۔

''عینی' عینی تم روتی کیوں نہیں ہو اسجد چلا گیا۔'' عبدالعلی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

''نہیں' اسجد نے بھلا کہاں جانا ہے۔ وہ تو کہتا تھا ہم ساتھ نبھانے والے ہیں۔'' اس نے عبدالعلی کو دیکھتے ہوئے سوچا'' اور ابھی تو مجھے اسے بتانا تھا کہ میں' ہاں میں' اس نے کہا تھا کوئی ایک لفظ جو دل و جان کی پیاس بجھا دے۔ میرے پاس بہت لفظ ہیں۔''

''علی! علی! دیکھو وہ چلا گیا وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا''۔ جہاں آرا نے اسے دیکھ لیا تھا۔

ان کی آواز بیٹھ گئی تھی لیکن وہ بول رہی تھیں۔

''وہ کہتا تھا' مما! آپ جب تک خوشی سے میری منگنی کی تقریب میں شریک نہیں ہوں گی۔ میں نہیں آؤں گا۔ میں آپ کو ناراض کر کے کچھ نہیں کروں گا لیکن میں گھر نہیں آؤں گا علی! تم اسے بتا دو' جا کر کہہ دو میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ میں بڑی خوشی سے اور تم اکیلے کیوں چلے آئے تم اسے لینے نہیں گئے تھے۔ اسعد کہاں ہے۔ اس نے کہا تھا میں جا رہا ہوں اسے لینے۔ وہ اکیلا چلا گیا۔ تم اس کے ساتھ کیوں نہیں گئے۔''

عبدالعلی نے بمشکل ضبط کیا۔ وہ دو راتوں سے جاگ رہا تھا۔ اس کے اعصاب شل ہو رہے تھے۔ وہ وہیں عنیزہ کے پاس اس کا ہاتھ تھامے بیٹھ گیا۔ ابھی تو محبت اللہ کی جدائی کے زخم سے خون رس رہا تھا۔

''علی! تم باہر جاؤ ماموں کے پاس۔ اس وقت انہیں تمہاری ضرورت ہے۔'' فرح نے آہستگی سے کہا۔

''میں یہاں ہوں نا عینی کے پاس۔'' وہ گیٹ پر اکیلے بیٹے کے استقبال کے لیے کھڑے ہیں علی جاؤ۔''

اور پھر وہ آ گیا تھا۔ فوجی اعزاز کے ساتھ تابوت میں بند۔ پھر وہ اسے اندر لے

آئے۔ تابوت کا ڈھکن اٹھا دیا گیا۔

''عینی! اٹھو اسجد کو دیکھ لو۔'' فرح نے اس سے آہستگی سے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ عنیزہ کو لگا وہ بند لبوں سے گنگنا رہا ہو۔

''آنکھ تو سیر ہو چلی' دل وہی تشنہ کام ہے۔''

''آئی لو یو آئی لو یو اسجد۔''

اس کے ہونٹ ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ فرح نے اسے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا اور عنیزہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

وہ پورے ایک ماہ سے آفس نہیں گیا تھا۔ شیخ صاحب نے کئی بار فون کیا تھا۔

''عبدالعلی! کچھ لکھو' لوگ تمہارے تجزیے پڑھنا چاہتے ہیں۔''

''کیا لکھوں؟'' وہ خود سے پوچھتا۔

محبّ اللہ خان کی موت کا نوحہ لکھوں یا اسجد کا؟

قاتل کون ہے اور مقتول کون؟ کس نے کس پر گولی چلائی۔ محبّ اللہ اور اس جیسے دوسرے' اسجد کے اور اس کے ساتھی' کون شہید کہلائے گا۔ کیا دونوں نے شہادت پائی؟ یا دونوں ہی ہلاک ہوئے۔

اس کا دل کہیں جانے کو' کچھ لکھنے کو نہ چاہتا تھا۔

فرح اکثر چلی آتی تھی' تھکی تھکی اور نڈھال سی۔ عینی خاموش تھی۔ جہاں آرا کبھی کبھی اونچی آواز میں رونے لگتیں۔۔۔۔۔۔ اور اگر اسجد دشمن کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوتا تو شہید کے ماں باپ ہونے کا فخر شاید اس دکھ کو کم کر دیتا' لیکن اب مارنے والے بھی اپنے تھے اور مرنے والے بھی۔ محبت اللہ خان دل تھا تو اسجد جان۔ مرنے والے اور مارنے والوں کی ذاتی دشمنی نہ تھی پھر بھی' پھر بھی بہت دنوں سے اس نے ٹی وی دیکھا تھا نہ اخبار۔ اپنے آپ میں گم وہ فرح کو بھی بھول گیا تھا۔

کتنے سارے دن ہو گئے تھے فرح سے بات کیے ہوئے شاید آٹھ دس دن۔ ورنہ وہ تو ہر روز فون کرتی تھی۔ دلاسا دیتی کبھی خود چلی آتی' کہیں وہ بیمار نہ ہو۔ اسے یکدم ہی فرح کا خیال آیا تھا۔

''ہاں، مجھے فون کرنا چاہیے اسے۔'' لیکن اس کا موبائل آف تھا۔ میں آفس جا رہا ہوں۔''

لاؤنج میں خاموش بیٹھی عینی کے پاس وہ کچھ دیر رکا تھا۔ وقت بہت بڑا مرہم ہے شاید ایک دن عینی کو بھی صبر آ جائے گا۔ اس نے عینی کے سر پر پیار کیا اور نانو کو خدا حافظ کہہ کر نیچے اتر آیا۔ نیچے خاموشی تھی۔

علینہ شاید یونیورسٹی چلی گئی تھی اور جہاں آرا اپنے کمرے میں تھیں۔ ان کے کمرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے ان کی سسکیاں سنائی دیں۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکا پھر آگے بڑھ گیا۔

آفس میں سب کچھ ویسا ہی تھا۔ بابا کرماں والے نے اسے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ اس کے کمرے میں صرف چوہدری عظمت اللہ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ محبّ اللہ خان کی ٹیبل خالی تھی۔ اس نے فرح کے کیبن میں جھانکا۔

فرح نہیں تھی۔

''وہ ایک ہفتے سے نہیں آ رہی، شاید بیمار ہے۔'' چوہدری عظمت اللہ نے بتایا۔

وہ خاموشی سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور دانستہ محبّ اللہ خان کی کرسی کی طرف نہیں دیکھا۔

''بابا کیسے ہیں؟''

''تمہارے لیے بہت اداس ہیں۔''

''اچھا، آؤں گا کسی روز۔'' اس نے اپنی دراز کھولی۔

بابا اکثر کہتے تھے۔

''میں ایک دقیانوسی آدمی ہوں۔ میں اپنے آقاؤں کی حکمت عملی کیا جانوں، میں نے تو ہر درد کو اپنے سینے میں پالا ہے۔ خواہ وہ افغانیوں کا درد ہو خواہ عراقیوں کا خواہ کشمیریوں کا۔''

اسے بابا بہت یاد آئے۔ اس نے سوچا وہ آج ضرور بابا سے ملنے جائے گا اور انہیں بتائے گا کہ اسجد چلا گیا۔

اسجد جسے فوج میں جانے کا بڑا شوق تھا، جو اکثر کہتا تھا کہ وہ شہادت کا درجہ پانا

چاہتا ہے اور پتا نہیں اب۔۔۔۔۔شاید بابا اس کی الجھن دور کر سکیں۔ شاید وہ بتا سکیں کہ اسجد شہید ہوا یا۔۔۔۔۔۔۔

وہ جو بڑے یقین سے اپنے کالموں میں لکھتا تھا۔ خودکش حملوں میں اپنے سینوں سے بم باندھ کر اپنی جان قربان کرنے والے فدائی شہید ہیں۔ وہ اسجد کے لیے متذبذب تھا۔ اس نے بغیر کچھ نکالے دراز بند کر دیا۔

''اور عادلہ کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے۔''

چوہدری عظمت قلم دانتوں میں دبائے اسے دیکھ رہا تھا۔ عادلہ تو اکثر عنیزہ کے پاس جاتی رہتی تھی۔

''ہاں اس بات کا کیا بنا؟''

اسے اچانک یاد آیا تھا جس روز محبّ اللہ خان کی اطلاع آئی تھی اس روز چوہدری عظمت نے کہا تھا۔ ''یار! عادلہ کو سمجھاؤ اتنا اچھا پروپوزل ہے لیکن خوامخواہ انکار کر رہی ہے۔ تم بات کرنا شاید تمہاری بات مان جائے۔''

''کچھ نہیں، عادلہ نہیں مانی تھی۔''

''ہاں یار! اس روز کے بعد بات ہی نہیں ہو سکی عادلہ سے۔ خیر اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔''

اس نے پھر دراز کھولی اور دوبارہ بند کر کے کھڑا ہو گیا۔

''شیخ صاحب آج نہیں آئے؟''

عظمت اللہ نے بتایا۔

''نہیں۔''

''میں گھر جا رہا ہوں۔'' ''کل آ جاؤں گا۔'' چوہدری عظمت نے سر ہلا دیا۔

وہ مجاہد حسین اور مدنی صاحب کو سلام کر کے باہر نکل آیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ فرح کے گھر میں تھا۔ فرح ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر دراز ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ خوفناک حد تک زرد ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''میں تمہیں بہت یاد کر رہی تھی علی! اچھا ہوا تم آ گئے۔ اتنے دن ہو گئے میں

تمہاری طرف نہیں آ سکی اور نہ ہی فون کر سکی۔ دراصل ماما بھی آ گئی تھیں نا اور انہوں نے مجھے اکیلا ہی نہیں چھوڑا' ایک منٹ کے لیے بھی نہیں' میں تمہیں فون بھی نہ کر سکی اور یہ کتنی حیرانی کی بات ہے' ہے نا۔ ماما کے پاس میرے لیے وقت ہی وقت ہے۔'' وہ ہنسی۔

عبدالعلی خاموش کھڑا اسے دیکھ رہا تھا اسے لگا جیسے کچھ انہونی سی ہونے والی ہے۔

''تم کھڑے کیوں ہو علی! یہاں بیٹھ جاؤ میرے سامنے۔''

''فرخ! تم بیمار ہو۔ تمہیں کیا ہوا ہے تمہارا رنگ اتنا زرد کیوں ہو رہا ہے؟ تم بہت کمزور ہو گئی ہو''۔ بہت مضطرب ہو کر اس نے پوچھا۔

''ہاں میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ تم بیٹھ جاؤ نا'' وہ بیٹھ گیا۔ فرح نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''نہیں فرح! تم لیٹی رہو۔ میں بھی اتنے سارے دن تمہیں فون نہ کر سکا کیا ہوا ہے تمہیں ٹمپریچر ہے؟'' فرح خاموش رہی۔

''تم نے اپنا دھیان نہیں رکھا ہو گا تب ہی اتنی کمزور ہو رہی ہو۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ آ کر معدوم ہو گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم آفس گئے تھے؟''

''ہاں' آج ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔''

''سب کیسے تھے؟''

''ٹھیک تھے۔''

''محب اللہ کی ٹیبل خالی تھی؟''

''ہاں۔'' عبدالعلی کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی۔

''لیکن ہمیشہ تو خالی نہیں رہے گی کل یا کسی روز کوئی اور اس کی جگہ لینے آ جائے گا۔''

''ہاں' کوئی نہ کوئی خالی جگہ کو پر کر دیتا ہے۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور عبدالعلی کی طرف دیکھا۔

''علی! تم جانتے ہو عادلہ تمہیں پسند کرتی ہے؟'' وہ خاموش رہا۔

''علی! تم عادلہ سے شادی کر لینا۔''

''فرح! تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟ یہ کیا فضول باتیں کر رہی ہو تم؟'' عبدالعلی نے ناراضگی سے اسے دیکھا۔

''تم جانتی ہو نا فرح! کہ میں۔۔۔۔ اگر اسجد یوں نہ چلا جاتا تو نانو......''

''ہاں اور میں نے بھی سوچا تھا کہ کچھ روز تمہاری رفاقت میں لیکن وقت ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے علی!''

اس نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

جس طرح میرا خواب ہے اس طرح تیرے ساتھ اک شام گزر جائے تو اک شام بہت ہے۔

''فرح! فرح یہ کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ جانتی ہو نا میں' میرا دل پہلے ہی......''

''علی! وعدہ کرو اپنا سارا وقت مجھے دو گے؟ یہ دن اور آنے والے دن میری زندگی کی آخری سانس تک میرے ساتھ رہو گے۔''

''تم جانتی ہو فرح! میرا ہر سانس تمہارے ساتھ کا متمنی ہے۔ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اپنے آخری سانس تک۔ پھر یہ بے اعتباری کیوں فرح؟''

''یہ بے اعتباری تم پر نہیں علی! خود پر اپنی زندگی پر ہے۔''

''فرح! میں پاگل ہو جاؤں گا۔'' عبدالعلی نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

''مجھے بلڈ کینسر ہے اور میرے پاس اب شاید بہت تھوڑا وقت رہ گیا ہے۔ ایک ہفتہ یا چند دن۔''

''نہیں۔'' عبدالعلی ساکت بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔

''نہیں۔''

اس کے لب پھر ہلے۔

''تم میرے ساتھ ایسا سنگین مذاق نہیں کر سکتیں فرح!''

''بہت پہلے ایک دن میں نے دعا مانگی تھی یا رب العالمین! مجھے بہت لمبی زندگی نہیں چاہیے۔ مجھے بس جلد اٹھا لینا دنیا سے اور شاید وہ کوئی لمحہ قبولیت تھا۔ ایک روز ایک زخمی

دوست کو بلڈ دینے گئی تو پتا چلا مجھے بلڈ کینسر ہے۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا اور پھر بتاتی بھی کسے۔ مما کے پاس میرے لیے وقت ہی کہاں تھا اور مجھے زندگی کی چاہ بھی کب تھی۔ علاج کے لیے میں پھر کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی۔ پھر مجھے تم مل گئے۔ تب دل نے زندہ رہنے کی چاہ کی' بہت چاہ کی عبدالعلی! لیکن تب دیر ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہاں کوئی معجزہ۔''

وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی اور علی کو جیسے کسی نے پتھر کا کر دیا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس کی کہی ہوئی باتیں' ہر کام کرنے کی جلدی۔

''علی۔۔۔۔۔۔'' عادلہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وعدہ کرو میرے بعد اس سے شادی کر لو گے۔ پلیز' میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا۔''

عبدالعلی کا سر اثبات میں ہل گیا' لیکن وہ خاموشی سے فرح کو دیکھ رہا تھا۔

''اس طرح مت دیکھو علی!''

فرح کے آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

پھر اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

''علی! تم نے وعدہ کیا ہے نا صبح سے شام تک میرے ساتھ رہو گے۔ ہم خوب گھومیں گے علی!'' بانو بازار کی چاٹ کھائیں گے' میں آخری بار تمہارے ساتھ ہر اس جگہ جانا چاہتی ہوں جہاں جہاں میں نے تمہارے ساتھ جانے کی چاہ کی تھی۔''

''فرح! تم کتنی ظالم ہو کس قدر بے درد ہو۔''

عبدالعلی خاموشی سے ہونٹ کچل رہا تھا۔ ''ابھی محب اللہ کی جدائی کا زخم رستا ہے اسجد کا زخم تازہ ہے اور تم ایک اور گھاؤ لگانا چاہتی ہو۔'' تب ہی تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئیں بدر ہاشمی لاؤنج میں آئیں۔

''میں نے بات کی ہے ڈاکٹر ملک سے انٹرنیٹ پر پوری دنیا سے رابطہ کیا ہے انہوں نے' ساری رپورٹس ساری تفصیلات کے ساتھ......''

''کیا فائدہ مما!''

فرح کی آواز میں تھکن تھی۔ مسز بدر ہاشمی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔ عبدالعلی نے دیکھا ان کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔ وہ اس روز والی بدر ہاشمی سے بالکل

مختلف لگ رہی تھیں۔ پھر جیسے اچانک ہی ان کی نظر عبدالعلی پر پڑی۔

''مائی فرینڈ علی!''

''اوہ ہاں۔'' انہیں جیسے یاد آ گیا۔

''دیکھو' اس نے مجھے' اپنی ماں کو کچھ نہیں بتایا کچھ بھی نہیں۔ میں اسے دنیا کے ہر کونے میں لے جا سکتی تھی کہیں بھی کسی بھی جگہ لیکن اس نے اور اب' اب ڈاکٹر ملک کہتے ہیں کچھ نہیں ہو سکتا' کچھ بھی نہیں۔ بھلا کیوں کچھ نہیں ہو سکتا۔ دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کلوننگ کے کامیاب تجربے کر لیے اس نے اور کیا بدر ہاشمی کی بیٹی۔ اکلوتی بیٹی کروڑوں کی جائداد کی وارث کا علاج نہیں اس کے پاس' ضرور ہو گا۔ میں ابھی ڈاکٹر اعظم سے بات کرتی ہوں۔ یہ ڈاکٹر ملک تو بس۔''

وہ اٹھیں صوفے پر پڑے ہوئے ریموٹ کا والیم والا بٹن ان کے ہاتھ کے نیچے آ کر دب گیا اور سامنے لگے ٹی وی کی آواز بلند ہو گئی۔ عبدالعلی کی نظریں غیر ارادی طور پر ٹی وی کی طرف اٹھ گئیں۔ سکرین پر دھواں تھا آگ کے شعلے تھے' جلی ہوئی گاڑیوں کے ڈھانچے تھے اور نیوز کاسٹر بتا رہا تھا۔

''بصرہ میں گاڑیوں کے ایک قافلے کے پاس بم دھماکے' کئی گاڑیاں تباہ' تین اتحادی ہلاک' سات عراقی زخمی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خودکش حملہ تھا۔'' اور ایک ماہ میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

محب اللہ نہیں رہا تھا۔

اسجد چلا گیا تھا۔ لیکن اور کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کچھ بھی نہیں سب ویسا ہی تھا۔ وہی دھماکے' وہی خودکش حملے اور ان سب کے پیچھے وہی پرانی دانہ ودام کی کہانی۔ عقاب ننھے سے اک پرندے کے منہ سے دانہ چھین رہا ہے زمانہ' طاقت کے ناخداؤں کے اک اشارے پہ چل رہا ہے۔

نئی صدی کے بدن میں سرطان پل رہا ہے۔

''مما! پلیز کہیں مت جائیں! یہاں بیٹھیں میرے پاس۔'' فرح کی آنکھوں میں التجا تھی۔

مسز بدر ہاشمی نے چونک کر ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کیا۔ ٹی وی کی اسکرین

سادہ تھی۔ عبدالعلی' فرح کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں سکرین پر تھیں جو سادہ تھی لیکن علی اب بھی وہاں دھواں اٹھتا اور لوگوں کو بھاگتے' گاڑیوں کو جلتا دیکھ رہا تھا۔

''مما! میں نے ساری عمر آپ سے نفرت کرنے کی کوشش کی اور بظاہر نفرت کرتی رہی۔ لیکن آپ سے کبھی نفرت نہ کرسکی شاید ایک لمحہ بھی نہیں۔''

فرح رو رہی تھی۔

سامنے اسکرین پر جیسے چوہدری عظمت اللہ آ گیا تھا۔ ''میں امریکہ سے نفرت کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں کرسکتا۔

کیونکہ مجھے غربت سے نفرت ہے اور ڈالروں سے محبت ہے میں ہمیشہ امریکہ کا دوست رہنا چاہتا ہوں۔''

''میں نے آپ کی ذات سے ہمیشہ محبت کی ہاں آپ کے رویے سے' آپ کے طور طریقوں سے نفرت تھی مجھے۔''

''ہم انسانوں سے نفرت نہیں کرتے۔ ہمیں ڈکٹیٹروں سے' آمروں سے نفرت ہے۔ ہمیں انسانیت سوز سلوک کرنے والوں سے نفرت ہے۔''

سادہ سکرین پر ایک عراقی کا چہرہ تھا۔ جگہ جگہ سے اڑا ہوا۔ بم کے ٹکڑوں سے زخمی۔

''مما! میں نے موت کی چاہ کی تھی۔ صرف اس لیے کہ۔'' فرح کے آنسو روانی سے بہنے لگے تھے۔

''ہم نے سینوں پر بم باندھے کہ ہمیں آزادی کی خواہش ہے اور ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے' آزادی حاصل کرنے کا۔'' مسز بدر ہاشمی نے فرح کو دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔

''مائی چائلڈ' مائی پور چائلڈ' آئی لو یو۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی فرح! مائی ڈاٹر۔ میں تمہیں لے جاؤں گی۔ دنیا کے سب سے بڑے ڈاکٹروں کے پاس۔''

''ہم عراق وافغانستان میں تعمیر نو کریں گے۔ ہم سب کو سہولتیں دیں گے۔''

سکرین پر ایک اور چہرہ تھا۔ وعدے کرتا' امیدیں دلاتا۔

''ہم نئے ہسپتال بنائیں گے' نئے اسکول قائم کریں گے۔''

''مما۔'' آنسو پونچھ کر فرح سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''نہیں مما! مجھے کہیں نہیں جانا میں یہاں ہی رہوں گی اپنی سرزمین پر۔ مجھے کسی اجنبی دیار میں نہیں رہنا' میں اپنے آخری سانس یہاں لینا چاہتی ہوں' آپ کی گود میں' علی کے سامنے۔''

''ہمیں ایسی تعمیر نو نہیں کرنی چاہیے جس میں ہمارا خون شامل ہو۔ ہمیں غیر ملکیوں کے تسلط سے مکمل آزادی کی خواہش ہے۔'' سادہ سکرین پر ایک اور چہرہ تھا اور پھر وہی دھواں' وہی شعلے' وہی بموں کے دھماکے' جلتی گاڑیاں۔ درندگی اس مقام پر ہے کہ بابل ونینوا کی تہذیب رو رہی ہے۔

عبدالعلی نے زور سے آنکھیں بھینچ لیں۔

''علی!'' فرح نے اسے آواز دی۔

''علی! چلو اٹھو۔ آخری بار بانو بازار کی چاٹ کھا آئیں۔''

علی کو لگا جیسے اس کے اندر ماتم بپا ہو۔ بابل ونینوا کی تہذیب کی موت کا ماتم۔ فرات ودجلہ کے آنسو۔ محب اللہ خان اور اسجد کی جدائی کا غم۔ عینی کا دکھ اور فرح کی آنے والی موت کے بین۔ جیسے سارے غم ایک ساتھ اس کے دل کے آنگن میں بال کھولے بین کررہے ہوں' رو رہے ہوں۔

''علی!''

فرح نے پھر پکارا تو اس نے ایک بار آنکھوں کو پھر سے زور سے بند کیا اور اس کی طرف دیکھا۔

فرح اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حسرت تھی' محبت تھی۔ زندگی کی چاہ تھی اور موت کی آہٹ تھی اور مسز بدر ہاشمی لٹی لٹی سی بیٹھی تھیں۔

کروڑوں روپے کے بینک بیلنس کے باوجود خالی ہاتھ' تہی داماں بے بس۔

عبدالعلی اٹھ کھڑا ہوا اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ فرح نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یکدم اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

''مما! آپ بھی چلیں نا۔'' فرح نے مڑ کر انہیں دیکھا۔ وہ کھڑی ہو گئیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا مضبوطی سے ہاتھ تھامے لاؤنج سے باہر نکلے یوں جیسے زندگی اور موت ساتھ ساتھ چل رہے ہوں یا یوں جیسے موت کی کوکھ سے زندگی نے جنم لیا ہو یا جیسے کسی فدائی نے اپنا جیون ہار کر پیچھے رہ جانے والوں کو زندگی ہدیہ کی ہو۔ موت کے ہاتھ میں زندگی کا ہاتھ تھا۔

اور مسز بدر دونوں کے پیچھے سر جھکائے چلی جا رہی تھیں۔ شکست خوردہ اور شکستہ سی۔

☆ ☆ ☆

فرینڈلی فائر

''میرا اماں''

پاکستان

ڈیر نِک!

خوش رہو! بہت عرصہ بعد تمہارا خط ملا..........شاید تم مجھ سے خود ہی خفا ہو گئے تھے۔ مجھے یاد ہے گیارہ ستمبر کے واقعے کے بعد تمہارا ایک خط مجھے ملا تھا جس میں تم نے بہت غصے کا اظہار کیا تھا۔ میں نے ایک مختصر سا خط تمہیں لکھا تھا لیکن شاید تم بہت خفا تھے اور تم نے وہ خط شاید پڑھے بنا ہی پھاڑ کر پھینک دیا ہو یا پھر پڑھ کر غصے میں پھاڑ ڈالا ہو۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آ رہا تھا تب کہ تمہیں کیا لکھوں۔ تمہیں تعزیت کروں یا خود کو..........

نِک! شاید تم نہیں جانتے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہلاک ہو جانے والوں میں میرا سگا چچا بھی شامل تھا مگر اپنے لوگوں پر ٹوٹنے والی اس قیامت پر تم اتنے غصے میں آ گئے تھے کہ تم نے نہ جانے مجھے کیا کیا کچھ کہہ ڈالا۔ مجھے اور ابو عبیدہ کو......تم نے مجھے ڈاکو' دہشت گرد' قاتل' ظالم اور نہ جانے کیا کیا القاب دے ڈالے تھے۔ تمہیں تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا نک کہ میں نے' تم نے اور ابو عبیدہ نے ایک شام لنڈا کے گرین ہاؤس میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر عمر بھر آخری سانس تک دوستی نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ تم نے جو مجھ پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی تھی' کچھ جانے بغیر......تو پھر میں تمہیں

کیوں بتاتا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی پر میں تم سے زیادہ دکھی ہوں۔ میرا دل بھی رو رہا ہے۔
صرف اس لیے نہیں کہ مرنے والوں میں میرا سگا چچا سعید بھی تھا جو عمر میں مجھ سے صرف دو سال بڑا تھا اور میرا بہت گہرا دوست بھی تھا۔ ہم نے بچپن میں اکٹھے "میرا اماں" کی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر چڑھتے اترتے وقت گزارا ہے' جنگلوں میں گھومے ہیں اور گھنٹوں یہاں ٹیلے پر بیٹھ کر قلعہ ثمر قند کو دیکھا ہے اور اس کے متعلق کہانیاں گھڑی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے راز ایک دوسرے سے شیئر کرتے رہے ہیں۔

جب پہلی بار میں نے ماسی زیناں کی بہو کو دیکھا تھا' اس کی گوری کلائیوں میں پھنسی سرخ چوڑیاں اور اونچی ہیل کی جوتی جس پر چھوٹے نگینے جڑے تھے اور جس نے نیٹ کا بڑا سا دوپٹا اوڑھ رکھا تھا اور وہ جلیل کے ساتھ جیپ سے اتر کر گھر کی طرف جا رہی تھی تو سب سے پہلے چاچا سعید کو ہی جا کر بتایا تھا کہ جلیل کی دلہن جو شہر سے آئی ہے' وہ تو کوئی پری ہے اور پھر ہم دونوں ہی چپکے چپکے چھپ کر اسے دیکھا کرتے تھے لیکن اسی روز اس نے ہماری چوری پکڑ لی تھی اور جب پہلی بار چاچا دسویں کا امتحان دے کر کلر کہار سے آیا تھا تو اس نے مجھے ہی بتایا تھا کہ ماما خالق کی بیٹی بڑی سوہنی ہے اور وہ اسی سے شادی کرے گا۔ ماما خالق کلر کہار میں رہتا تھا اور اب ہی چاچا سعید جو میرا اتنا گہرا دوست تھا' اپنی نئی نویلی دلہن کو یہاں "میرا اماں" میں اکیلا چھوڑ کر تمہارے اس ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے ملبے تلے دب گیا ہے۔
اس کی دلہن جو اس کی طرف سے خوشخبری ملنے کا انتظار کر رہی تھی کہ کب وہ اسے اپنے پاس بلاتا ہے' اس کی موت کا سندیسہ پا کر بالکل چپ ہو گئی ہے' ساکت۔۔۔۔ اس وقت بھی شاید وہ باہر کسی پہاڑی' کسی ٹیلے پر ساکت بیٹھی ہو گی۔ آنکھوں میں انتظار لیے۔۔۔۔ ایسا انتظار جسے کبھی ختم نہیں ہونا ہے۔

لیکن میں صرف چاچا سعید کے لیے تو نہیں رویا تھا' مجھے صرف ان کا ہی تو دکھ نہیں تھا' میں تو ان سب کے لیے بھی رویا تھا جو بے گناہ' بے قصور مر گئے تھے۔ حکمرانوں اور ملکوں کی جنگ میں بے گناہ لوگ یونہی مارے جاتے ہیں لیکن مجھے تم پر حیرت تھی نِک کہ تم جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی پر تڑپ اٹھے' تمہیں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں تمہارا دوست ہوں جسے تم پیار سے میرا اپنا عالی کہا کرتے تھے۔ تم نے مجھے ہر وہ بات کہہ ڈالی جو کہہ سکتے تھے۔ لیکن تم نے بوسینا' چیچنیا' کشمیر میں ظلم کا شکار ہونے والے' مرنے والے لوگوں کے لیے ایسی تڑپ

کبھی محسوس نہیں کی' تم نے کبھی اس طرح انہیں گالیاں نہیں دیں جو ہر روز فلسطینیوں کا قتل عام کر رہے ہیں' جس طرح تم نے اب مجھے دیں۔
کیا اس لیے کہ وہ سب مسلمان ہیں؟ کیا وہ ایسے ہی انسان نہیں ہیں جیسے ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں مرے؟
اور کیا ان کے جسموں میں خون کے بجائے پانی ہے' جس کی کوئی قیمت نہیں؟
تم نے کبھی ان کا درد محسوس نہیں کیا نِک' تم نے کبھی ان کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ حالانکہ یہ تم ہی تھے نا' جو کہا کرتے تھے کہ ہماری دوستی مذہب' وطنیت عقیدے سب سے بالاتر ہے۔
ہم تین انسانوں کا صرف ایک مذہب ہے اور وہ ہے محبت' دوستی۔۔۔۔ لیکن یہ خط جو تم نے مجھے ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے تباہ ہونے کے بعد لکھا اور یہ خط جو آج تم نے لکھا ہے' تمہاری اس بات کی نفی کر رہا ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ کہہ رہا ہے کہ تم نِک' تم ایک متعصب امریکی ہو اور تم نے بھی اپنے بڑوں کی طرح اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے۔
ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی میں کس کا ہاتھ تھا۔ میں اس پر بحث نہیں کروں گا کہ اس پر بہت بحث ہو چکی۔ تم لوگوں نے جو فرض کرنا تھا' کر چکے۔۔۔۔ اور جو تباہی تم نے افغانستان میں مچائی' شاید اس سے تمہارے اندر بھڑکتی آگ کچھ ٹھنڈی ہوئی ہے۔۔۔۔
تمہارے اپنے Jarnic Doran کی بنائی ہوئی ڈاکومنٹری فلم
"Afghan Massacre the Convoy of Death"
تو تم نے ضرور دیکھی ہو گی۔ کنٹینرز میں جس طرح انسانوں کو بند کر کے مارا گیا' انسانیت یقیناً اس پر لرز اٹھی ہو گی اور تمہارے اپنے ہی ایک بھائی نے یہ فلم دیکھ کر کہا تھا۔
"مجھے اپنے انسان ہونے پر شرمندگی ہے۔"
تم نے یقیناً اس فلم میں اجتماعی قبریں بھی دیکھی ہوں گی اور شیروان کے قلعہ جنگی میں ہونے والے مظالم سے بھی بے خبر نہ ہو گے۔ سنا ہے امریکہ نے یہ فلم نہیں دکھائی لیکن یورپ کے 35 ممالک میں یہ فلم دکھائی گئی۔ کابل و قندھار میں ایسے ایسے ظلم کیے گئے کہ پتھر بھی موم ہو جائیں اور تم تو ایک نازک سا محبت بھرا دل رکھنے والے ہو' یقیناً تمہارا دل بھی ضرور اس ظلم پر کانپا ہو گا تب ہی تو تم نے سال بھر بعد مجھے پکارا ہے اور گلہ کیا ہے کہ میں تمہیں

بھول گیا ہوں۔ حالانکہ میں تو تمہیں کبھی نہیں بھولا۔۔۔۔۔۔ باوجود اس کے کہ سال بھر پہلے تم نے مجھے جو خط لکھا تھا اس میں مجھے پکا دہشت گرد کہا تھا۔۔۔۔۔۔ اور وہ جو بے شمار گالیاں تم نے مجھے دی تھیں۔۔۔۔۔ یوں حیران ہو کر مجھے مت دیکھو، وہ ساری گالیاں جو تم نے مسلمانوں کو دی تھیں، وہ مجھے یوں ہی لگی تھیں جیسے تم نے مجھے دی ہیں۔۔۔۔ ظاہر ہے میں بھی تو مسلمان ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میں اتنا پکا اور راسخ العقیدہ مسلمان نہیں ہوں پھر بھی تمہاری دی ہر گالی میرے دل میں ترازو ہو گئی ہے۔ حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ جب امریکا نے دھمکی دی تھی کہ اگر دہشت گردی کے خلاف پاکستان نے اس کا ساتھ نہ دیا تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے تو مجھے اپنی فکر پڑ گئی تھی کہ پتا نہیں ان حالات میں، میں امریکا جا سکوں گا بھی یا نہیں۔۔۔۔۔ پتا نہیں اب مجھے گرین کارڈ بھی مل سکے گا یا نہیں۔۔۔ اور کہیں میرا بڑا بھائی علی حیدر شکاگو سے واپس ہی نہ آ جائے اور اگر وہ واپس آ گیا تو کیا ہو گا؟ ابھی تو اسلام آباد میں خریدے گئے پلاٹ پر ہمیں گھر بنانا ہے اور پھر گھر کے اخراجات، بہنوں کی شادیاں۔۔۔۔۔ میں تو از حد پریشان ہو گیا تھا اور میں نے دل ہی دل میں سینکڑوں دعائیں مانگ ڈالی تھیں کہ امریکا سے ہمارے تعلقات خراب نہ ہوں۔۔۔۔۔۔ اور پھر صرف یہ ہمارے گھر کی بات تو نہ تھی۔۔۔۔۔ پاکستان کے سینکڑوں گھرانوں کا یہی مسئلہ تھا۔ میں نے کئی لوگوں کو پریشان سا ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے دیکھا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ لیکن تمہاری وہ گالیاں نِک، میرے دل میں تیر کی طرح لگی تھیں۔ میں کتنے ہی دن کلبلاتا رہا تھا۔ لیکن اپنے مختصر سے خط میں، میں نے تمہیں کچھ نہیں لکھا تھا۔ مجھے تو اپنے بھائی کی فکر تھی کہ وہ آ گیا تو یہ ڈھیر سارے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔

پھر پاکستان خوفزدہ ہو کر امریکا کا ہراول دستہ بن گیا۔ اس نے اپنے اڈے تمہارے حوالے کر دیے کہ یہاں سے حملہ کرو۔ تو میں تب بھی تڑپا۔ اندر ہی اندر میرے دل نے بڑا واویلا کیا۔ بہت تڑپا کہ یہ کیا۔۔۔۔۔ ہم بھلا اپنے اڈے کیوں دیں تمہیں، اپنے ہی بھائیوں کو مارنے کے لیے۔۔۔ لیکن میرے آقاؤں نے بھی شاید میری طرح سوچا ہو۔۔۔ آخر مجھے بھی تو فکر تھی نا کہ کہیں علی حیدر کو واپس نہ آنا پڑے اور کہیں اسلام آباد میں بننے والا گھر صرف کاغذ پر ہی نہ رہ جائے تو میرے آقاؤں کو بھی تو ایسی ہی مجبوری رہی ہو گی۔ پھر بھی نِک جیسن میں ایک سال سے اس پر کڑھ رہا ہوں۔

رو رہا ہوں۔

اندر ہی اندر گھلتا جا رہا ہوں۔

میں بیک وقت تم سے نفرت بھی کرتا ہوں اور محبت بھی۔ پتا نہیں میرے اندر اتنے الجھاوے کیوں پیدا ہو گئے ہیں۔ کچھ دن ہوئے میں نے ایک نظم پڑھی تھی، مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ذہنی کیفیت کو لفظوں میں بیان کر دیا ہو۔

میں بھی کیسا آدمی ہوں
میں امریکا سے نفرت کرتا ہوں
لیکن مجھے امریکا سے آنے والے
ان ڈالروں سے محبت ہے
جو میرے بیٹے ہر ماہ
میرے اکاؤنٹ میں جمع کراتے ہیں
میں امریکا سے بیک وقت نفرت بھی کرتا ہوں
اور میں اس کا ساتھی بھی ہوں
جرأت، غیرت اور حیا
مجھے دقیانوسی لفظ لگتے ہیں
میں جہاد کو دہشت گردی کہتا ہوں
اور خودکش حملے کرنے والوں کو
احمق اور بیوقوف
لیکن ٹی وی پر
ابوغریب جیل میں
اور قلعہ جنگی میں ہونے والے مظالم دیکھ کر
دھاڑیں مار مار کر روتا ہوں
اور امریکا کو برا بھلا کہتا ہوں
اور اپنے آقاؤں کی حکمت عملی بھول جاتا ہوں
لیکن فون پر اپنے بیٹے کو کہتا ہوں (جو نیویارک میں ہے)

ابھی پاکستان مت آنا
اور ہاں ڈرافٹ لگانا مت بھولنا
کہ نئی گاڑی خریدنا ہے
اور کارپٹ بھی پرانے ہو چکے ہیں
میں بھی کیسا آدمی ہوں
میرے سینے میں ہر ایک کا درد ہے
فلسطین کا، بوسنیا کا
مسجد اقصیٰ کا، افغانیوں کا
عراقیوں کا
لیکن میں ان کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا
کیوں کہ مجھے اپنا بھی خیال ہے

تمہیں یقیناً یہ نثری نظم پسند آئے گی۔ تم تو شاعری کے ہمیشہ سے ہی دلدادہ ہو تمہیں یاد ہے نا کہ جب کبھی ہم لنڈا کے گرین ہاؤس میں اکٹھے ہوتے تھے تو تم زبردستی ہمیں نظمیں سناتے تھے۔ بائرن کی، کیٹس کی، شیلے کی اور اپنی اور جب تم اپنی نظم سنانے لگتے تھے تو یاد ہے نا، لنڈا کتنا شور مچاتی تھی۔

میں نے کبھی تمہاری کوئی نظم دھیان سے نہیں سنی لیکن آج سوچتا ہوں کہ تم یقیناً اچھی شاعری کرتے تھے۔ ابو عبیدہ نے ایک بار تعریف کی تھی۔

تم نے لکھا ہے کہ میں بے وفا ہوں۔ نہیں یارِ من، میں تو لنڈا کے گرین ہاؤس میں گزرنے والی ایک شام بھی نہیں بھولا، نہ ہی تمہارے اور ابو عبیدہ کے ساتھ گزرنے والا کوئی لمحہ میری یاد کے صفحے سے مٹا ہے۔ میں تو ''میرا اماں'' جیسے سادا سا، گھبرایا سا اور سہما سہما لڑکا تھا۔ گو میٹرک کے بعد میں نے باقی تعلیم لاہور سے حاصل کی لیکن میرے اندر سے کبھی وہ سہما اور ڈرا ہوا لڑکا نہیں نکل سکا تھا۔ یہ تو تم تھے اور ابو عبیدہ جنہوں نے اجنبی شہر میں مجھے سہارا دیا تھا۔ گو میں نے گریجویشن کر رکھی تھی لیکن میں انگریزی کا ایک جملہ تک بھی نہیں بول سکتا تھا۔ یاد ہے نا اسٹور پر کوئی گاہک کچھ کہتا تو میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا اور پھر تم یا ابو عبیدہ ہی میری مدد کو آتے تھے۔ پھر میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔ نِک! تم نے مجھے بہت گالیاں

دی تھیں۔ لیکن پھر بھی میں نے اکثر راتوں کو لیٹ کر تمہیں بہت یاد کیا۔ وہ تمہاری گرل فرینڈ فینی کیسی ہے؟ کیا ابھی تک وہی گرل فرینڈ ہے یا کوئی اور ہے؟ ویسے سچ بتاؤں، فینی مجھے کوئی خاص پسند نہ تھی۔ ایک تو اس کے دانت بہت اونچے اونچے سے تھے اور پھر انہیں زیادہ چاکلیٹ کھانے سے کیڑا لگ چکا تھا۔ جب وہ ہنستی تھی پورا منہ کھول کر، تو مجھے بہت بری لگتی تھی۔ گھن کھائے دانت دیکھ کر میرا جی اوب جاتا تھا۔ برا نہ منانا یار، فینی کے چہرے پر اتنے بھورے تل تھے کہ انہیں دیکھ کر مجھے چیونٹیوں بھرے کباب کا خیال آجاتا تھا۔ ویسے جس طرح تمہاری عادت تھی جلدی جلدی گرل فرینڈ تبدیل کرنے کی، تم اب تک گرل فرینڈ تبدیل کر چکے ہوگے، یقیناً اس دفعہ تم نے کسی گھن کھائے دانتوں والی اور تلوں بھرے چہرے والی لڑکی کو اپنی گرل فرینڈ نہیں بنایا ہوگا۔ لیکن تم نے اپنے چار صفحات کے خط میں اپنے متعلق تو کچھ بھی نہیں لکھا نہ فینی کے متعلق نہ کسی نئی گرل فرینڈ کے متعلق بلکہ ان چار صفحات میں سوال ہی سوال ہیں۔ ــــ مجھے تو یہ خط نہیں بلکہ امتحانی پرچہ لگتا ہے اور مجھے سمجھ نہیں آرہا کہ تمہارے کس سوال کا جواب دوں اور کس کا نہ دوں۔

میں نے تمہارا خط کتنی بار پڑھ ڈالا ہے اور میری حالت ایسی ہی ہو رہی ہے جیسے دسویں کا انگلش B کا پیپر دیکھ کر ہوئی تھی۔ ایک نظر میں تو مجھے یوں لگا تھا جیسے مجھے سارے ہی سوال آتے ہیں لیکن جب لکھنے لگا تو جیسے سب کچھ ہی گڈمڈ ہو گیا تھا۔ شاید جملے ذہن سے بھاگ گئے تھے اور قلم ہر لفظ کے اسپیلنگ پر اٹکنے لگا تھا۔

تمہارا خط پڑھتے ہوئے بھی میں نے سوچا تھا کہ تمہارے سارے سوالوں کا تمہیں ایسے جواب لکھوں گا کہ تم منہ دیکھتے رہ جاؤ گے لیکن جب قلم اٹھایا تو بس وہی حال ہوا، لفظ اور جملے کہیں بھاگ گئے۔ پھر بھی میں کوشش کر رہا ہوں کہ تمہیں مطمئن کرسکوں حالانکہ مجھے پتا ہے تم آسانی سے مطمئن ہونے والوں میں سے نہیں ہو۔ جذباتیت متاثر نہیں کرتی بلکہ تم دلائل سے قائل ہوتے ہو لیکن بدقسمتی سے میں ایک ایسی قوم کا فرد ہوں جس کے پاس نری جذباتیت ہی ہے اور اس جذباتیت کے جوش میں سارے دلائل کہیں ادھر ادھر کھو جاتے ہیں۔

تم نے کہا ہے نک جیسن کہ ہم آخر ان مدرسوں کو بند کیوں نہیں کر دیتے جو دہشت گرد پیدا کر رہے ہیں ــــ میں حیران ہوں نک تم تو بڑے منطقی آدمی ہو، تم

سے مجھے ایسے کسی سوال کی توقع ہرگز نہ تھی۔ یہ مدرسے کیا ہیں ــــــ اوران کے طالب
علم بے چارے غریب مسکین ــــــ جن کے والدین انہیں بڑے اسکولوں میں تعلیم
نہیں دلوا سکتے ــــــ میرے اپنے گاؤں ''میرا اماں'' کے کئی بچے ایسے ہی ایک مدرسے میں
پڑھتے ہیں۔ ان میں پھاتاں تندوراں والی اور بالو ماشکی کا بیٹا بھی ہے جو پشاور سے ذرا ادھر
ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک مدرسے میں پڑھتے ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ پھاتاں کا
بیٹا جذبہ جہاد سے مغلوب ہو کر افغانستان چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہیں پلٹا۔ کیا خبر ابھی
تک وہ وہاں کی کسی جیل میں ہو یا پھر قلعہ جنگی میں اور کنٹینروں میں مرنے والوں میں ہو۔
لیکن تم اسے دہشت گرد نہیں کہہ سکتے۔ نِک جیسن وہ تو بڑا معصوم سا لڑکا تھا۔ ابھی پچھلے سال
تک تو وہ کرتے کے دامن سے بہتی ناک پونچھتا پھرتا تھا۔ ابھی مشکل سے چودہ سال کا بھی
نہ ہوا ہوگا۔ اب تم کہو گے کہ اسے اس کے استادوں نے ورغلایا ہوگا لیکن نِک جیسن' تم اس
جذبے کو نہیں سمجھ سکتے' یہ کسی کے ورغلانے سے پیدا نہیں ہوتا' یہ تو خود بخود اندر سے اٹھتا ہے
یہ تو معوذؓ اور معاذؓ جیسے معصوموں کو کفار کے مقابلے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ لیکن تم بھلا کہاں
سمجھو گے اسے' بے چاری ماسی پھاتاں سارا دن گاؤں کی گلیوں میں کرلاتی پھرتی ہے' ایک
ہی بیٹا تھا اس کا ــــــ کوئی اسے بتا دے کہ وہ شہید ہو گیا ہے تو اسے چین مل جائے لیکن
پتا ہی نہیں چلتا ــــــ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ ایران کی جیل میں ہے کچھ کہتے ہیں اسے کیوبا
بھیج دیا گیا ہے۔

یہ میں بھی کن باتوں میں الجھ گیا ہوں۔ تم نے کہا ہے کہ آخر ہم ان مدرسوں کو جڑ
سے کیوں نہیں اکھاڑ پھینکتے جو دہشت گرد پیدا کرتے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ نِک جیسن! تم
جیسا منطقی آدمی ــــــ ہر بات کو کیلکولیٹ کر کے دو+دو کا جواب نکالنے والا ایسی بات
کر رہا ہے۔ تمہارے ملک نے جن دہشت گردوں کی لسٹ شائع کی ہے ان میں تو کوئی ایک
بھی ان مدرسوں کا پڑھا لکھا نہیں ہے۔ نِک جیسن! شاید تم نے غور نہیں کیا تمہارے A
Network of Terroism نے جن پچاس دہشت گردوں کی تفصیل شائع کی
ہے گو وہ سب کے سب مسلم ہیں لیکن ان سب نے امریکا' لندن اور جرمنی کی یونیورسٹیوں
میں تعلیم حاصل کی ہے۔ تمہارے نزدیک سب سے بڑے دہشت گرد اسامہ بن لادن نے
ہارورڈ یونیورسٹی سے پڑھا ہے اور وہ عمر شیخ جسے تمہارے ایک آدمی کے قتل کے الزام پر

تمہارے حوالے کیا گیا ہے' اس نے لندن اسکول آف اکنامکس سے تعلیم حاصل کی
ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ تم اور تمہارے آقا پاکستان میں موجود بے ضرر دینی مدرسوں کو تو
بند کرنے کی بات کرتے ہو لیکن ان بڑی یونیورسٹیوں کو جنہوں نے دہشت گرد پیدا کیے' ان
کو بند کرنے کی بات انہوں نے کبھی نہیں کی۔ حیرت ہے اتنی بڑی سپر پاور نے اتنی سی بات
پر غور نہیں کیا۔ یہ پچاس افراد دہشت گرد ہیں یا نہیں' یہ تو ایک بالکل الگ بحث ہے' میں اس
پر تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا کہ میں بہر حال اپنے آقاؤں کا فرماں بردار ہوں۔
لیکن نِک مائی فرینڈ! تم ایک کام کرو اور ایک رپورٹ تیار کر کے وائٹ ہاؤس
روانہ کر دو جس میں ان ساری بڑی یونیورسٹیوں کو بند کرنے کی سفارش کرو جن میں ان
سارے دہشت گردوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ میری جان! تمہارے ملک میں تو صحافت
اور میڈیا آزاد ہے' تم ہر اخبار میں ہر جگہ اپنی سفارشات پیش کرو۔ تم نے مجھے جو دینی
مدرسوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا مشورہ دیا ہے اور کہا ہے کہ مجھے اس سلسلے میں اخباروں میں
مضامین شائع کروانے چاہئیں تاکہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ــــــ یعنی نہ دہشت
گرد پیدا ہوں نہ دہشت گردی ہو۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں' اگر تم ان بڑی یونیورسٹیوں کو
بند کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہو تو پھر ان ننھے ننھے مدرسوں کی کیا اہمیت ہے۔ رہی
مضامین کی بات' تو تم جانتے ہو ہمارے پاس، ہمارے ہاں میڈیا آزاد نہیں ہے۔ کچھ قلم
بکے ہوئے ہیں اور کچھ مجبور ــــــ تمہارے ہاں تو ایسی کوئی پابندی نہیں' تم بلا جھجک اپنے
خیالات کا اظہار کر سکتے ہو۔ ویسے کچھ دن ہوئے میں نے اخبار میں تمہارے ایک مزاحیہ
اداکار بل کے متعلق پڑھا تھا کہ اس نے 2002ء میں اپنے کسی پروگرام میں افغانستان کے
حالات کے متعلق کوئی لطیفہ سنایا تھا جس پر اسے اسی روز' گھر بیٹھے ڈزنی کمپنی سے نوکری
سے فراغت کا پروانہ مل گیا۔ بہر حال یہ تو اخباری خبر ہے اور اخبار تو ویسے ہی بڑھا چڑھا کر
حقائق بیان کرتے ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آزادئ رائے کا دعویٰ کرنے والے ملک
میں کسی بھی چینل پر اسے نوکری نہ ملے۔ خیر یہ بات تو یوں باتوں باتوں میں آ گئی ورنہ میرا
مقصد تو صرف تمہیں یہ بتانا تھا ان سارے مطلوب دہشت گردوں میں سے کوئی ایک بھی
دینی مدرسے کا تعلیم یافتہ نہ تھا۔
نِک ڈیئر! تم نے تو مجھ سے اتنے سوال کر ڈالے ہیں حالانکہ میں بے چارہ ایک

چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کا رہنے والا سمپل سا گریجویٹ ہوں۔ میرے اس گاؤں کا نام تو شاید میرے اپنے ملک کے لوگوں نے نہ سنا ہو اور میری عقل بھی بس یوں ہی سی ہے' بقول تمہارے اور ابو عبیدہ کے' موٹی عقل ------ تب ہی تو میں پانچ سالوں میں لنڈا کے جذبوں کو سمجھ ہی نہ سکا۔ یہ تو تم تھے جس نے ایک بار پھر میری توجہ لنڈا کی طرف دلائی تھی۔

''یہ لنڈا تم سے پیار کرتی ہے احمق۔''

اور میں منہ پھاڑے تمہیں دیکھتا رہ گیا تھا۔

''میں یعنی میں۔''

''ہاں تم سے ------ موٹی عقل والے بھینسے۔''

یاد ہے نا کبھی کبھی پیار سے تم مجھے موٹی عقل والا بھینسا کہتے تھے جس پر میں ہمیشہ احتجاج کرتا تھا۔

''یہ زیادتی ہے نِک' میرا رنگ اتنا گورا ہے۔ ہاں تمہاری طرح پھیکا شلجم نہیں ہے۔ اور بھینسا تو کالا سیاہ ہوتا ہے۔''

''لیکن تمہارے اس دماغ میں جو عقل ہے وہ موٹی ہے'' تم میرے کندھے پر دھپ لگاتے تھے۔

دیکھنے میں تو تم دبلے پتلے تھے لیکن تمہارے اندر جیسے لوہا بھرا تھا۔ میرا کندھا کئی دن تک درد کرتا رہتا تھا۔ سو میں تمہاری اس محبت سے ڈرتا رہتا تھا اور بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

''یار لنڈا تمہاری محبت میں گردن گردن ڈوب چکی ہے۔''

''تو میں کیا کروں' تم اسے سمجھاؤ۔ مجھ سے محبت کرنے میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میں نے یہاں آتے ہوئے ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی تھی کہ میں کسی گوری سے بیاہ نہیں کروں گا۔''

''موٹی عقل والے میرے احمق دوست' بیاہ کرنے کو کون کہہ رہا ہے۔ بھئی گرل فرینڈ بنالو۔''

''دوست تو ہے وہ ہماری۔''

''دوست سے بڑھ کر کچھ اور''

تم آنکھ دبا کر قہقہہ لگاتے تھے اور میں کبھی بھی نہ جان سکا کہ جب مجھے اس سے

بیاہ نہیں کرنا تو پھر وہ میری دوست سے بڑھ کر کچھ اور کیسے ہو سکتی ہے۔

تم ہمیشہ مجھے موٹی عقل والا کہتے رہے ہو تو میری عقل تو آج بھی اتنی ہی موٹی ہے' میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم ورلڈ ٹریڈ سنٹر تباہ کرنے والوں اور فدائی حملے کرنے والوں کو دہشت گرد کہتے ہو۔ تمہارے نزدیک طالبان کی مدد کرنے والا اسامہ بہت بڑا دہشت گرد ہے لیکن تم نے اس فرانسیسی کو جس نے ویت نام والوں کی مدد کے لیے وہاں گوریلا جنگ لڑی' کبھی دہشت گرد نہیں کہا۔

بھلا مجھے یہ تو بتاؤ کہ افغانستان میں تباہی مچانے والے

ابوغریب جیل کے بے چارے قیدیوں پر ستم ڈھانے والے

فلسطینیوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے والے

شیخ یاسین اور عبدالعزیز رنتیسی کو شہید کرنے والوں کو تم کیا کہو گے۔ تمہاری عقل تو میری طرح موٹی نہیں ہے فرینڈ ------ تم مجھے ضرور بتاؤ گے کہ تمہارے نزدیک اصل دہشت گرد کون ہیں؟

خیر چھوڑو ان باتوں کو' یہ بتاؤ' لنڈا کیسی ہے؟ کبھی اس نے مجھے یاد کیا؟ اور ابو عبیدہ کہاں ہے؟ بہت دن پہلے اس نے مجھے خط لکھا تھا۔ اس کے بعد سے میرا اس سے رابطہ نہیں اگر رابطہ ہو تو میرا اسلام اسے ضرور دے دینا۔ ویسے یہ عجیب بات نہیں ہے نِک جیسن کہ میں اور ابو عبیدہ جو کبھی تمہارے بہت گہرے دوست تھے' دونوں ہی مسلم ہیں' بقول تمہارے دہشت گرد ------

اور وہ ابو عبیدہ کی بیوٹی کوئن کا کیا حال ہے' کیا ابو عبیدہ کے اپنے وطن جانے کے بعد بھی وہ اسے یاد کرتی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ وہ تمہاری فینی سے ہزار درجے خوبصورت تھی لیکن پتا نہیں تمہیں فینی میں کیا نظر آیا تھا۔

دیکھو میں بھی کتنا پاگل ہوں کہ تمہارے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے ادھر ادھر کی ہانکنے لگا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے پاس تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بھلا میں ''میرا اماں'' میں رہنے والا' موٹی عقل والا' تمہارے اتنے مشکل سوالوں کے کیا جواب دوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میں دسویں جماعت میں انگلش B کے پرچے میں فیل ہو گیا تھا۔ اس طرح تمہارے سوالوں کے جواب میں بھی شاید فیل ہی ہو جاؤں اور تم میرے اس

سارے خط پر کراس ڈال کر پھینک دو۔ لیکن نِک ڈیئر، گو میں انگلش B کے پرچے میں فیل ہو گیا تھا لیکن میں نے امتحانی کاپی ساری کی ساری بھر دی تھی ۔۔۔۔۔۔ ایک صفحہ بھی خالی نہیں چھوڑا تھا۔ حیرت ہے کہ پھر بھی مجھے فیل کر دیا گیا تھا۔ سو میں نے تمہارے بھی سارے سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کی ہے خواہ تمہارے نزدیک میرے سارے ہی جواب غلط ہوں گے۔

تم نے لکھا ہے مائی ڈیئر کہ ''تم لوگ پیدا ہوتے ہی بچوں کے کانوں میں جہاد جہاد کہنا شروع کر دیتے ہو اور اس طرح پیدا ہوتے ہی بچوں کو دہشت گرد بننے کا سبق دیتے ہو۔ اس طرح تم پچانوے فیصد مسلمان پیدائشی دہشت گرد ہو۔ ذرا مجھے یہ تو بتاؤ فرینڈ کہ یہ جہاد ہے کیا جس کو تم نصاب میں بچوں کو پڑھاتے ہو اور تمہاری مذہبی کتاب میں بھی اس کا حکم دیا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ کیسا مذہب ہے تمہارا عبدالرحمٰن جو دہشت گردی کا سبق دیتا ہے۔''

دیکھو نِک جیسن! پہلے تو میں تمہاری ایک تاریخی غلطی درست کرنا چاہتا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم اپنی یہ غلطی درست کر لو۔ انگریزی میں بھلے میں کمزور سہی لیکن تاریخی غلطیاں بالکل برداشت نہیں ہوتیں۔ شاید اس لیے کہ بچپن میں میرے دادا نے مجھے تاریخ کا چسکہ ڈال دیا تھا وہ میرے گاؤں ''میرا اِماں'' سے باہر ایک ٹیلے پر بٹھا کر اکثر تاریخی واقعات بتاتے رہتے تھے۔ اس ٹیلے پر بیٹھ کر دیکھنے سے سامنے قلعہ ثمر قند کے مٹے مٹے نشان دکھائی پڑتے ہیں۔ ادھر سے کچھ دور ادھر وہ پہاڑی ہے جہاں جلال الدین خوارزم شاہ نے پانی میں چھلانگ لگا دی تھی۔ جبکہ چنگیز خان جو اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آیا تھا، پانی میں چھلانگ لگانے کی کوشش نہ کر سکا تھا۔ اب تم پوچھو گے کہ یہ جلال الدین خوارزم کون تھا تو اس کے لیے تو لمبی چوڑی بات کرنا پڑے گی تو بس اتنا سمجھ لو کہ یہ شیر خوارزم تھا جس نے آخری سانس تک تاتاریوں کا مقابلہ کیا۔ تاتاریوں نے بغداد جیسے شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کہتے ہیں کہ دریائے دجلہ کا پانی ان کتابوں کی سیاہی سے مدتوں سیاہ رہا تھا جو تاتاریوں نے بغداد کے کتب خانوں سے لوٹ کر دریائے دجلہ میں پھینکی تھیں۔ تاتاری تو بڑے اجڈ، غیر مہذب اور جنگلی تھے جو پہاڑوں سے اتر کر آئے تھے لیکن تمہارے ہم وطن تو بڑے مہذب اور تہذیب یافتہ ہیں لیکن سنا ہے بغداد کا آج کل وہی حال ہے لیکن اب کوئی جلال الدین

شیر خوارزم نہیں ۔۔۔۔۔۔ تو میرے دادا نے مجھے یہاں ٹیلے پر بیٹھ کر جلال الدین کے متعلق بتاتے، تھوڑی بہت تاریخ کا تو تمہیں بھی پتا ہو گا، بس تو مجھے یہاں سے ہی تاریخ کا چسکہ پڑ گیا ہے اور اب جبکہ میرے دادا زندہ نہیں ہیں، میں اکثر اسی ٹیلے پر آ کر بیٹھ جاتا ہوں اور تاریخ کو سوچتا ہوں۔ مجھے ان مورخوں پر بڑا غصہ آتا ہے جو تاریخ کو مسخ کر دیتے ہیں۔ تمہارے بھائی بند، یا ہمارے پڑوسی ملک کے لوگ ایسا کریں تو پھر بھی قابل معافی ہے لیکن جب میرے ہی ملک کے لوگ ایسا کرنے لگیں تو مجھے بہت غصہ آتا ہے۔

معاف کرنا یہ میں کہاں سے کہاں چلا گیا، میں تو تمہیں بتا رہا تھا کہ تم ایک بڑی تاریخی غلطی کے مرتکب ہوئے ہو۔ پچانوے فی صد مسلمان اور پاکستانی دہشت گرد نہیں ہیں۔ بلکہ یہ پچانوے فی صد بے چارے بڑے مسکین سے ہیں۔ میری طرح انہیں تو یہ بھی نہیں پتا کہ جہاد کیا چیز ہے اور نصاب کس چڑیا کا نام ہے اور نصاب میں تبدیلیوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ بے چارے پچانوے فی صد میری طرح اپنے آقاؤں کے حکم پر سر جھکانے والے ہیں۔ جو ہے اچھا ہے۔ کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور ضروریات کے لیے روپیہ مل رہا ہے تو سب ٹھیک ہے۔ اسلام کیا ہے؟ مذہب کیا کہتا ہے؟ اس سے ان بے چاروں کو کیا لگن ۔۔۔۔۔۔ ان کا اسلام بس اتنا ہی ہے کہ کبھی جوش میں پاکستان زندہ باد اور اسلام زندہ باد کے نعرے لگا دیں ۔۔۔۔۔۔ یہ تو بس مصلحت کے بندے اور ہوا کے ساتھ چلنے والے ہیں، سو اپنی تاریخی غلطی درست کر لو کہ پچانوے فی صد بے چارے سیدھے سادھے مسلمان ہیں۔ ان کا مجموعی کردار ویسا ہے جیسا اس نظم میں ہے جو شروع کے صفحات میں، میں نے لکھی ہے۔ تو نِک ڈیئر، یہ صرف پانچ فی صد بلکہ ایک فی صد لوگ ہیں۔ رہی جہاد کی بات تو جہاد ہر مومن مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ دہشت گردی کو ''جہاد'' سے ملانا غلط ہے۔

ہماری مذہبی کتاب کی سورۂ بقرہ میں اللہ پاک فرماتا ہے۔

''جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اللہ کی راہ میں ان سے لڑو مگر دیکھو ان سے زیادتی نہ کرنا''

تو میری جان اللہ کی راہ میں لڑنا، مظلوم کو ظالم سے بچانا جہاد ہے، اور زیادتی کرنا دہشت گردی۔ میرا مذہب زیادتی کرنے سے منع کرتا ہے اور اللہ کی کتاب اس کا ثبوت

ہے۔تمہارے سوال کا صحیح جواب تو کوئی عالم ہی دے سکتا ہے' میں تو ایک کم علم شخص ہوں لیکن میری کمزوری یہ ہے کہ میں امتحانی کاپی خالی دینے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے جو بھی سمجھ آئے لکھ دوں۔ بہتر تھا کہ تم ابوعبیدہ سے یہ سارے سوال پوچھتے' وہ تو ایک بہت پڑھا لکھا عالم فاضل شخص ہے اور پھر اس کا مذہب سے متعلق بھی علم بہت زیادہ ہے۔ میں تو سچ ہے صرف اتنا ہی جانتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام امریکا کے دوران مجھے بہت سی باتیں بھول گئی تھیں۔ ایک دوبار ابوعبیدہ کے اصرار پر میں عشاء کی نماز پڑھنے چلا گیا تو مجھے یاد ہی نہیں آرہا تھا کہ اس کی کتنی رکعتیں ہیں۔ بڑی شرمندگی ہوئی۔ جب یہاں تھا تو دادا زبردستی مسجد میں ساتھ لے جاتے تھے۔۔۔۔خیر اب جب سے آیا ہوں باقاعدگی سے نماز جمعہ پڑھنے جاتا ہوں۔ خیر میں تو پھر بھی اتنا جانتا ہوں' لیکن ہمارے گاؤں میں تو اکثر لوگ یہ بھی نہیں جانتے' میں چھوٹا سا تھا تو ایک بار ماسی پھاتاں اماں سے تندور پر روٹی لگانے کے لیے آٹا لینے آئی تو اماں میری بہنوں کو قرآن پڑھا رہی تھیں۔ وہ خوش ہو کر اماں کو بتانے لگی کہ میرے گھر بھی ''میٹھی کتاب'' ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ بھلا کتابیں بھی میٹھی اور کڑوی ہوتی ہیں۔تب اماں نے بتایا کہ اس کا مطلب قرآن مجید تھا۔۔۔۔ماسی پھاتاں کو مذہب کا کچھ پتا نہیں تھا تب ہی تو اس نے اپنے بیٹے غلام رسول کو مدرسے میں داخل کرادیا تھا تاکہ وہ اس کی طرح مذہب کے معاملے میں جاہل نہ رہ جائے لیکن تم۔۔۔۔اب کیا کہوں۔

تم نے لکھا ہے کہ افغانستان کے حالات تمہارے حملے کے بعد بہت اچھے ہو گئے ہیں۔لوگ خوش ہیں' آزادی کی سانس لے رہے ہیں اور زندگی کو انجوائے کر رہے ہیں۔ لیکن معاف کرنا' تمہاری اپنی ایک برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب نے جسے تم خود افغانستان کا expert کہتے ہو' سنڈے ٹیلی گراف میں افغانستان کی ترقی کے حوالے سے افغانستان اور اس کے شراب خانوں کے نام سے جو مضمون لکھا ہے ان میں ہوٹلوں اور شراب خانوں کی تفصیل بتاتے ہوئے اس نے لکھا ہے۔

''ہوٹل' شراب خانے۔۔۔۔سب کچھ۔۔۔۔لیکن ان شراب خانوں اور ہوٹلوں کے باہر بچے' خستہ گھروں کے ملبوں کے ڈھیر پر بیٹھے بھوک سے نڈھال' ہوٹل سے نکلنے والوں کا منہ تکتے ہیں۔ایک ہزار امدادی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔لیکن ابھی تک پاکستان اور دوسرے ممالک سے جہاد کے لیے آنے والے جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ شاید انھی

میں ایک ماسی پھاتاں کا غلام رسول بھی ہوگا۔ دو سال پہلے تک کرتے کے دامن سے ناک پونچھتا غلام رسول۔۔۔۔۔جہاد کرنے کے لیے بھی بڑے دل اور بڑے حوصلے کی ضرورت ہے لیکن یار میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے یہ غلام رسول بڑا جی دار تھا' کیسے سب چھوڑ چھاڑ کر جہاد کے لیے چل پڑا۔ایک بار جب ابوعبیدہ نے مجھے لکھا تھا کہ وہ ''حماس'' میں شامل ہونے کا سوچ رہا ہے تو میرا بھی جی چاہا تھا کہ چلوں اور کچھ نہیں تو اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کے لیے کشمیر ہی چلا جاؤں۔لیکن نک ڈیئر مجھے تو پتا نہیں کون کون سے کام یاد آ گئے۔ جو ابھی تک ختم ہی نہیں ہو پا رہے۔

اس خط میں تم نے ایک بار پھر گیارہ ستمبر کو ہونے والے نقصان پر واویلا مچایا ہے گو اس بار تم نے گالیاں نہیں دیں مجھے۔شاید تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا میرے اس مختصر خط سے کہ اس نقصان میں' میں بھی تمہارا شریک ہوں۔ مجھے تمہارے اس واویلے کی سمجھ نہیں آئی۔ ڈیئر! پہلے افغانستان' پھر عراق میں اتنی تباہی مچانے کے باوجود تمہارے زخم ابھی بھرے نہیں ان پر اب تک تو کھرنڈ آ جانا چاہیے تھا۔جس طرح چن چن کر تم مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہو اس سے اب تک تمہارے سینے میں ٹھنڈ پڑ جانی چاہیے تھے۔

مجھے یاد ہے گرل فرینڈ بنانے کے علاوہ تمہاری ایک ہابی ٹی وی دیکھنا بھی تھا۔ یقیناً تم نے اپنے چینل سی بی ایس کے پروگرام دیکھے ہوں گے۔۔۔۔بلکہ الجزیرہ' العربیہ نے ابوغریب جیل کے متعلق جو کچھ دکھایا ہے' مجھے تمہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کمال ہے اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ جب تم گیارہ ستمبر کے متعلق کچھ سوچتے ہو تو تمہارے اندر آگ لگ جاتی ہے۔رہی مالی نقصان کی بات تو اس سے کہیں زیادہ نقصان تم لوگ عراق اور افغانستان میں پہنچا چکے ہو۔اس پر بھی اگر تمہاری تسلی نہیں ہوئی تو میں تمہیں بتاؤں کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر کی تباہی سے سب سے زیادہ مالی نقصان سعودی عرب کے شاہی خاندان کو ہوا ہے۔ دراصل میں نے تمہیں بتایا ہے ناکہ مجھے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے اور میں ادھر ادھر سے تاریخی حقائق جمع کرتا رہتا ہوں۔ یار من!۔۔۔۔۔۔عجیب سر پھرا آدمی ہوں' ایک ہندسہ بھی تاریخ میں ادھر ادھر ہو جائے تو میرا دماغ الٹ جاتا ہے۔لوگ پتا نہیں کیسے کتنی جی داری سے پوری تاریخ ہی بدل دیتے ہیں۔ بلکہ ہمارے ماہرین تعلیم تو خیر چھوڑو' یہ تو اپنا آپ ننگا کرنے والی بات ہے۔ہاں تو میں تاریخ کی بات کر رہا تھا کہ اعداد و شمار تو کہتے ہیں

کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی چالیس بڑی کمپنیوں میں سعودی شہزادوں کے شیئر تھے اور جس کمپنی نے انشورنس کر رکھی تھی ورلڈ سنٹر کی' اس میں بھی عربوں کے شیئرز تھے اور جو ہوائی کمپنیاں دیوالیہ ہوئیں' ان میں بھی عربوں کے شیئر تھے تو میری جان اب کم از کم آئندہ میرے سامنے ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں ہونے والے نقصان پر مت رونا۔۔۔۔۔ آنسو پونچھ لو۔۔۔۔۔ ہم مسلمان اس نقصان میں تمہارے برابر کے شریک ہیں۔ جانی اور مالی دونوں طرح کے نقصان میں۔۔۔۔۔ اس کے باوجود میری قوم مسلسل تاوان ادا کر رہی ہے تمہارے اس نقصان کا۔۔۔۔۔ اب خدارا مجھ سے اس تاوان کی تفصیل نہ پوچھنا' نہیں تو میرا سینہ پھٹ جائے گا میں تو یوں بھی بڑا تھوڑ دلا اور کمزور اعصاب کا آدمی ہوں۔ یہ جو ہر مہینے ہم سات آٹھ آدمی تمہارے حوالے کرتے ہیں' یہ بھی اسی تاوان کا ایک حصہ ہیں اور ہر گرفتاری پر میرے سینے میں ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ کراچی سے غائب ہو جانے والا ڈاکٹر اسد بخاری تو میرے باپ کا سگا ماموں زاد ہے۔ خیر چھوڑو تمہیں اس سے کیا۔۔۔۔۔ کہ گوانتاناموبے میں جو چھے سو جوان قید ہیں' وہ بھی تو اسی تاوان میں تمہیں دیے گئے ہیں اور یہ جو ہم تمہاری خاطر دہشت گردوں کی تلاش میں اپنی ہی زمین پر اپنے ہی لوگوں کے خلاف فوج کشی کر رہے ہیں تو کیا اس سے بڑا تاوان بھی کوئی ہو سکتا ہے۔ بس اب مجھ سے اس ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ذکر ہرگز نہ کرنا۔ کہ ہم تو یوں بھی غیروں سے بنایا کرتے ہیں اپنوں سے بگاڑا کرتے ہیں۔

خاروں کو بوسے ملتے ہیں
پھولوں کو مسلا جاتا ہے
ہر سمت خزاں چھا جاتی ہے
گل چیں سے مل کر گلشن کو
مالی جب باغ اجاڑتے ہیں

تم بھی کیا کہو گے کہ میں نے یہ کیا شاعری شروع کر دی تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ یہ جو عربوں نے امریکا میں اتنی سرمایہ کاری کر رکھی ہے تو یہ بھی ایک سازش ہے اور اس سازش کا آغاز 1973ء میں ہوا تھا جب عربوں نے یورپ اور امریکا کو تیل کی فراہمی بند کر دی تھی۔۔۔۔۔ اگر میں نے اس سازش کی تفصیل لکھی تو تم خواہ مخواہ بور ہو جاؤ گے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہیں تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ لیکن میری جان! اس سازش کے تحت نہ

صرف یہ کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ کیا جا رہا ہے۔ بلکہ تیل پر کنٹرول' عربوں کی حفاظت کے بہانے ہزاروں فوجی عرب کی زمین پر اتارنا اور عربوں کو سرمایہ کاری کی خصوصی اسکیموں کے ذریعے سرمایہ کاری پر اکسانا بے چارے عرب' تم چاہو تو سب کو ایک آن میں دیوالیہ کر سکتے ہو۔ کبھی ملے تو ان ساری سازشوں کی تفصیل تمہیں بتاؤں گا' اب خط میں کیا کیا لکھوں۔

عراق...... آہ یار' یہ تم نے کیا ذکر چھیڑ دیا۔ اب ضروری تھا کہ تم عراق کے متعلق بھی مجھ سے سوال کرتے' بھلا میرا ارادہ اور عراق کا کیا ناتا' ہاں بس اتنا ضرور ہے کہ عراق میں بھی مسلمان بستے ہیں اور میرا ملک بھی ایک مسلم ملک ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تمہیں عراق پر جنگ مسلط کرنے کا افسوس ہے اور تم نے ایسٹر کی چھٹیاں ضائع کر کے عراق کی جنگ کے خلاف مظاہرہ کیا ہے۔ تم 'لنڈا' فینی اور دوسرے کئی ساتھیوں نے۔۔۔۔۔۔ حالانکہ تم ایسٹر کی چھٹیوں میں آن گڈ مین کے ساتھ فرانس جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ سچ بتانا' یہ آن گڈ مین کون ہے؟

نام تو بڑا شاندار ہے لیکن یار یہ گڈ مین کے بجائے گڈ وومن یا گڈ گرل ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ کیا تم اس سے شادی کا ارادہ رکھتے ہو یا پھر یہ بھی فینی کی طرح۔۔۔۔۔ یار مجھے تمہاری یہ ترقی سمجھ نہیں آتی' تم سب کچھ شیئر کرتے ہو' گھر' گاڑی' تنخواہ' تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ یار نک' گھر بنا کر رہنا اور کسی ایک ہستی پر ملکیت رکھنے کا اپنا ہی چارم ہوتا ہے۔ لیکن تم تو ہمیشہ سے ہی اس کے مخالف ہو۔ لیکن اگر آن اچھی لڑکی ہے اور اس کے دانت فینی کی طرح کیڑا کھائے ہوئے اور اونچے اونچے نہیں ہیں اور اس کا چہرہ صاف شفاف ہے تو میری جان بس اس سے شادی کر لو۔ شادی کا کوئی اور فائدہ ہو نہ ہو' بڑھاپا بڑے سکون سے گزرتا ہے۔ بیوی اور بچے کم از کم حال تو پوچھتے ہیں۔۔۔۔۔ خواہ رسماً ہی سہی۔

میں تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ تم نے عراقیوں کے لیے اتنا کچھ کیا۔ اپنی قیمتی چھٹیاں برباد کیں۔۔۔۔۔ خصوصاً تم نے آن کو ناراض کر دیا۔۔۔۔۔ اور فائدہ کچھ بھی نہ ہوا۔ فائدہ ہو یا نہ ہو۔۔۔۔۔ میں اس خلوص کے لیے ہمیشہ تمہارا بہت ممنون رہوں گا۔

تم نے پوچھا ہے کہ یقیناً ہم نے بھی ایسے مظاہرے کیے ہوں گے' اب کیا بتاؤں'

دراصل ہم پاکستانی ------- یہ نہیں کہ ہمیں عراق یا عراقیوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی ------ یا ہم چاہتے تھے کہ امریکا عراق پر حملہ کر دے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ جب تک امریکا نے عراق پر حملہ نہ کیا' ہمارے اعصاب ٹوٹتے رہے۔ ہم ضروری سے ضروری کام چھوڑ کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتے تھے۔ ان دنوں میں نے ان لوگوں کو بھی اخبار خریدتے دیکھا جنہوں نے کبھی اخبار دیکھا تک نہ تھا۔ ہمیں تو لگتا تھا جیسے ہم تنے ہوئے رسے پر چل رہے ہوں۔ عراق پر حملہ ہو گیا تو تب کہیں جا کر ہمارے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے۔ رہی مظاہروں کی بات تو سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تو ایسا کوئی مظاہرہ نہیں ہوا۔ دراصل ہمارے عوام اپنی طاقت جانتے ہیں۔ ہماری ذرا سی غلطی ہمیں معتوب ٹھہراتی' ہم ٹھہرے بیگانے اور تم تو اپنے ہو' کوئی تمہارے شہری وریاستی حقوق کو چیلنج نہیں کر سکتا۔ پھر کچھ مصلحت کا تقاضا بھی تھا اور کچھ خیال خاطر احباب بھی کہ کہیں آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے ------ اور کچھ ہماری اپنی بے حسی بھی ------ پتا نہیں ہم اتنے بے حس کیوں ہیں۔ دو چار لوگ جو اخباروں میں واویلا کر رہے تھے' ان کی کس نے سنی جو ہم اگر سڑکوں پر نکل آتے تو کوئی ہماری سن لیتا۔ اسے تم ہماری دور اندیشی بھی کہہ سکتے ہو۔ جہاں تک دوسرے اسلامی ممالک میں مظاہرے نہ ہونے کی بات ہے تو میں ان کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں' ہو سکتا ہے وہ بھی ہماری طرح دور اندیش ہوں اور انہیں بھی خیال خاطر احباب مقصود ہو ---- یا پھر ہماری طرح وہ بھی خوش فہم ہوں۔ ہمارا خیال تھا کہ صدام کے پاس اتنا اسلحہ ہے اور اتنے خطرناک ہتھیاروں کے ہوتے کون شکست دے سکتا ہے۔ ظاہر ہے امریکا جیسا باخبر ملک اگر یہ کہہ رہا ہے تو سچ ہی ہوگا ------ آخر اتنا بڑا ملک جس کی ایجنسیوں کا جال پوری دنیا میں پھیلا ہے' اس سے زیادہ باخبر اور کون ہو سکتا ہے؟ صدام جو بار بار کہہ رہا ہے کہ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے تو یہ محض یونہی جھوٹ بول رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے بنک جیسن ہم تو منتظر تھے کہ صدام تمہاری فوج کو کیسے شکست دیتا ہے اور اس پوشیدہ اسلحے کے استعمال سے کیسے تمہیں مار بھگاتا ہے لیکن جب ٹی وی پر میں نے صدام کے مجسمے کو گرتے دیکھا تو بس کچھ نہ پوچھو کیا حال ہوا میرا ----- کمال ہے یہ صدام تو بڑا بزدل نکلا اتنا اسلحہ ضائع کر دیا تھا۔ اب اتنے باخبر ملک کی اطلاعات اگر غلط نکلیں تو پھر ------ اب عراق کا جو حال ہوا سو ہوا ----- بستیاں راکھ ہوئیں۔ لاشے تڑپے۔ تم تو ایک بہت

باخبر ملک کے شہری ہو' بھلا تم سے کیا پوشیدہ ہوگا۔

تم نے بھی ضرور
دیکھا ہو گا گہوارۂ دانش میں
بپا رقص جنوں
میں کیا کہوں اور کیا لکھوں بھلا تم خود
اچھی طرح جانتے ہو کہ
وحشتیں ٹوٹ چکیں جنت ارضی کا سکوں
وادیاں اور گزرگاہیں بنی ہیں مقتل
زندگی فصل اگاتی ہے فقط زخموں کی
خون کی پیاس میں پھر بستے نگر اجڑے ہیں
زیست کی شاخ سے پھر
کتنے ہی گل بچھڑے ہیں
بچے ماں باپ کی شاخوں سے جدا
پھول گلستاں سے اڑے
روئے مغرب پہ ہیں مظلوم لہو کے چھینٹے
وہ جنہیں ناز تھا انسان نوازی پہ کبھی
جن کا دعویٰ تھا مہذب ہیں زمانے کے وہی
آج انسان کا لہو پی کے سکون پاتے ہیں

یار! برا نہ منانا یہ شاعر لوگ تو بس ایسے ہی ہوتے ہیں ----- ہر ایک کے درد پر تڑپنے والے انسانیت سوز ------ بھلے اور کچھ کر نہ سکیں' دل کی بھڑاس شاعری میں نکال لیتے ہیں۔ ایک ہم جیسے لوگ ہیں ---- جو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ کسی دکھ پہ رونے کا سلیقہ وقرینہ بھی نہیں ہے ہمیں۔

تم نے لکھا ہے میرے عزیز! کہ ہم لوگ بغداد میں امن پیدا کرنے کی اور حالات بہتر بنانے کی پوری کوشش کر رہے ہو اور یہ کہ عراقی عوام کو تو اتنا ہمارا احسان مند ہونا چاہیے کہ ہم نے انہیں ایک آمر سے نجات دلائی ہے نہ کہ ہمارے خلاف ہتھیار اٹھانے چاہیے۔''

کمال ہے یار‘ جب صدام کا مجسمہ گرایا جا رہا تھا تو ہم نے ٹی وی پر لوگوں کو ناچتے اور خوش ہوتے دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں یہ کون لوگ ہیں جو تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور تم جو امن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو اس کے لیے بھی عراقی عوام کو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے۔ آخر تم اتنی کوششیں کر رہے ہو بحالیٔ امن کی‘ ایسی ہی کوششیں افغانستان میں بھی ہو رہی ہیں۔ تمہارے خلوص پر مجھے رتی بھر شک نہیں لیکن پتا نہیں کیوں ایک شعر یاد آ رہا ہے‘ سنو گے۔

قبائے ملت بیضا جنہوں نے چاک کیا
انہی کے لب پہ صدا اب رفو کی ہے

تمہاری کوششیں تو اپنی جگہ پر صحیح ہی ہیں لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ عراقی عوام کے ہی دماغ خراب ہو چکے ہیں جو تمہارے خلوص کو پرکھنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

چند دن ہوئے ایک دوست نے قطر سے خط لکھا تھا‘ خط کیا تھا یار! نوحہ تھا۔ وہ لکھ رہا تھا کہ بغداد کی ہر صبح لہو میں ڈوب کر نکلتی ہے اور ہر شام بین کرتی ہے‘ کہیں سکھ نہیں۔

ہر طرف بکھرے لاشے ہیں
بموں کے دھماکے ہیں
آگ اور دھوئیں کے الاؤ ہیں
نہ کوئی ہنستا نہ بولتا ہے
ہر ایک طرف آگ کے الاؤ
نہ کوئی بلبل نہ کوئی گل ہے
نہ تتلیوں کی کوئی خبر ہے
وہ ساری تہذیب و تمدن
کہ جس کو صدیوں نے مل کر سینچا
وہ راکھ بن کر بکھر رہا ہے

دراصل نِک ڈیئر! بغداد‘ نجف‘ کوفہ‘ کربلا۔ یہ سب مسلمانوں کے لیے مذہبی لحاظ سے بھی بہت اہم ہیں۔۔۔۔۔۔ میں تو دعا ہی کروں گا کہ خدا تمہاری کوششوں کو کامیاب کرے اور دونوں ممالک میں تم امن و امان صحیح معنوں میں لانے میں کامیاب ہو سکو۔

یار برا نہ منانا‘ چند دن ہوئے میں نے ایک فرانسیسی کی کتاب کا انگریزی ترجمہ پڑھا۔

مصنف کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن کتاب کا نام تھا ''The war of flea'' یعنی ''مکھی کی جنگ''۔ یہ کتاب اس نے ویت نام کی جنگ کے حوالے سے لکھی تھی۔ یہ تو تم جانتے ہو نا کہ جب مکھی کتے سے انتقام پر اتر آتی ہے تو کبھی اس کی ناک پر کاٹتی ہے کبھی ٹانگ پر‘ کبھی منہ پر‘ کبھی دم پر حتیٰ کہ تنگ آ کر وہ بھاگ جاتا ہے۔ اب اس کہانی میں مکھی سے کون مراد ہے اور کتے سے کون‘ اس پر تبصرہ نہیں کروں گا کہ میری عقل تو تم جانتے ہو‘ موٹی ہے لیکن پتا نہیں کیوں تمہارے خط میں عراقیوں کے گوریلا حملے اور فدائی حملے کے متعلق پڑھ کر مجھے یہ کتاب یاد آ گئی۔ تم نے پوچھا ہے کہ آخر ان عراقیوں کو کیا ہو گیا ہے‘ یہ کیوں نہیں اپنے خیر خواہوں کو پہنچاتے اور کیوں خود کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ آخر ان کا انجام کیا ہو گا؟ بالآخر ایک ایک کر کے سب ختم ہو جائیں گے‘ یوں خودکش حملے کر کے۔۔۔۔۔۔ شاید تمہارا تجزیہ صحیح ہو کہ آخر کار یہ ختم ہو جائیں گے۔ آخر کار تم اتنے بڑے ملک کے باشعور شہری ہو اور میں تو بے چارہ چھوٹے سے پہاڑی گاؤں ''میرا اماں'' کا رہنے والا صرف بی اے پاس عبدالرحمٰن ہوں۔ میرا تجزیہ کیا اور تبصرہ کیا۔۔۔۔۔۔ لیکن پتا نہیں کیوں مجھے بہت پہلے کی پڑھی ''The war of flea'' یاد آ رہی ہے کہ اس جنگ کا انجام بھی کہ بالآخر کتا بھاگ جاتا ہے۔ ہاں یاد آیا‘ یہ کتاب تو تم نے ہی مجھے پڑھنے کو دی تھی۔ پڑھنے کا چسکہ تم نے ہی لگایا تھا۔ گو کہ دسویں جماعت میں انگریزی میں میری کمپارٹ آ گئی تھی لیکن امریکا میں پانچ سال رہنے سے مجھے انگریزی بولنا اور پڑھنا ضرور آ گیا ہے۔ جہاں تک بولنے کی بات ہے وہ تو خیر ہر ایک کو آ جاتا ہے جو میری طرح بی اے پاس نہ بھی ہو۔۔۔۔۔۔ ہاں پڑھنا مجھے تمہاری وجہ سے آیا۔ تم جو ہر ہفتے کوئی کتاب اٹھائے چلے آتے تھے اور پھر مجھ سے اور ابو عبیدہ سے توقع کرتے تھے کہ ہم پڑھ کر تم سے تبصرہ کریں اور اپنی رائے دیں اور جب تم ہماری رائے سے اختلاف کرتے اور ہمارے پاس اختلاف کا جواب نہ ہوتا تو تمہارا چہرہ خوشی سے لال چقندر ہو جاتا تھا اور میرا خیال ہے تم صرف ہمیں لاجواب کرنے کے لیے کتابیں لا لا کر دیتے تھے۔ تم تو خود اچھے خاصے اسکالر ہو۔۔۔۔۔۔ پھر میں حیران ہوں کہ تم نے مجھ سے یہ ڈھیر سارے سوال کیوں کیے

ہیں ۔تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ یہ فدائی آخر کیا چیز ہیں اور یہ خود کش حملے کیا ہیں۔۔۔۔۔تم نے انہیں فضول کہا ہے اور ایسا کرنے والوں کو احمق اعظم قرار دیا ہے میں تمہاری رائے پر کیا رائے دوں۔ ہاں تمہاری معلومات کے لیے تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ ایک جن کی تکنیک ہے اور اسے انجینئر یحیٰ عباس نے متعارف کروایا تھا جسے یہودی پولیس ہزار چہروں والا آدمی کہتے تھے۔۔۔۔۔اور یہ وہ تکنیک ہے جس نے فلسطین میں یہودیوں کو ہی نہیں، عراق میں تم لوگوں کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ خود کش حملوں کے متعلق وہاں نیویارک میں میری اور ابوعبیدہ کی تم سے کافی بحث ہو چکی ہے۔ یاد ہے نا تمہیں جب ابوعبیدہ نے کہا تھا کہ وہ ''حماس'' میں شامل ہو کر ایک روز کسی خود کش حملے میں خود کو ختم کر لے گا اپنے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان کا نذرانہ دے دے گا۔تم نے ابوعبیدہ کو کتنا سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس طرح کا ارادہ ترک کر دے، تمہارے نزدیک تب بھی یہ نہایت احمقانہ بات تھی لیکن جانِ عزیز! اسے سمجھنا تمہارے لیے ممکن نہیں ہے کیوں کہ تم ہر بات عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہو اور یہ عشق کا معاملہ ہے اور نیت کا کھیل ہے۔اسے سمجھنے کے لیے دل کا ہونا ضروری ہے جو تمہارے پاس نہیں۔ وہ تو نہ جانے اب تک تم کس کس کو دے چکے ہو۔ لیزا، جینفر، جسین، فینی کو تو میں بھی جانتا ہوں۔۔۔۔۔خیر یہ تو مذاق کی بات تھی حقیقت یہ ہے ڈیر نِک کہ یہ جذبوں کی بات ہے۔

جب آدمی کے پاس کوئی راستہ نہ ہو، اور جب امید کی لو بھڑک بھڑک کر بجھتی ہو، اور جب چاروں طرف سے کوئی بھی پیامبر ہوا مدد کا سندیسہ نہ لاتی ہو۔۔۔۔۔ جب زنجیریں پاؤں میں چبھتی ہوں۔۔۔۔۔اور آنکھیں لہو روتی ہوں اور زمین فریاد کرتی ہو۔

کہیں کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا ہو۔

اور اپنی جان بیکار دکھتی ہو۔۔۔۔۔ تو بس ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔اور وہ ہے اپنی جان فدا کرنا۔۔۔۔۔اپنے وطن اور اپنے لوگوں کے لیے۔۔۔۔۔یعنی تمہاری زبان میں۔

It is not to question why?

It is but to do and die.

یاد ہے نا تم اکثر مجھے یہی کہا کرتے تھے۔

جب کبھی تم پر لنڈا کی وکالت کا بھوت سوار ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج لنڈا اتنی یاد آ رہی ہے حالانکہ وہاں تو میں ہمیشہ اس سے بھاگنے کی فکر میں رہتا تھا۔ یار! جب وہ ہونٹ گول گول کر کے مجھے ''عبڈ ڑامان' کہہ کر بلاتی تھی نا' سچ بتاؤں میرا دل تو جیسے پہلو سے نکل کر اس کے قدموں پر فدا ہو جاتا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے بازوؤں میں لے کر گھما دوں اور وہ یونہی اپنے ہونٹ گول گول کر کے مجھے عبڈ ڑامان کہہ کر بلاتی رہے اور میں تمہاری طرح ہر طرف سے بے خواب ہو کر اسے۔۔۔۔۔اور تمہیں تو کبھی کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی تھی، جب دل میں'' ''میرا اماں'' کا رہنے والا عبدالرحمٰن' پیدائشی جھینپو تھا' جسے تم میری حد سے بڑھی ہوئی شرافت سمجھتے تھے' وہ دراصل میرا بدھو پن اور میری جھجک اور شرم و حیا تھی ۔ پھر اماں کی قسم اور ابا کی نصیحتیں اور مولوی صاحب کا محرم و نامحرم کا درس۔۔۔۔۔یہ سب میرے دشمن بنے میرے اندر چھپے بیٹھے تھے اور میں لنڈا سے کبھی نہ کہہ سکا کہ وہ مجھے اچھی لگتی ہے اور۔۔۔۔ سچ بتاؤں نِک ڈیئر' آج کل جب میں بستر پر لیٹتا ہوں نا تو اکثر مجھے بڑا پچھتاوا ہوتا ہے کہ لو میں بھی کتنا جھینپو تھا۔ کتنے مواقع ملے تھے۔۔۔۔۔اور جب۔۔۔۔۔اور جب۔۔۔۔۔اور کتنے ہی جب ہیں جنہیں سوچ سوچ کر میں پچھتاتا ہوں' نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہوں۔

دیکھو بات کہاں سے کہاں نکل گئی' میں تمہیں فدائی حملوں کے متعلق بتا رہا تھا بلکہ میں کیا بتاؤں گا میں تو خود کم علم سا شخص ہوں۔ پتا ہے نِک جیسن! بہت دن پہلے جب ابو عبیدہ نے خط لکھا تھا مجھے اور حماس میں شمولیت کی خبر دی تھی تو اس نے لکھا تھا۔

موت کیسے اچھی لگتی ہے

لیکن ہمیں

کیوں کہ زندگی ہمارے لیے

موت سے بدتر ہے

ہم ہر روز اپنے سامنے

اپنے بچوں کو' اپنے بھائیوں کو

اپنے جوانوں کو

مرتے اور خون میں لت پت ہوتے

دیکھتے ہیں
اور ہم سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کر سکتے
ہم بے گھر بے در لوگ
ہمارے گھر اور ہماری زمین
دوسروں کے قبضے میں ہے
یہ بے گھری کا دکھ
ہم کس سے کہیں
کون ہے جو ہمارا درد جان سکے
سو ہم نے خود ہی اپنے سروں سے کفن باندھ لیے ہیں
کہ شاید اس طرح اپنی جان دے کر
ہم آزادی حاصل کر لیں
یا آزادی نہیں تو عزت کی موت
لوگ بھلے اسے کچھ بھی کہیں
لیکن ہم اسے شہادت کہتے ہیں
اور نیتوں کا حال جاننے والا ہمارا رب
بہتر جانتا ہے
کہ اب ہمارے پاس
یہی آخری رستہ بچا ہے

تو جان من' ابوعبیدہ کی یہ نظم پڑھ کر خود ہی اخذ کر لو جو کر سکتے ہو۔ میں جاہل بھلا تمہیں کیا سمجھاؤں گا اور کیا سمجھا سکتا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ ہماری مثلث کا تیسرا خط یعنی ابوعبیدہ کہاں ہے' زندہ بھی ہے یا اپنے کاز کے لیے خود کو قربان کر چکا۔ ایک بار میں نے اس سے کہا تھا' یار اگر یہ عرب ممالک یورپی ممالک کا تیل بند کر دیں تو یہودی۔۔۔۔ لیکن پتا ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا تھا۔ سب بے فائدہ ہے اب۔۔۔۔ عرب اتنے بے بس ہو چکے ہیں کہ کچھ نہیں کر سکتے۔ پیرس میں شانزے لیزے میں 90 فیصد عمارتیں عربوں کی ملکیت ہیں اور مضافات میں ہزاروں ایکڑ زمین پر ان

کے محلات ہیں۔ برطانیہ کے شراب خانوں' کلبوں اور جواء خانوں میں 73 فیصد عربوں کا حصہ ہے اور امریکا میں ان کی سرمایہ کاری تین لاکھ کھرب ڈالر سے زیادہ ہے' پھر بھلا وہ عربوں کا تیل بند کر کے اس دولت سے کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دراصل یہ سارا جھگڑا ہی تو تیل کا ہے۔ نہ تمہارے لوگ یہ کیلکولیٹ کرتے کہ عراق وہ واحد ملک ہے جو تیل کی پیداوار میں اضافہ کر سکتا ہے اور نہ عراق پر بے جواز حملہ کیا جاتا۔ دیکھو نہ وہ کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحہ تو کہیں سے برآمد نہ ہو سکا جس کا الزام لگایا جاتا تھا کہ صدام پینتالیس منٹ کے نوٹس پر اس اسلحہ سے تباہی مچا سکتا ہے۔ سچ بتاؤ اب یہ تباہی کون مچا رہا ہے؟ افغانستان میں جو تابکار بم پھینکے گئے' ان کے اثرات کا احوال تو ضرور تم نے کسی نہ کسی ٹی وی چینل پر دیکھا ہو گا۔ یا اگر کسی چینل پر اس کے متعلق رپورٹ نہیں دکھائی تو کسی نہ کسی اخبار یا میگزین میں ضرور چھپی ہو گی کہ یہ رپورٹیں تیار کرنے والے بھی تو تمہارے ہی لوگ ہیں لیکن اللہ نے ان کے قلم کو سچ کی طاقت عطا فرمائی ہے۔۔۔۔۔ تم نے اس پر سخت احتجاج کیا ہے کہ عراقیوں نے جن پانچ امریکی فوجیوں کو گرفتار کیا تھا' انہیں ٹی وی پر کیوں دکھایا ہے یہ بین الاقوامی قوانین اور بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔۔۔ میرے یار' ان بموں کے متعلق تم کیا کہو گے' کیا یہ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی نہیں؟ صرف افغانی ہی کے تابکاری اثرات سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ نئے پیدا ہونے والے بچے بھی معذور پیدا ہو رہے ہیں۔ چند دن قبل میں نے ایک اخبار میں ایک بچے کی تصویر دیکھی تھی جسے پیدا ہوئے چند گھنٹے ہوئے تھے اور جس کی آنکھیں ڈھیلوں سے باہر لٹک رہی تھیں۔ یقین کرو دو تین راتیں تو میں سوتے میں چیخ مار کر جاگ اٹھتا اور ابھی افغانی مائیں نہ جانے کتنی مدت تک ایسے ہی بچے پیدا کرتی رہیں گی۔ ہاتھ پاؤں سے معذور بچے۔۔۔۔ خیر تم تو چونکہ اسے دہشت گردی کے خلاف جنگ کہتے ہو اور اس جنگ میں ہر طرح سے بین الاقوامی قوانین کی دھجیاں اڑانا جائز سمجھتے ہو' سو کیا کہوں۔ مجھے تو تمہارے اس فخر پر حیرت ہوتی ہے جو تم کر رہے ہو کہ ہم تمہارے افغانستان کو ترقی کی طرف گامزن کر رہے ہیں اور عورتوں کو ان کے حقوق دلا رہے ہو۔۔۔۔ ایک بات کہوں یار' جتنے حقوق اسلام نے عورت کو دیے ہیں اتنے حقوق تمہارا وہ مادر پدر آزاد معاشرہ نہیں دیتا۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تمہارے اس نیویارک سٹی میں کتنی عورتیں ہیں جو اپنے خاوندوں سے پٹتی ہیں۔ کتنی عورتیں

ہیں جو شادی کر کے گھر بنانے کی خواہش میں مری جا رہی ہیں اور اس چکر میں بے چاری ایشیائی مردوں کو گھیرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ خود مجھے لنڈا کے علاوہ کتنی عورتوں نے گھیرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔۔ وہ بوڑھی لارا جس نے مجھے پیپر میرج کے چکر میں پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ اب کیا بتاؤں کتنی مشکل سے چھٹکارا پایا تھا میں نے اس سے اور کتنی عورتیں ہیں جو منشیات فروشوں کے چنگل میں پھنس کر ان کے اشاروں پر چلتی ہیں اور کتنی عورتیں بھوک مٹانے کے لیے۔ چھوڑو یار۔۔۔۔۔۔۔ 'تم مسلمان عورت پر ترس مت کھاؤ! دنیا کی خوش قسمت ترین عورت ہے مسلمان عورت۔ یاد ہے نا تمہیں' برمنگھم کی رہنے والی وہ خوبصورت Prostitute جو ایک بار ہمیں جرمنی میں ملی تھی۔ جہاں ہم چھٹیاں Spend کرنے گئے تھے۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ تین بار ماں بن چکی ہے۔ پہلا بیٹا جوزف کا باپ ایک کالا امریکی تھا۔ دوسرے بیٹے کا باپ ایک برطانوی۔۔۔۔۔۔ اور تیسرے بیٹے کا باپ بھی ایک کالا ہی تھا۔ لیکن تینوں بچوں کو حکومت نے لے کر کسی اور کے حوالے کر دیا۔ پہلا بیٹا ایک کالی سنگل ویمن کو دے دیا۔ دوسرا ایک برطانوی جوڑے کو یہ کہہ کر کہ میں کم آمدنی کی وجہ سے بچے کی صحیح پرورش نہیں کر سکتی۔ لیکن میں ایک بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں اور اس کی پرورش کرنا چاہتی ہوں پالنا چاہتی ہوں۔ اس لیے میں پھر بچہ پیدا کروں گی۔

''اور پھر سوشل ویلفیئر والے وہ بچہ لے جائیں گے۔''

تم نے کہا تھا اسے اور یاد ہے اس نے کیا جواب دیا تھا کہ میں بچے پیدا کرتی رہوں گی اس وقت تک جب تک وہ میرا بچہ میرے اپنے پاس نہیں رہنے دیں گے۔

اور پھر یاد ہے نا تمہیں' وہ خوفزدہ بچی۔۔۔۔۔۔ خیر چھوڑو تمہارے ہاں تو عورت اپنے گھر میں ہی محفوظ نہیں ہے اور تم ترس کھا رہے ہو افغانی عورت اور مسلمان عورت پر۔۔۔۔۔۔ اور انہیں حقوق دلانا چاہتے ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ تم مسلمان مرد اپنی عورتوں کو دبا کر رکھتے ہو۔۔۔۔۔۔ چھوڑو یار اب اندر کی بات ہے' تمہیں کیا بتاؤں' میرے بابا کہتے ہیں ہمارے ہاں 99 پرسنٹ عورتیں مردوں کو دبا کر رکھتی ہیں اور باقی رہیں ایک فیصد' تو وہ جھوٹ بولتی ہیں۔ میں تو اپنے ہاں عورتوں کا مردوں پر اتنا ہولڈ دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ شادی ہی نہ کروں لیکن میری اماں کا کہنا ہے اب

تو تجھے شادی کیے بغیر امریکا نہ جانے دوں گی اور یہ جو میری اماں ہے نا' بات کی بڑی پکی ہے' جو کہتی ہے کر کے دکھاتی ہے۔ کہنے کو چھوٹے سے گاؤں کی سادہ سی عورت ہے لیکن اندر کی بات بتاؤں' میرے ابا پر بھی اماں کا ہی ہولڈ ہے' کیا مجال کہ اماں کی مرضی کے بغیر ابا کچھ کر سکیں۔ میری شادی ہی کی بات لے لو' ابا کی بڑی خواہش تھی کہ میں تایا کی بیٹی سے شادی کر لوں لیکن اماں نے پہلے ہی روز کہہ دیا تھا کہ وہ میری شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کرے گی اور کامیابی اماں کو ہی ہوئی۔ اب تم یقیناً جاننا چاہو گے نا کہ وہ کیسی ہے؟ بس ٹھیک ہے۔ لنڈا جیسی تو نہیں لیکن پڑھی لکھی ہے۔ مگر اماں کی طرح ضدی ہے۔ اپنی پھوپھی پر گئی ہے۔ اخباروں میں مضمون لکھنے کا بہت شوق ہے اسے' اور الٹی سیدھی باتیں لکھتی رہتی ہے' کئی بار اسے سمجھا چکا ہوں کہ ہر بات لکھنے کی نہیں ہوتی' کہیں ایسا نہ ہو صبح اٹھو تو پتا چلے کہ ایف بی آئی والے اسے القاعدہ کا ممبر ہونے کے شبے میں پکڑ کر لے گئے ہیں۔ کبھی اسے افغانستان کا غم لگ جاتا ہے' کبھی عراق کا' کبھی فلسطین میں خودکش حملے میں مرنے والوں کی حمایت میں لمبے لمبے مضمون لکھنا شروع کر دیتی ہے۔۔۔۔ لیکن مجال ہے کہ اس کے کان پر جوں تک رینگے۔ ابھی پچھلے دنوں اس نے عراق میں گرفتار ہونے والے پاکستانی نوجوانوں کے متعلق یہ لمبا چوڑا مضمون لکھا اور خیال ظاہر کیا کہ یہ پاکستانی ضرور امریکیوں کے ایجنٹ اور مخبر ہوں گے۔ بڑی آئی کہیں کی تبصرہ نگار اور تجزیہ نگار۔۔۔۔۔۔ سارا پاکستان تو بے چارے جوانوں کی حمایت میں منتیں کر رہا ہے مع حکومت کے' اللہ کے نام پر اور مذہب کے نام پر انہیں چھوڑ دیا جائے اور وہ سیاست دان کی بچی لکھ رہی تھی کہ گو اس کا امکان چند فی صد ہی کیوں نہ ہو کہ وہ امریکیوں کے دوست ہیں' پھر بھی وہ پاکستانی ہیں اور ہمیں فوراً اعلان کر دینا چاہیے کہ ہم اپنی فوج عراق نہیں بھیج رہے۔ آخر ہم سب بھی تو امریکا کے دوست ہی ہیں۔ پھر دوستی کی سزا صرف انہیں اور ان کے معصوم بچوں کو ہی کیوں ملے۔ ہے نا۔۔۔۔۔ پاگل۔۔۔۔۔۔ میرا مستقبل خاصا مخدوش ہے یار! میرے لیے دعا ضرور کرنا۔ اسے تو ہر ایک سے پنگا لینے کی عادت سی ہو گئی ہے' ابھی پچھلے دنوں اسے ٹی وی والوں کی اردو سنوارنے کا شوق چڑھا ہوا تھا' جنہوں نے انڈین چینلز سے متاثر ہو کر اپنی اچھی خاصی اردو کو خراب کر لیا ہے۔ اور کوئی انہیں بتاتا نہیں ہے کہ بھئی وہاں گر غ کو گھ اور خ کو کھ بولتے ہیں تو یہ ان کی مجبوری ہے لیکن انہوں نے محض نقالی کے شوق میں کہ شاید یہ بھی ایک ادا ہے' اسے اپنا بنا لیا حتیٰ کہ ٹی وی پر خبریں پڑھنے والوں نے بھی خبریں کو کھبریں کہنا شروع کر دیا ہے۔ ابھی

کچھ دیر پہلے ایک پاکستانی چینل پر اناؤنسر بتا رہی تھی کہ موسم کی کھرابی کی وجہ سے ہم آپ کو یہ میچ نہیں دکھا سکے۔۔۔۔اس میں ہماری کھلطی (غلطی) ہرگز نہیں ہے بلکہ یہ تو موسم کا قصور ہے۔''

مضامین پر مضامین لکھے جا رہے تھے لیکن جس اخبار کو بھی اس نے یہ مضمون بھیجا' انہوں نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ محترمہ ایف اے پاس بی بی صاحبہ! کہ یہ آپ کن کی زبان سنوارنے چلی ہیں جن سے ہم خود اپنی اردو صحیح کرتے ہیں۔اس نے مجھ سے اخبار والوں کا گلہ کیا اور میں نے کہا' مجھے بڑی کھوشی (خوشی) ہوئی ہے کہ انہوں نے تمہارا مضمون واپس کر دیا۔کم از کم تم فضول مضامین لکھنے سے باز آ جاؤ گی۔لیکن اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور پیر پٹخ کر جانے لگی تو میں نے روکا۔

''اتنا گھصہ (غصہ) کس بات کا ہے؟''

جواباً اس نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورا تو مجھے اس کے غصے کا سبب معلوم ہو گیا

یار کیا کروں' میں بھی تو فارغ وقت میں کیبل لگائے انڈین چینلز دیکھتا رہتا ہوں تو کچھ نہ کچھ اثر تو ہونا ہی ہے۔یار ویسے میڈیا میں بڑی طاقت ہے۔آدمی آدھی جنگ تو میڈیا کے ذریعے سے ہی جیت جاتا ہے۔

تم نے لکھا ہے کہ یہ ایک دوستانہ سا خط ہے لہٰذا میں تمہاری کسی بھی بات کا برا نہ مناؤں' تو جانِ من! میں نے تمہاری کسی بات کا برا نہیں منایا۔تم نے میرے ملک کی خارجہ و داخلہ پالیسی پر جو تنقید کی ہے' نہ اس پر نہ تمہاری اس بات پر کہ ہم مسلمان دہشت گرد ہیں یار برا منا ہی نہیں سکتا' ایک تو تم میرے جگری دوست ہو' دوسرے امریکن ہو۔دوستی کی تو خیر ہے لیکن۔۔۔۔یہ الگ بات ہے۔ہم کچھ بھی کر لیں' تم ہماری دوستی کا یقین نہیں کرتے ہو۔ ہمیشہ شک میں مبتلا ہو کر کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ہو۔اب دیکھو نہ تمہارے مطلوبہ دہشت پسندوں کی تلاش میں ہم کیا کچھ نہیں کر رہے ہیں۔باری تعالیٰ نے صحیح فرمایا ہے کہ ''یہود ونصاریٰ تمہارے کبھی دوست نہیں ہو سکتے''۔پھر بھی ہم اس دوستی کو اپنانے کے لیے کیا کچھ نہیں کر رہے ہے۔یاد آ رہا ہے کچھ دن پہلے نہیں بلکہ سال بھر پہلے' تمہارے فوجیوں نے فرینڈلی فائر کیا تھا جس میں کچھ لوگ مارے گئے تھے۔شاید عراق کی جنگ سے پہلے کی بات ہے یا پھر بعد کی۔میری یادداشت کچھ کچھ کمزور ہو گئی ہے نا تو بس مجھے یہ تمہارا خط فرینڈلی فائر جیسا ہی لگا' سو اگر تمہاری کوئی بات تکلیف دہ بھی ہے تو کوئی بات نہیں۔حالانکہ کوئی ایک نہیں

کئی باتیں ہیں۔۔۔۔مثلاً تم نے ہم پاکستانیوں کو لالچی' خود غرض' مفاد پرست اور جانے کیا کیا کچھ کہا ہے لیکن کوئی بات نہیں! دوستی میں تو بندہ سب کچھ ہی کہہ سکتا ہے نا اور میرے اس خط میں بھی کوئی بات تمہیں تکلیف دے تو برا نہ منانا یار۔بس اس خط کو بھی ''فرینڈلی فائر'' ہی سمجھ لینا۔ہاں' ایک خاص بات تو تمہیں بتانا بھول ہی گیا ہوں۔تمہارے سفارت خانے نے مجھے میرا پاسپورٹ واپس کر دیا ہے اور کلیرنس بھی دے دی ہے۔یار میں تو مایوس ہی ہو گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں مجھے اسامہ بن لادن کا کوئی فدائی ہی تو نہیں سمجھ لیا گیا جو میرا پاسپورٹ ہی رکھ لیا تھا انہوں نے۔۔۔۔اچھی طرح کھنگال کر واپس بھجوا دیا ہے۔بس اسی چکر میں تمہارا خط ادھورا رہ گیا تھا۔ ٹکٹ لینے' سیٹ ابھی کنفرم نہیں ہے' کنفرم ہونے کے بعد تمہیں اطلاع دے دوں گا۔شکر ہے سوہنے رب کا جس نے کرم کیا۔پانچ سال کا ملٹی پلز ویزا لگ گیا ہے۔میں نے بھی منت مانی تھی کہ داتا دربار پر دیگ چڑھا دوں گا۔۔۔۔اگر ویزا لگ گیا تو۔۔۔۔جانے کیا رکاوٹ پڑ گئی تھی۔خیر شکر ہے اب تو۔سنا ہے امریکا میں بھی بے روزگاری بہت بڑھ گئی ہے اور معاشی حالات عراق جنگ کی وجہ سے کافی خراب ہیں لیکن میرا خیال ہے مجھے تو وہیں جاب مل جائے گی نا' اسی کمپنی میں۔۔۔۔تم ہو نا اس کمپنی میں' اتنے بڑے عہدے پر۔۔۔۔اتنی تنخواہ پر نہ سہی' کچھ کم ہی سہی لیکن یار ڈالروں کو جب روپے میں تبدیل کرتے ہیں نا تو۔۔۔۔کیا بتاؤں میں کتنا خوش ہوتا ہوں امریکا جانا' وہاں رہنا۔۔۔۔میں نے تو سوچ لیا ہے۔وہیں سیٹل ہو جاؤں گا یہاں کیا رکھا ہے' کیا خبر کب۔۔۔۔

یار سچ تو یہ ہے کہ میں کبھی امریکا سے نفرت کر ہی نہیں سکتا۔یہ تو بس میں نے یوں ہی ادھر ادھر کی ہانک دی ہے۔ہاں لنڈا کو بتا دینا میرے متعلق اور اس سے پوچھنا کہ کیا واشنگٹن میں مارچ میں چیری کے درختوں پر شگوفے کھلے تھے؟ اور پلیز' اپنا دل میرے متعلق صاف کر لو۔دیکھو ہم سب پاکستانی تہہ دل سے تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔زمین کی تہہ میں بھی اگر کوئی دہشت گرد چھپا ہے تو ہم اسے کھود کر نکال لیں گے۔بھلے ہمارے اپنوں کی جانیں چلی جائیں۔۔۔۔آخر محبت اور دوستی میں قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے نا جیسے اب میری بیوی دے گی۔۔۔۔میرے ساتھ امریکا میں رہ کر۔۔۔۔حالانکہ اس نے عراق افغانستان کے خلاف بڑے بڑے مضامین لکھے ہیں اخباروں میں۔۔۔۔

اور ہاں یاد آیا' تم نے لکھا ہے کہ ہمیں ایسی ٹیکنالوجی دوسرے ملکوں کو منتقل نہیں

کرنا چاہیے تھی۔ یار نِک جیسن !ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ یورپی ممالک نے
تمام یورپی ملکوں کو ایٹمی ٹیکنالوجی سے باہم تعاون کے ذریعے مالا مال کر دیا۔حتیٰ کہ بھارت
کو بھی ـــــ لیکن بے چارے ہم' ہمیں پابند کر دیا گیا حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان
بھی باہم ٹرانسفر کر کے آٹھ دس مسلمان ملکوں کو مزید مسلح کر دیتے اس ٹیکنالوجی
سے ـــــ لیکن ہمیں یہ حق حاصل نہیں۔اب تم الزام لگا رہے ہو کہ ہم نے ایسا کیا حالانکہ
ہم تمہاری ناراضگی مول لے کر ایسا کرنے کی کوشش کیوں کرتے۔دراصل تمہیں غصہ تو اس
بات پر ہے نا کہ قدیر خان نے کیوں ہمیں ایٹمی طاقت بنایا۔ــــــ صدام حسین نے بھی
تو کوشش کی تھی' اس نے بھی تو جدید ترین ری ایکٹر حاصل کر کے یہ صلاحیت حاصل کر لی تھی
کہ وہ ہیروشیما پر گرائے جانے والے ایٹم بم کی طاقت جیسا ایٹم بم بنا سکے لیکن اس بے
چارے کا کیا حشر ہوا؟ پتا نہیں ہماری قسمت اچھی تھی کہ ہم بچ گئے ـــــ یا پتا نہیں بچے
بھی ہیں یا ـــــ رہی عبدالقدیر خان کی بات اور ان پر لگائے گئے الزامات کی' تو میرے
بھائی میں کیا جانوں' میں تو عبدالقدیر کے متعلق اتنا ہی جانتا ہوں کہ اس نے ایٹم بم بنایا۔
اب مجھے کیا خبر کہ اس نے کہاں کہاں اور کن کن ملکوں کو ـــــ اور یہ کہ وہ کہاں ہے؟ اور
کیا یہ سچ ہے کہ اس نے ـــــ بھئی یہ بات تو تم لوگ ہی بتا سکتے ہو کہ کیا سچ ہے اور کیا
نہیں ـــــ بھئی مجھے سیاسی باتوں سے کیا لینا دینا ـــــ اور مجھے عراق و
افغانستان سے کیا لینا' میں بھی یونہی تمہارے سوالوں کے جواب دینے میں لگ گیا۔انگلش
B کے پیپر کی طرح آتا جاتا تو کچھ نہیں بس یوں ہی امتحانی کاپی بھر دی ہے۔

میں تو آج بہت خوش ہوں اور اسی خوشی میں' میں نے تمہاری ساری گالیوں کو جو تم
نے ورلڈ سینٹر کی تباہی کے بعد مجھے دی تھیں اور جو میرے سینے میں کھدی تھیں' معاف کر دیا
ہے۔یار! بڑی ٹینشن میں تھا آٹھ نو ماہ سے کہ پتا نہیں اب امریکا جا سکوں گا یا نہیں۔تھینک
گاڈ!

لنڈا کو میرا ضرور بتا دینا ـــــ اور یہ بھی کہ میں اتنی موٹی عقل والا نہیں رہا
اور یہ کہ اب میں ـــــ پچھتانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا ـــــ اور سنو میری جاب کے
لیے مسٹر جانسن سے ضرور بات کر کے رکھنا۔انشاء اللہ جلد ملاقات ہوگی اور باقی باتیں ملنے
پر ـــــ

تمہارا عبدالرحمٰن

لاینحل

''آخر تمہارا مسئلہ کیا ہے حبیب۔''

''ابھی ابھی زریں نے مجھ سے پوچھا ہے اور پھر بے حد غصے اور ناراضگی سے
مجھے دیکھتی بار بار اپنے جوڑے کے بل کھولتی اور بند کرتی ہوئی وہ کمرے سے باہر نکل گئی ہے
اور میں ہلتے پردے کو دیکھ رہا ہوں کہ میں ـــــ میں کیسے بتاؤں کیسے سمجھاؤں کہ
میرا مسئلہ کیا ہے اور اگر بتا بھی دوں تو مجھے یقین ہے کوئی بھی میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکے گا۔نہ ہانی
نہ ٹمی نہ ماموں اور نہ ہی زریں۔

زریں جو میری بیوی ہے میری جلوت و خلوت کی ساتھی جسے مجھے سمجھنے کا بہت
دعویٰ ہے۔

لیکن اٹھائیس برسوں کی رفاقت کے باوجود وہ میرا مسئلہ نہیں سمجھ رہی یا سمجھنا نہیں
چاہتی۔تب ہی تو میری پروا کیے بغیر وہ باہر چلی گئی ہے۔باہر جہاں گلاب سنگھ ہے۔
جہاں ٹمی ہے بالکل اس کے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی تھوڑا سا آگے کو جھکی

مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی اور اس کی آنکھوں میں ستاروں کی سی جگمگاہٹ ہے اور ہونٹوں پر رہ رہ کر کلیاں چٹکانے لگتیں ہیں۔

اس لئے کہ وہ میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکتی تب ہی تو اس کی آنکھوں میں تمسخر تھا۔ ترس تھا ہمدردی اور جانے کیا کیا۔ بلکہ پچھلے دو تین سالوں سے مجھے ہانی، ٹمی اور مامون کی آنکھوں میں بھی اپنے لئے ایسا ہی رحم نظر آتا ہے۔ بلکہ ہانی نے تو دو تین بار مجھ سے پوچھا بھی ہے۔

''ڈیڈ آپ کو کیا پرابلم ہے؟''

اور میں صرف اسے دیکھ کر رہ گیا اس لئے کہ وہ میرے پرابلم میری اذیت اور میرے کرب کو نہیں جان سکتے۔ اس لئے تو میں پاکستان جانا چاہتا ہوں۔ سب کو ساتھ لے کر زریں اور ٹمی کو ہانی اور مامون کو۔ لیکن کوئی بھی میرے ساتھ جانے کو تیار نہیں۔

''تمہیں وطن سے محبت کا بخار چڑھا ہے تو تم ہو آؤ اکیلے۔''

زریں نے صاف انکار کر دیا ہے۔

لیکن میں اکیلا تو نہیں جانا چاہتا۔ ہانی اور مانی نہ سہی لیکن زریں اور ٹمی کو تو ضرور ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں زریں کو کیسے اپنا نقطہ نظر سمجھاؤں۔ اٹھائیس سال پہلے زریں کے والد نے ہی مجھے یہاں بلایا اور سیٹل کیا تھا۔

تب میں بہت پرجوش تھا خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوا اتنا زیادہ کہ میں نے ماں کی نم آنکھوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا اور اس بوڑھے لرزیدہ وجود کی طرف بھی نہیں دیکھا تھا جو سہارے کے باوجود ہولے ہولے لرز رہا تھا حالانکہ اس نے اس سیاہ آہنی گیٹ کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا جس میں ستائیس سال پہلے مجھے اپنے سینے سے لپٹائے وہ داخل ہوئی تھی اور پھر وہیں نڈھال ہو کر بیٹھ گئی تھی اور گیٹ سے ٹیک لگا لی تھی تب اندر سے عقیل ماموں باہر نکلے تھے اور انہوں نے اسے پہچان کر گلے لگا لیا تھا۔

''بھائی!''

گلے لگتے ہی جانے کب کے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے اور پھر آنسو چیخوں میں بدل گئے تھے۔

سب چلے گئے۔ ایک ایک کر کے سب۔ سب کی بے گور و کفن لاشیں چھوڑ آئی

ہوں۔

''آزادی خون مانگتی ہے آپا اور تم نے بھی آزادی کی مانگ میں اپنے پیاروں کے خون سے سیندور بھرا ہے اور پھر یہ ہے نا حبیب تیرا سہارا۔ وہ بھی تو ہیں جن کا کوئی نہیں بچا۔''

ادھر پھر عقیل ماموں ہمیں لپٹائے لپٹائے اندر لے گئے تھے اور آن واحد میں اس سیاہ گیٹ والے بڑے سے گھر میں ہنگامہ مچ گیا تھا۔

''عاشی زندہ ہے۔ حبیب بھی ہے۔''

اور میرے حافظے میں ہر منظر پتا نہیں کیوں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ زندہ ہے۔ حالانکہ تب میری عمر صرف چار سال کی تھی۔ لیکن ماں نے ہر رات مجھے اپنے پاس لٹا کر ہر بات اتنی بار بتائی ہے۔ کہ ساری باتیں ذہن کی تختی پر منجمد ہو گئی ہیں جیسے ہر منظر میں میں موجود تھا جیسے سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مشرقی پنجاب کے اس چھوٹے سے گاؤں میں جس میں تقریباً پچاس گھر مسلمانوں کے تھے اور صرف دس بارہ گھر سکھوں اور ہندوؤں کے تھے اس گاؤں کے ہر گلی کوچے کھیت کھلیان کنویں سب میرے لئے کتنے اپنے تھے۔ کتنے جانے پہچانے جیسے وہ ہمیشہ ان میں پھرتا رہا ہو۔ نہر والا امرودوں کا باغ، ملک احمد کا کنواں، اسٹیشن، اسٹیشن سے ادھر پولیس چوکی اور نور خان بزاز کی دکان سے پیچھے چھوٹی سی ڈسپنسری اور ڈسپنسری سے بائیں طرف مسجد جس میں میاں جی صبح سویرے اٹھ کر جھاڑو دیتے تھے۔ میاں جی جو بڑے زمیندار ہی نہ تھے اپنی دینداری کی وجہ سے بھی علاقے کے لوگوں میں معزز گردانے جاتے تھے اور مسلمان ہی نہیں ہندو سکھ بھی اپنی مشکلات اور مسائل لے کر انہی کے پاس آتے تھے۔ وہی میاں جی اس صبح جب صبح سویرے مسجد میں جھاڑو دینے کیلئے گئے تو پھر واپس نہ آئے حالانکہ ماں جی نے کتنا منع کیا تھا۔

''میاں جی اتنے سویرے نہ نکلیں۔ جب سے اسٹیشن کے عملے اور پولیس چوکی کے مسلمان عملے کی جگہ سکھ عملہ آ گیا ہے میرا دل ہولتا رہتا ہے۔''

''ارے کچھ نہیں ہوتا۔ مسجد میں جھاڑو نہیں دوں گا تو بے سکون رہوں گا۔ بڑا سکون ملتا ہے تو نہیں جانتی۔''

"پر مدن کہہ رہا تھا ڈسپنسری سے بھی مسلمان ڈاکٹر چلا گیا ہے اور وہاں کل اس نے دس بارہ سکھوں کو بیٹھے دیکھا تھا۔"

پر میاں جی کو تو علاقے کے ہندوؤں، سکھوں پر بڑا اعتماد تھا۔ جب جورا قصائی اور فتح دین روتے پیٹتے حویلی کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے تو ماں جی کا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔ اور پھر حویلی میں سب جمع ہو گئے اور باہر گلیوں میں سکھوں کے جھتے مونچھوں پر بل دے دے کر مسکراتے رہے۔ کہ انہیں خطرہ صرف میاں جی سے ہی تھا اور ابھی میاں جی کو گزرے چار دن بھی نہ ہوئے تھے اور گاؤں کے ہندو گھرانے اور سکھ گھرانوں کی عورتیں اور مرد ماں جی کے پاس آ آ کر افسوس کر رہی تھیں اور حوصلہ اور تسلیاں دے رہی تھیں کہ تیرہ اگست کی رات ایک دم ہی گلیوں میں شور بلند ہوا اس کے ساتھ نعرے اور ہنگامہ بھی۔

ماں جی ابھی سہمی سہمی سی کھڑی تھیں کہ مدن بھائی نے اٹھارہ چودہ اور گیارہ سالہ شہزادوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر صحن میں رکھ دیں جنہیں صبح کے وقت باہر گلی میں کرن سنگھ نے مار ڈالا تھا اور لالٹین کی مدھم سی روشنی میں سر جھکائے جھکائے کہا تھا۔

"آپا جی رات گاؤں پر بھرپور حملہ ہو گا۔ آپ جلدی کاکے کو ساتھ لے کر۔۔۔۔۔۔۔۔"

اور ماں جی نے اپنے شہزادوں پر ایک نظر ڈال کر اور ان کی روشن پیشانیوں کو چوم کر چادر اوڑھی تھی اور مدن بھائی نے سوئے ہوئے حبیب کو اٹھایا تھا اور رات کی تاریکی میں گنے کے کھیتوں میں سے چھپتے چھپاتے وہ گاؤں سے ہجرت کرنے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ آ ملے تھے اور پھر مجھے ان کے حوالے کر کے مدن بھائی نے واپسی کی راہ لی تھی۔

اور ماں جی نے تڑپ کر پوچھا تھا۔

"مدن بھائی! اس مشکل میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو۔"

تو مدن بھائی نے سر جھکائے جھکائے کہا تھا۔

"بڑے بھیا اور چھوٹے بھیا کی لاشیں بے گوروکفن پڑی ہیں۔ دفنا کر لوٹ آؤں گا اور اپنے منے میاں تو اتنے نازک بدن تھے۔ سخت زمین پر لیٹے لیٹے ان کا بدن دکھنے لگا ہو گا۔ بس گیا اور آیا۔۔۔۔۔۔۔!!"

"پر مدن بھائی وہاں۔۔۔۔۔۔۔۔"

"بس آپا جی رو کئے گا مت آپ کا نمک کھایا ہے برسوں بڑے بھیا چھوٹے بھیا اور منے میاں کو کندھوں پر اٹھایا ہے۔ ناز اٹھائے ہیں ان کے اب کیسے۔۔۔۔۔۔۔بس جانے دیجئے آپا جی۔"

اور ماں جی اسے روک بھی نہ سکیں مدن بھائی چلے گئے۔ لیکن پھر واپس نہیں آئے والٹن کیمپ میں صمد میاں جو مسجد کے امام تھے مل گئے تھے اور انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے مدن میاں کی لاش اسٹیشن پر دیکھی تھی۔

ماں جی والٹن کیمپ سے لوہے کے اس بڑے سیاہ گیٹ والے گھر میں آ گئی تھیں جو عقیل ماموں کا گھر تھا۔ عقیل ماموں جو بہت خیال رکھتے تھے میرا اور ماں جی کا' پر مامی کبھی کبھی بہت بولتی تھیں بلاوجہ، حالانکہ ماں جی سارا دن کام میں لگی رہتی تھیں اور رات کو جب تھک ہار کر ماں جی جب میرے پاس آتیں اور مجھے تھپک تھپک کر سلاتیں تو کوئی نہ کوئی یاد ان کے کونے کھدرے سے نکل کر ان کے لبوں پر آ جاتی اور میں اس یاد کو اپنے دل میں اتارتا ہوا سو جاتا۔ میں نے میاں جی کو شعور کی عمر میں نہیں دیکھا تھا۔ صرف بارہ سال کا ہی تھا تب لیکن مجھے پتا تھا کہ ان کا قد درمیانہ تھا داڑھی کے بال ایک دم سیاہ تھے آنکھیں بڑی بڑی تھیں کشادہ پیشانی تھی جس پر سجدوں کا نشان دمکتا تھا۔ وہ عموماً سفید لباس پہنتے تھے۔

میرے حضور ﷺ کو سفید لباس پسند تھا۔ وہ اکثر کہتے تھے۔ مجھے پتا ہے کہ بڑے بھیا کا رنگ بہت گورا تھا اور آنکھیں بھوری۔ ذہانت جن میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ میں جانتا تھا کہ میاں جی کٹر مسلم لیگی تھے اور قائداعظم کے مداح، سب پتا تھا مجھے ماں جی نے ہر بات کتنی کتنی بار بتائی تھی۔ مجھے اس وطن سے انوکھی سی محبت تھی۔

مجھے لگتا یہ میرا وطن ہے۔ صرف میرا اس لئے کہ اس کیلئے میاں جی، بڑے بھیا، چھوٹے بھیا، منے میاں اور مدن بھائی کا خون بہا ہے۔

یہ ان ہزاروں سانپوں اور بچھوؤں کا وطن نہیں ہے جو اس کا خون نچوڑ رہے ہیں۔

میں ان ہزاروں سانپوں اور بچھوؤں سے اپنا وطن بچانا چاہتا تھا اس لئے میں نے سیاسیات میں ایڈمشن لے لیا تھا حالانکہ ماموں چاہتے تھے میں انجینئر یا ڈاکٹر بنوں لیکن پتا نہیں کیوں میں سمجھتا تھا کہ میں سیاسیات پڑھ کر ملک کو ان بچھوؤں اور سانپوں سے بچا لوں گا۔ میں ایسا تو نہ کر سکا تھا البتہ سیاسیات نے مجھے زریں دے دی تھی۔

زریں جس نے صرف اس لئے سیاسیات میں داخلہ لیا تھا کہ کسی اور مضمون میں اسے داخلہ نہیں مل سکا تھا۔ سیاسیات میں بھی وہ ویٹنگ لسٹ میں تھی۔ اسے سیاسیات سے کوئی دلچسپی نہ تھی پھر بھی وہ گھنٹوں مجھ سے اس ملک کی سیاست پر بحث کرتی تھی اور سیاستدانوں کو برا بھلا کہتی تھی۔ جو اس ملک کو کھا رہے تھے اور مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ سیاست پر بحث کرتے کرتے کب ہمارے بیچ محبت آ گئی۔ یہ تو مجھے اس روز پتا چلا جب زرین نے بتایا کہ وہ بہت جلد امریکہ چلی جائے گی۔

''اور تمہاری تعلیم''

''میں نے سونقوں کی طرح اسے دیکھا۔

''وہ تو ادھوری رہ جائے گی۔''

''ہاں لیکن ممی ڈیڈی بھی تو جا رہے ہیں بھائی کب سے کوشش کر رہے تھے سب کو بلانے کی۔''

''تم یہاں رہ جاؤ۔''

کیسے اور کہاں۔

''مجھ سے شادی کر لو۔''

اتنی رومینٹک سی بات میں نے بہت غیر رومانی انداز میں کہہ دی تو کچھ دیر مجھے دیکھنے کے بعد وہ ہنس دی۔

''تم کتنے احمق ہو حبیب''

کیوں کیا شادی کی خواہش کرنا حماقت ہے''

''تم یہ بات کسی اور طرح بھی تو کر سکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ زریں مجھے تم سے محبت ہے میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا وغیرہ وغیرہ۔''

''ہاں اب کہہ دیتا ہوں'' میں شوخ ہو گیا وہ جھینپ گئی اور پھر زریں سے میری شادی ہو گئی۔ حالانکہ ماموں نے اس شادی کی بھی مخالفت کی تھی۔

''پڑھائی بھی مکمل نہیں روزگار بھی نہیں۔''

میں نے سر جھکا دیا لیکن شادی پر اڑا رہا۔ زریں شادی کے چند دن بعد امریکہ چلی گئی اور دو سال بعد میں بھی امریکہ چلا گیا۔ ماں نے کچھ نہیں کہا۔

نہ روکا۔ نہ منع کیا بس گیٹ پر ہاتھ دھرے آنسو بھری آنکھوں سے مجھے تکتی رہی۔ کاش وہ مجھے روک لیتی اپنے آنسوؤں کی زنجیروں سے مجھے پابند کر دیتی۔ لیکن اس نے کہا بھی تو صرف اتنا۔

''اپنے میاں جی کو بڑے بھیا چھوٹے بھیا اور منے میاں کو نہ بھولنا۔''

''پتا نہیں اس میں کیا رمز تھی۔ اٹھائیس سالوں میں میں سمجھ ہی نہیں پایا۔ ہاں بستر پر لیٹتے ہوئے سونے سے پہلے میں نے انہیں ایک بار یاد ضرور کیا۔ لیکن یاد کرنے کے باوجود میں کبھی پھر پاکستان گیا ہی نہیں۔ اٹھائیس برسوں میں ایک بار بھی نہیں۔ ہاں ایک بار میں نے ارادہ باندھا تھا۔ شدت سے ماں یاد آئی تھی اور تب پاکستان سے ماموں کا خط آ گیا تھا۔

ماں چلی گئی تھی اپنے رب کے پاس۔ میں نے سامان کھول دیا اب کون تھا وہاں' یہاں زریں تھی، بچے تھے۔

میرے سسرال والے تھے اور میرا کاروبار تھا۔۔۔۔ میں نے ایک چھوٹا سا سٹور بنایا تھا جو ترقی کرتے کرتے بہت بڑا سپر سٹور بن گیا تھا اور میں بہت معروف ہو گیا تھا۔

ہم سب خوش تھے۔

زریں۔۔۔۔۔۔ ہانی، مانی اور ٹمی۔

ہارون بڑا تھا۔ پھر تمثیلہ تھی ٹمی اور پھر مامون تھا سب سے چھوٹا، میں نے کبھی کسی کو کسی کام سے روکا ٹوکا نہیں۔ ہم سب میں دوستی تھی۔

کوئی پرابلم نہ تھا۔ کوئی الجھن نہ تھی، پھر، ہاں پرابلم تب ہوا تھا جب ہانی نے ہیوسٹن میں ایک نیا سٹور کھولا تھا۔ میرے والے سٹور سے بھی بڑا اور پھر کچھ عرصہ بعد ایک اور اسٹور کھول لیا۔ وہیں اور ہم سب ہیوسٹن چلے گئے۔ بس پرابلم وہاں سے ہی شروع ہوا تھا۔

جب پہلی بار ہانی گلاب سنگھ کے ساتھ گھر آیا تھا تو مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا تھا پتا نہیں کیوں۔ جب اس نے جھک کر پرنام کیا تھا تو مجھے اس کی بڑی بڑی رسیاں آنکھوں سے خوف سا محسوس ہوا تھا میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''یہ گلاب سنگھ ہے میرا بزنس پارٹنر۔''
ہانی نے تعارف کروایا تھا۔
''اچھا، اچھا۔''
میں نے اس سے مل کر خوشی کا اظہار کرنا چاہا تھا لیکن پتا نہیں کیوں نہیں کر سکا تھا۔
حالانکہ پورا گھر اس کے آگے بچھا جا رہا تھا زریں اور ہانی۔
ہانی کی بیوی کیتھی۔
اور مامون سب ہی۔
میں چپ بیٹھا رہا اور اس روز مجھے خود پتا نہیں چل رہا تھا کہ میرے اندر اتنی گہری چپ کہاں سے اتر آئی ہے اتنا سناٹا یکا یک کیوں چھا گیا ہے۔ مامون نے میری خاموشی کو نوٹ کیا۔
''ڈیڈ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔''
''ہاں شاید نہیں''
میری چپ لحہ بھر کو ٹوٹی۔
''تو پھر ریسٹ کریں جا کر چاچا جی۔۔۔۔۔اپنا گھر ہے تکلف کی کیا بات ہے۔
اب آنا جانا تو لگا ہی رہے گا۔
گلاب سنگھ نے کہا تو ہانی اور مامون نے بھی تائید کی۔
ہاں ڈیڈ آپ ریسٹ کریں اگر زیادہ طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کو کال کر لیں۔''
''نہیں زیادہ نہیں۔''
میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا باہر لاؤنج سے گلاب سنگھ کے قہقہوں اور ہانی اور مامون کے ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ بات بے بات ہنس رہا تھا اور میں یونہی بیڈ سے ٹیک لگائے لیٹا رہا۔ ایک دم یہ سناٹے سے کیوں اتر آئے تھے اندر مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ زریں آ گئی خفا سی۔
اچانک تمہیں کیا ہو گیا تھا حبیب اچھے بھلے تو تھے کچھ دیر پہلے، گلاب سنگھ کیا سوچے گا کہ تمہیں اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔
''ہاں اصل بات شاید یہی تھی جو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مجھے اس کا آنا اچھا نہیں لگا

تھا۔ لیکن میرے اچھا لگنے یا نہ لگنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ ہارون کا بزنس پارٹنر تھا اسے گھر آنے سے کون روک سکتا تھا اور پھر سب ہی اس کے اور اس کی فیملی کے مداح تھے۔ پیارے سنگھ جو اس کا باپ تھا اور اکثر بے تکلفی سے چلا آتا۔
''بھابھی آپ کے ہاتھ کی نہاری کھانے آیا ہوں۔''
یا بینگن کی بجھیا آپ کے جیسی کوئی نہیں بنا سکتا۔
اور بسنت کور جو گلاب سنگھ کی ماں تھی اور پیارے سنگھ کی بیوی جو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کرتی اور کہتی۔
ویر تو تو میرے بھرا جیسا ہے مجھے اپنا ویر بہت یاد آتا تھا اب تیری شکل میں کرتارا مل گیا ہے مجھے۔''
اور میرے اندر سے نہیں نہیں کی آوازیں نکلتیں۔
''نہیں......نہیں میں تیرا ویر نہیں ہوں۔ میرا کوئی رشتہ نہیں تم سے۔۔۔۔۔''
''لیکن میں چپ رہتا۔ سر جھکائے خاموش۔ لیکن میرے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی جب نیو ائیر پارٹی میں پیارے سنگھ بلونت کور کی کمر میں بانہیں ڈال کر نشے میں تھرکنے لگتا۔
نی بنتو......بنتو۔
میری بنتو کا ایک پتلا۔
اور اس کی کیسری پگڑی کھل کر اس کے گلے میں آ جاتی اور اس کے گیسوں کھل جاتے تو میری آنکھوں کے سامنے کرتار سنگھ آ جاتا۔ جورے قصائی کی رانیوں جیسا حسن رکھنے والی بیٹی تاجاں کو گھسیٹ کر اس کے گھر سے باہر لاتا۔
اور اس کے کپڑے تاراج کرتا ہوا۔
تاجاں جو جب گلی میں نکلتی تھی تو دوپٹا پیشانی تک اوڑھ لیتی اور بڑے سے دوپٹے میں پورے وجود کو چھپائے نگاہیں جھکائے چلتی تو گاؤں کے اکھڑ جوان بھی اس کے احترام میں راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ وہ جورے قصائی کی بیٹی تھی اور پورے گاؤں میں اس کے حسن کے ساتھ ساتھ اس کی پارسائی کے بھی چرچے تھے۔
اور جب وہ کونے میں بنے بار سے پیگ پر پیگ پیتا ہوا آدھا خود پر گراتا دھڑام سے فلور کشن پر گرتا اور پھر اٹھ کر لہراتا ہوا پیگ لئے میری طرف بڑھتا۔

یار حبیب! تو کیوں قسم کھائے بیٹھا ہے سووں گرو دی اک بار چکھ کے تو ویکھ (گرو کی قسم ایک بار چکھو تو) تو میری آنکھوں کے آگے ٹھرے کی بوتل لہراتا کرن سنگھ آ جاتا جھومتا ہوا آدھی بوتل داڑھی کے بالوں میں گراتا اور قہقہے لگاتا۔

میں نے میاں جی کو مار دیا۔ میں ڈسپنسری میں چھپا بیٹھا تھا اور جوں ہی میاں جی نے مسجد میں قدم رکھا اور پھر میاں جی میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے۔ چار پائی پر آنکھیں موندے لیٹے یوں کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے اور داڑھی کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور خون ان کے سینے پر پھیلتا جا رہا ہے۔

اور میں دانتوں پر دانت سختی سے جمائے بیٹھا رہتا اور جب گلاب سنگھ میز پر طبلہ بجاتے ہوئے گاتا۔

کنڑکاں لمبیاں نی مائے

یا پھر ہیر کا کوئی بول اور سب اس کی آواز کی اور سوز کی تعریف کرتے ہیں تو میں تب بھی چپ ہی بیٹھا رہتا ہوں اور میری آنکھوں کے سامنے باری باری کرتار سنگھ، کرن سنگھ اور بلونت سنگھ آتے رہے۔

بلونت سنگھ جس نے سکول کے احاطے میں چھپ کر بڑے بھیا چھوٹے بھیا اور منے میاں پر وار کیا تھا۔ تیرہ اگست کی صبح کو بڑے بھیا پاکستان کے سبز ہلالی پرچم کو تھیلے میں چھپائے اور چھوٹے بھیا ایک تھیلے میں مٹی کے دیئے رکھے جو انہوں نے مٹو کمھار کی بیوی سے کہہ کر بنوائے تھے گھر سے نکلے تھے اور منے میاں ان کے قدم سے قدم ملائے سکول کی طرف جا رہے تھے کہ سب دوستوں نے وہاں جمع ہونے کو کہا تھا۔

''کہ ہمارا گاؤں پاکستان میں شامل ہے۔''

بڑے بھیا نے جاتے جاتے ماں کو بتایا تھا۔

''ہم آج سکول کی عمارت پر یہ پرچم لہرائیں گے اور فصیلوں پر دیئے جلائیں گے'' ماسٹر کبیر خان نے کہا۔

لیکن سکول کے احاطے میں چھپے بلونت سنگھ نے تینوں پر برچھیوں سے وار کر کے مار دیا تھا اور ان کی لاشیں اٹھا کر احاطے میں پھینک دی تھیں جہاں ماسٹر کبیر خان کی لاش پڑی

تھی اور شام تک وہ لاشیں وہاں ہی پڑی رہی تھیں دیئے تھیلے سے نکل کر گر گئے تھے اور سبز ہلالی پرچم خون رنگ ہو گیا تھا سکول کے کمروں میں سکھ جتھا چھپا ہوا تھا اور پھر شام کو جانے کیسے مدن میاں مٹو کمھار کے ساتھ جا کر لاشیں اٹھا کر لائے تھے اور پھر ایک ایک کر کے تینوں کو حویلی کے برآمدے میں لٹا دیا تھا کسی کو خیال نہیں آیا تھا کہ نازک بدنوں کو چار پائی پر ڈال دیں اور مدن بھائی تھے جو واپس پلٹ آئے تھے منے میاں کو سخت زمین چبھتی ہو گی۔

حق نمک تو ادا کرنا ہے نا آپا جی مت روکیں۔

مجھے لگتا جیسے میں تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہوں اور میری ذرا سی حرکت ذرا سی بے توازنی مجھے نیچے گہرائیوں میں گرا دے گی اور گلاب سنگھ گاتا رہتا۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ آکھیں

تے کون وچھڑے یار ملاوندا ای

لیکن میری انتہائی کوششوں کے باوجود بے توازنی پیدا ہو گئی میں پھٹ پڑا۔

''مجھے گلاب سنگھ اور پیارے سنگھ کی اپنے گھر میں اتنی زیادہ آمد پسند نہیں ہے۔''

زریں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے گی۔

''حبیب یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے تم تو بہت براڈ مائینڈڈ تھے پھر یکایک اتنے تنگ نظر کیوں ہو گئے ہو۔

میں براڈ مائنڈڈ تھا میں براڈ مائنڈڈ ہوں۔

ہانی نے کیتھی سے شادی کرنا چاہی۔ میں نے روکا نہیں مجھے برا بھی نہیں لگا جب ہانی نے کہا کیتھی اپنا مذہب تبدیل نہیں کرے گی۔

''ڈیٹس او کے، مائی سن۔''

میں نے اس کی پیٹھ تھپکی تھی۔

ٹمی کے بوائے فرینڈز آتے ہیں میں نے کبھی تعرض نہیں کیا۔ ون نائیٹ کلبوں میں جاتا ہے۔ نیو ائیر پارٹیوں میں کبھی کبھی پی بھی لیتا ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس لئے کہ مجھے کبھی کچھ برا ہی نہیں لگا۔ ان اٹھائیس سالوں میں، میں بھی یہاں کے ماحول میں ہی رچ بس گیا تھا۔ مجھے خود نیو ائیر پارٹی کے ہنگامے پسند تھے۔ میں کیتھی کے ساتھ خود مل کر کرسمس

ٹرے سجاتا ہوں۔ ہم کرسمس انتہائی شفقت سے مناتے ہیں اور مجھے کبھی یاد نہیں رہتا کہ آج عید الفطر ہے۔

لیکن یہ گلاب سنگھ اور پیارے سنگھ۔

"تم دراصل بوڑھے ہو گئے ہو سٹھیا گئے ہو۔"

زریں کو میری بات بالکل پسند نہیں آتی تھی۔

حالانکہ میں ابھی اتنا بوڑھا بھی نہیں ہوا تھا۔ ستاون سال کی عمر میں بھلا کوئی سٹھیا جاتا ہے ۔ ابھی تو میرے بال بھی بس کنپٹیوں سے ہی سفید ہوئے ہیں ۔ لیکن زریں۔۔۔۔۔۔ٹمی، ہانی اور مون بھی مجھے پاگل سمجھنے لگے ہیں۔

"ڈیڈ میں نے ڈاکٹر ہاورڈ سے ٹائم لیا ہے بہت بڑے سیکاٹرسٹ ہیں آپ آج شام چلئے گا۔"

مون نے اس روز مجھے کہا تھا۔

"آپ کے ساتھ ضرور کوئی پرابلم ہے۔"

ہاں ہے لیکن تم نہیں سمجھ سکتے اور میں تمہیں نہیں سمجھا سکتا میں نے سوچا تھا اس لئے کہ میں نے تو انہیں کبھی بتایا ہی نہیں۔ وہ کیا جانیں اپنا ماضی، اپنی روایات وہ تو یہاں ہی پیدا ہوئے ہیں اس دیس میں۔

اور میں اسی رات واپس واشنگٹن چلا آیا تھا اور اس رات مجھے ماں جی یاد آئی تھیں بڑے سے آہنی گیٹ پر ہاتھ رکھے مجھ سے اپنی ازلی عاجزی اور مسکینی سے کہتی ہوئی۔

"اپنے میاں جی کو، چھوٹے بھیا، بڑے بھیا اور منے بھیا کو مت بھولنا۔"

انہوں نے یہ کیوں کہا تھا۔ یہ کیوں نہیں کہا تھا کہ مجھے مت بھولنا میں تب ان کی رمز نہ جان سکا تھا لیکن میں ان کو بھول بھی نہیں سکا تھا حالانکہ میں میں تو تب چار سال کا تھا صرف لیکن سارے منظر پوری جزئیات کے ساتھ میرے اندر زندہ تھے جیسے میں ہر منظر میں موجود تھا۔ مجھے تو یہ بھی پتا تھا کہ چھوٹے بھیا کے بال گھنگھریالے تھے اور ان کے اوپر والے دو دانتوں میں اتنا فاصلہ تھا کہ بڑے بھیا اکثر کہتے تھے۔ یہاں سے ضرور ایک دانت غائب ہو گیا ہے اور ماں جی ہنس کر کہتیں۔

"یہ تو خوش قسمتی کی علامت ہے۔"

اور مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ تب چھوٹے بھیا کی آنکھیں جگ مگ جگمگ کرا اٹھتی تھیں۔

دو سال بعد اپنا اپارٹمنٹ کھولتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ میں اب ہیوسٹن نہیں جاؤں گا اور میں نے سوچا تھا کہ میں نے ماں جی سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا لیکن میرے پاؤں میں اس وعدے کی زنجیریں پڑی تھیں۔

"یہ کیا حماقت ہے حبیب۔"

میں سونے کیلئے لیٹا تو زریں کا فون آ گیا۔

وہ بہت ناراض ہو رہی تھی۔

"کم از کم بتا کر تو جاتے مون ہانی اور کیتھی سب کتنے پریشان ہوئے۔"

"میں نے ٹمی کو بتا دیا تھا۔"

"لیکن ٹمی گلاب سنگھ کے ساتھ چلی گئی تھی اب لوٹی ہے۔" میری آنکھوں کے سامنے جورے قصائی کی تاجاں آ گئی۔

"تم کب تک آؤ گے"

"میرا ارادہ نہیں ہے زریں تم بھی یہاں ہی آ جاؤ مجھے ہیوسٹن راس نہیں آیا۔"

"پاگل ہو گئے ہو تم"

"نہیں زریں آ جاؤ تم اور ٹمی ہم پاکستان چلیں گے۔"

"تم چلے جاؤ ہو آؤ جب وطن سے محبت کا بخار اتر جائے تو چلے آنا۔"

اس نے ناراض ہو کر فون بند کر دیا تھا۔ پھر باری باری سب نے ہی فون کیا۔ حتیٰ کہ کیتھی نے بھی۔ لیکن میں نے ایک سٹور پر ملازمت کر لی اور چھ ماہ میں ہی ایک سٹور خرید لیا در اصل یہ ایک رقص گاہ تھی جو نیلام ہوئی تو میں نے خرید کر اسے سٹور بنا لیا تو ماموں کو بلا لیا۔

وہ سٹور ہانی کا ہے تم اسے سنبھال لو۔ میں نے ساری جمع پونجی اس میں لگا دی ہے"

اور ماموں جو نہ جانے کس بات پر دل ہی دل میں ہانی سے خفا تھا۔ واشنگٹن چلا آیا اور اس نے سٹور سنبھال لیا اور ماموں کے آنے کے بعد زریں اور ٹمی بھی آ گئیں۔

"چلو پاکستان نہ سہی وہ وہاں سے تو آ گئی تھیں جہاں پیارے سنگھ تھا اور گلاب سنگھ

تھا۔لیکن گلاب سنگھ یہاں بھی آ گیا ملنے۔ ہمیشہ کی طرح خوش باش اور بے تکلف سا۔

چاچی میرا تو وہاں دل ہی نہیں لگا ملنے چلا آیا۔

زریں اور ٹمی دونوں نے ہی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔لیکن میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی نہیں آ سکی اور میں تھکاوٹ کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں آ گیا۔تب ہی زریں چلی آئی۔ بے چینی سے اپنے جوڑے کے بل کھولتی اور لپیٹتی ہوئی۔

وہ اتنی دور سے آیا ہے محض ہمارے لئے اور تم اٹھ کر چلے آئے کتنا غلط کیا ہے تم نے، کیا سوچتا ہوگا وہ ہمارے بیٹے کا بزنس پارٹنر ہی نہیں ہمارے ساتھ بھی اچھے تعلقات ہیں اور پھر وہ سب لوگ کتنے اچھے ہیں گلاب سنگھ اور پیارے سنگھ دونوں ہی بسنت کور کتنی محبت کرنے والی ہے لیکن تم ہمیشہ رکھائی سے پیش آتے ہو۔ مجھے تمہارا مسئلہ نہیں سمجھ آتا حبیب۔

وہ باہر چلی گئی ہے اور میں سوچ رہا ہوں میرا مسئلہ۔ ہاں کیا ہے میرا مسئلہ۔

میں جانتا ہوں وہ میرے بیٹے کا بزنس پارٹنر ہے۔ بہت اچھا ہے اور پھر پتا نہیں کیوں مجھے گملاں سا ہوتا ہے کہ ٹمی اور وہ۔۔۔۔۔۔۔۔وہ اور ٹمی۔

حالانکہ جب ٹمی نے ایک بار چارلس سے منگنی کر لی تھی اور کہا تھا کہ چارلس اس کی خاطر مذہب بدل رہا ہے اور مسلمان ہو رہا ہے تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا بعد میں جب چارلس نے مسلمان ہونے سے انکار کر دیا تھا تو ٹمی نے منگنی توڑ دی تھی کہ اس نے وعدہ خلافی کی ہے اور تب ٹمی نے ابھی اولیول بھی نہیں کیا تھا اور اب پتا نہیں کیوں جب میں سوچتا ہوں کہ ٹمی اور گلاب سنگھ، گلاب سنگھ اور ٹمی تو میرے دل کو کوئی مٹھی میں لے لیتا ہے۔

تاجاں اور میاں جی۔

مدن بھائی اور بڑے بھیا یکے بعد دیگرے میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔

سب صحیح ہے۔

گلاب سنگھ کا خلوص۔

پیارے سنگھ کی محبت

بسنت کور کا بناپا۔۔۔۔۔۔لیکن میں۔۔۔۔یہ کیسے ممکن ہے کہ میں بھی ان سے اتنی ہی محبت کر سکوں جتنی کہ ٹمی کرتی ہے جتنا کہ ہانی کرتا ہے اور زریں چاہتی ہے میں ان سے

محبت کروں۔

انہیں اپنا سمجھوں۔

لیکن میں ان سے محبت نہیں کر سکتا۔کسی صورت بھی نہیں ماں جی نے آتے سمے جو وعدہ لیا تھا۔ وہ وعدہ میرے اندر زندہ ہے۔ میں کسی کو بھی نہیں بھول سکتا۔حتیٰ کہ میاں جی اور بڑے بھیا، چھوٹے بھیا کے علاوہ۔

جورے قصائی کو بھی نہیں۔

جو تاجاں کے پیچھے چیختا ہوا نکلا تھا اور کرتان سنگھ کی کرپان اس کے سینے۔۔۔

اور گل خان کو بھی نہیں جو انہیں ڈھونڈتا تھا اور جس کی نعش نہر کے کنا[illegible]دوں کے باغ کے پاس پڑی سب سے پہلے میاں جی نے ہی دیکھی تھی اور تب 1946ء تھا اور۔۔۔۔۔۔۔۔

ہاں میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ان سے محبت نہیں کر سکتا۔گلاب سنگھ سے اور پیارے سنگھ سے، میں انہیں اپنا نہیں سکتا۔

لیکن یہ سب میرا مسئلہ نہیں سمجھ سکتے۔کیونکہ میں نے تو کبھی انہیں اس تاریخ سے آگاہ ہی نہیں کیا۔جس کا ہر باب لہو سے لکھا ہے۔

اس ماضی کی جھلک تک نہیں دکھائی جسے ہر رات میری ماں میرے بالوں میں ہولے ہولے انگلیاں پھیرتی ہوئی دہراتی تھی۔

باہر سے گلاب سنگھ کے ہنسنے کی اور ٹمی کی باتوں کی آواز آ رہی تھی اور زریں کی بھی جو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہی ہوگی کہ میں گھر آئے مہمان۔۔۔۔۔۔۔اور مہمان بھی کون

ہانی کا بزنس پارٹنر

اور ٹمی کا۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔ٹمی اور گلاب سنگھ

اور ٹمی۔۔۔۔۔۔نہیں میں ان سے محبت نہیں کر سکتا۔

چاہوں بھی تو بھی نہیں۔کیونکہ میں نے کسی کو نہیں بھلایا اور یہی میرا مسئلہ ہے۔اور

میں جانتا ہوں اس کا حل کہیں نہیں ہے۔ کسی سکاٹرسٹ کے پاس نہیں باہر گلاب سنگھ شاید ٹمی کی
فرمائش پر گا رہا ہے اس کی بھاری پرسوز آواز اندر تک آ رہی ہے۔

ہیر آکھیا جوگیا جھوٹ آکھیں۔

اور میں تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہوں۔ آپ ہی بتائیں یہ کیسے ممکن ہے میں ان
سے اتنی ہی محبت کروں جتنی سب کرتے ہیں۔

جتنی ٹمی کرتی ہے اور جتنی ہانی اور مامون کرتے ہیں۔

اور جتنے سارے پاکستانی کرتے ہیں اور بس یہی میرا مسئلہ ہے۔

☆ ☆ ☆

روشن چراغ رکھنا

کسوٹی، کسوٹی، کھیلتے ہوئے جانے ذیشان کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس نے
نبر چچی کو شخصیت کے طور پر سوچ لیا۔

"مرد۔" فروا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"پاکستانی۔"

"ہاں۔"

"زندہ۔"

"ہاں۔"

"وجہ شہرت۔"

"کوئی ایک نہیں۔"

"یعنی بہت سی۔" فروا نے اندازے لگانے شروع کر دیے۔

"کہہ سکتی ہو۔" وہ ہر بات کے جواب میں کہتا۔

''یعنی محترمہ ہمہ صفت ہیں۔'' یہ ماریہ کا خیال تھا۔

ذیشان اس کے اندازوں پر مسکرا رہا تھا۔

''بیس سوال ہو گئے۔'' میران نے جو انگلیوں کی پوروں پر سوال گن رہا تھا' اعلان کیا تو فروا نے ہار مان لی۔

''سوری' ہم نہیں بوجھ سکے تم بتا دو۔''

''مشی! تم گیس کرو۔'' ذیشان نے مخاطب کیا تو میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا.....؟'' دراصل میں ابن صفی کے دلچسپ ناول میں اس طرح کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے اردگرد ہونے والی کارروائی کی خبر نہ تھی۔

''شخصیت بوجھو' ایک پاکستانی زندہ خاتون ہمہ صفت ہیں اور......''

''ایسی خاتون تو صرف عنبر چچی ہی ہو سکتی ہیں۔'' میں نے فروا کی بات کاٹ دی

''کم از کم میری نظر میں ان کے علاوہ کوئی ایسی خاتون نہیں ہیں' جن میں بیک وقت اتنی خوبیاں ہوں۔''

میں نے مذاق کیا لیکن ذیشان نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

''میں تمہیں اتنا ذہین نہیں سمجھتا تھا مشی!''

''کیا' کیا مطلب ہے تمہارا' تم نے عنبر چچی کو سوچا تھا۔'' فروا چیخی۔

''یس آف کورس۔'' ذیشان کا اطمینان غضب کا تھا۔

''یہ چیٹنگ ہے۔'' ماریہ چیخی۔

''تم نے مشہور شخصیت کہا تھا۔''

''تو کیا وہ مشہور نہیں ہیں۔''

ذیشان نے معصومیت سے پوچھا اور پھر میران کی طرف دیکھا۔

''کیا میں نے غلط کہا مہرو ڈیئر! آس پاس' پڑوس' محلے' عزیز رشتہ داروں' جاننے والوں میں جتنی وہ مشہور ہیں' اتنی تو اندرا گاندھی بھی نہیں تھی۔''

''لیکن وہ کوئی تاریخ ساز شخصیت تو نہیں ہیں نا۔''

فروا روہانسی ہو رہی تھی۔

''کمال کرتی ہو یار فروا! تاریخ ساز شخصیتوں کے ماتھے پر کیا تین آنکھیں ہوتی

ہیں' اور گدی پر سینگ ہوتے ہیں ہمارے خاندان کی تاریخ میں تو عنبر چچی کا کردار بہت اہم ہے اور تاریخ ساز۔''

''اور کتنی خوبیاں وہ ہمہ صفت موصوف۔'' ماریہ منمنائی۔

''تو کیا غلط کہا میں نے' پوچھ لو مشی سے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔

''ہاں عنبر چچی تو بہت اچھی ہیں۔''

میں نے فوراً کتاب گھٹنے کے نیچے دبائی اور شروع ہو گئی۔

''اتنے اچھے کھانے بناتی ہیں۔ اتنی محبت کرتی ہیں اور پھر کتنی خوبصورت ہیں اور کل اتنی مزے کی بریانی پکائی تھی' ہیں نا شان؟''

میں نے تائید کیلئے شان کو مخاطب کیا۔

''ہاں تو اور کیا کل جو فرنی بنائی تھی اس کا ذائقہ تو رات سوتے وقت بھی میری زبان پر چپکا ہوا تھا۔''

فروا حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہی تھی۔

''یہ سراسر چیٹنگ ہے' دھوکا ہے' ہم آئندہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔''

وہ پاؤں پٹختی باہر چلی گئی۔ اسے ہارنا تو بالکل پسند ہی نہ تھا اور ہار جاتی تو برداشت ہی نہ کر پاتی۔

''مگر تم کو کیسے پتا چلا کہ وہ بریانی اور فرنی مزے کی بناتی ہیں۔''

ماریہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں بتاؤں؟''

انصر جو اتنی دیر سے ضبط کیے بیٹھا تھا' ایک دم بول پڑا۔ کسی راز کو جاننے کی اندرونی خوشی اس کے رخساروں سے چھلک رہی تھی۔

''شان اور مشعال عنبر چچی کے گھر جاتے ہیں۔''

''جھوٹے۔'' شان نے صاف انکار کر دیا۔

''پھر تمہیں فرنی کا ذائقہ کیسے پتا چلا؟'' ماریہ نے پوچھا۔

''وہ تو خواب میں دیکھا تھا کہ عنبر چچی گولڈن کناروں والے باؤل میں میرے سامنے فرنی رکھ رہی ہیں۔''

''جی نہیں میں نے خود دیکھا ہے' کتنی بار دو پہر کو شان بھائی کو ادھر چچا کے گھر
جاتے۔'' انصر پھٹ پڑا۔
''انصر کے بچے۔'' ذیشان نے اسے گھورا۔
''وہ جو کل شام میں نے تمہیں چاکلیٹ دیا تھا' واپس کرو۔''
''اور جو پرسوں میں نے تمہیں جیومیٹری کی اشکال بنا کر دی تھیں۔'' مجھے بھی یاد
آ گیا۔
''وہ رشوت تھی۔ ابا کہتے ہیں رشوت لینا حرام ہے۔ وہ ہم نے ڈسٹ بن میں
پھینک دیا تھا۔''
''جھوٹ بولنا بھی گناہ ہے انصر سرکار! کل ٹی وی لاؤنج میں گرین والے صوفے
پر بیٹھ کر کس نے چاکلیٹ اڑائی تھی۔''
ذیشان نے اسے گردن سے پکڑا' لیکن وہ جھکائی دے کر بھاگ گیا اور اس کے
پیچھے ہی ماریہ اور میران بھی واک آؤٹ کر گئے۔ آئندہ ذیشان نصیر کے ساتھ نہ کھیلنے کی
دھمکی دیتے ہوئے اور میں نے گھٹنے کے نیچے دبے ہوئے ناول کو نکالا اور پھر پڑھنے لگی اور
مجھے خبر نہیں کہ کب ذیشان بھی سب کے پیچھے نکل گیا' میں ناول میں پوری طرح گم تھی۔ کبھی
میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی کبھی میں قہقہہ لگا کر ہنس دیتی۔ عمران کی حماقتیں ہی ایسی
تھیں تب ہی ماریہ نے آ کر مجھ سے کہا کہ تائی جان تمہیں بلا رہی ہیں۔
''وہ ضرور چائے بنانے کے لئے کہیں گی۔'' میں نے سوچا۔ معلوم نہیں کیا سمایا تھا'
ان کے دماغ میں کہ انہیں مجھے سگھڑ بنانے کا خیال آ گیا تھا اور انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ
میں اب اس قابل ہو گئی ہوں کہ تھوڑے تھوڑے کام شروع کر دوں۔ مثلاً کبھی چائے بنا لی'
کبھی پھلکے ڈال لیے۔ کبھی آملیٹ بنا دیا یا چائے کے ساتھ پکوڑے تل لیے۔ پچھلے دو تین
دن سے شام کی چائے بلاناغہ میں ہی بنا رہی تھی۔
''میری اچھی بہن! آج تم چائے بنا دو پلیز' تمہیں پتا ہے نا میزان نے صرف
شام تک کے لیے یہ مجھے پڑھنے کو دی ہے اور میرے ابھی کچھ صفحات رہ گئے ہیں۔''
''چائے تو فروا نے بنا ہی لی ہے' تم اطمینان سے یہ صفحات ختم کر کے چلی جانا
انہیں شاید کوئی اور کام ہے۔''

ماریہ بتا کر چلی گئی تو جلدی جلدی دو تین صفحے پڑھ کر میں امی جان کے کمرے
میں آئی۔ وہاں تائی جان اور امی جان کے علاوہ چچی جان بھی موجود تھیں میرے ساتھ
ساتھ ہی ذیشان بھی داخل ہوا۔
''جی امی حضور! بندے کو کیوں طلب کیا؟''
وہ تائی جان کے سامنے جھکا۔ لیکن تائی جان کا موڈ خاصا خراب لگ رہا تھا اور
اس خراب موڈ کے تاثرات امی جان کے چہرے پر بھی موجود تھے جبکہ چچی جان بہت شانت
بیٹھی تھیں۔
''اس مجلس شوریٰ کا اہم رکن موجود نہیں ہے''
ذیشان نے مجھ سے کہا اس کا اشارہ دادی جان کی طرف تھا۔
''ورنہ عنبر چچی کے خلاف ہر محاذ میں وہ ہراول دستے میں شامل ہوتی ہیں' نصیب
دشمناں طبیعت خراب لگتی ہے'' اس نے پھر سرگوشی کی۔
''عنبر چچی کے خلاف کیوں' کیا کیا ہے انہوں نے''
''انہوں نے تو کچھ نہیں کیا البتہ۔''
''یہ تم کیا کھسر پھسر کر رہے ہو ذیشان۔'' تائی جان نے اسے جھڑکا۔
''اور مجھے یہ بتاؤ کہ تم عنبر کی طرف جاتے ہو' تم اور مشعال۔''
''جی۔'' میں نے مری مری آواز میں کہا۔
''کیا تمہاری دادی جان نے تمہیں منع نہیں کیا تھا' ادھر جانے سے'' اب توپوں کا
رخ میری طرف تھا۔
''جی!''
''کیوں جاتے ہو تم دونوں وہاں' جب تمہیں منع کیا گیا تھا۔'' اب امی جان نے
دشمن فوج کی کمان سنبھال لی تھی۔ ہمارے سر جھک گئے' ہمارے پاس اس سوال کا جواب
نہیں تھا۔
''کیا پوچھ رہی ہوں میں مشعال؟'' امی جان نے تیز لہجے میں پوچھا۔
''وہ عنبر چچی اچھی لگتی ہیں۔'' میری آواز اب بھی مری مری سی تھی۔
''آخر اس میں کیا حرج ہے اماں۔'' ذیشان نے سوال کیا۔

''آخر کو وہ ہمارے چچا کی بیوی ہیں۔ توقیر چچا کتنے اچھے اور محبت کرنے والے تھے۔ ہمیں تو چاہیے کہ ہم ان کا پہلے سے زیادہ خیال رکھیں۔ توقیر چچا کے بعد وہ بہت اکیلی رہ گئی ہیں۔''

''شان! تم سبق دے رہے ہو ہمیں'' تائی جان پھنکاریں۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری عمر کتنی ہے۔''

''پندرہ سال۔''

ذیشان نے فخر سے کہا ''اور میں نائنتھ میں پڑھتا ہوں۔''

''میں تیرہ سال کی ہوں۔''

میں نے بھی فوراً اپنی عمر بتائی اس سے پیشتر کہ تائی جان مجھے جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش کہہ دیتیں، جیسا کہ ان کی عادت تھی۔ اب کے امی نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''تم چپ بیٹھو اور آپا جان کی بات دھیان سے سنو۔''

امی اور تائی سگی بہنیں تھیں اور امی ہمیشہ اپنی بڑی بہن کے نقش قدم پر چلتی تھیں اور چچی جان ان دونوں کے پیچھے۔ تائی جان کچھ دیر لب بھینچے ہمیں دیکھتی رہیں اور پھر حکم سنایا۔

''آئندہ تم عنبر کے ہاں نہیں جاؤ گے دونوں، اگر گئے تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔''

تائی جان کو غالباً ٹانگیں توڑنا بہت پسند تھا۔ اس لیے اکثر و پیشتر وہ یہ دھمکی دیتی رہتی تھیں۔ اگرچہ کبھی اس پر عمل نہیں کیا تھا انہوں نے۔

''سن لیا ہے تم دونوں نے؟'' امی جان نے ہمیں مخاطب کیا۔

''جی۔'' میری آواز میں نمی آ گئی، مجھے عنبر چچی بہت پسند تھیں اور سحرش سے تو میری بہت دوستی تھی اور پھر روشن بھی تو تھا۔ سب سے اچھا وہ ذیشان اور میران کی طرح کبھی مجھ سے نہیں لڑتا تھا، خاموش اور سنجیدہ سا۔

''کان پکڑو تم دونوں۔'' تائی جان کا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا۔

''کہ آئندہ وہاں نہیں جاؤ گے۔''

''میں پندرہ سال کا ہوں اماں!'' ذیشان بڑبڑایا۔

''اور اب تو سکول میں بھی سر کان پکڑوانے کی بجائے بنچ پر کھڑا کرتے ہیں۔ میں نہیں پکڑتا کان۔'' وہ خاندان کے سارے بچوں سے بڑا تھا۔

فروا اس سے صرف چار ماہ چھوٹی تھی، اس لیے وہ اس کی بڑائی کو نہیں مانتا تھا۔ در اصل امی جان اور تائی جان کی شادی ایک ہی روز ہوئی تھی تایا اور ابا کے ساتھ۔

''تو پھر قسم کھاؤ تم دونوں۔''

''دادی جان خوامخواہ قسم کھانے سے منع کرتی ہیں۔''

میں منمنائی۔ مجھے تائی جان سے خوف آتا تھا اور جب ان کے ساتھ امی بھی ہوں تو میری آواز گھگھیا جاتی تھی۔

''چلو کان پکڑو تم دونوں۔'' امی جان نے تائی جان کی نمائندگی ضروری سمجھی۔

''میرے ہاتھ بے اختیار کانوں تک چلے گئے۔

''میرے حصے کے کان بھی تم پکڑ لینا مشی!'' ذیشان جھپاک سے باہر نکل گیا۔

''وہ کیسے میرے تو صرف دو ہی کان ہیں۔''

میں نے پیچھے مڑ کر ذیشان کی طرف دیکھنا اور اٹھنا چاہا تو چچی نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا۔ جو اس ساری کارروائی کے درمیان خاموش بیٹھی تھیں۔ پتا نہیں چچی کو مجھ سے کیا دشمنی تھی ہمیشہ ایسے موقعوں پر مجھے گرفتار کرتی تھیں۔ جب میں اماں یا تائی اماں کی مار سے بچ کر بھاگنا چاہتی تھی۔

''آدھ گھنٹے کے اپنے حصے اور آدھ گھنٹے میرے حصے کے پکڑ لینا۔''

ذیشان نے دروازے میں منہ گھسا کر کہا اور پھر فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا۔ امی جان کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔

''بہت شریر ہے۔''

انہیں یوں بھی ذیشان سے بہت پیار تھا۔ فروا اور مجھ سے بھی زیادہ۔ ایک تو ذیشان ان کا لاڈلا بھانجا تھا دوسرا لڑکا۔ فروا سے تو پہلی اولاد ہونے کے ناتے انہیں کچھ نہ کچھ محبت تھی ہی لیکن مجھ سے تو بالکل ہی نہیں کیونکہ میں نے انہیں سخت ناامید کیا تھا۔ وہ بیٹے کی آس لگائے ہوئے تھیں اور میں آ گئی۔ یہ تو شکر ہے دادی نے میرا نام مشعال رکھ دیا ورنہ ان کا بس چلتا تو وہ مایوسی، ناامیدی کی طرح کا کوئی نام رکھ دیتیں میرا۔

''ہاں۔'' چچی نے بھی اماں کی تائید کی۔ ''بہت شریر ہے، لیکن اس کی شرارتوں پر پیار آتا ہے۔''

تائی جان کے ماتھے کی شکنیں بھی کم ہوگئیں۔

''بہت سمجھ دار ہے اور تابعدار بھی ہے میرا بچہ لیکن یہ پھاپھا کٹنی عنبرا سے بگاڑ نہ دے۔''

''یہ پھاپھا کٹنی کیا ہوتی ہے تائی اماں۔''

میں نے کان چھوڑ کر معصومیت سے پوچھا۔

جواباً انہوں نے مجھے غصے سے گھورا اور بھاگ جانے کا حکم دیا اور میں فضا کو ساز گار پا کر باہر نکل آئی اور ''پھاپھا کٹنی'' کا مطلب جاننے کی حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی لیکن شام کو جب ہم سب ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے تو میں نے فروا سے پوچھا۔

''فروا! یہ ''پھاپھا کٹنی'' کیا ہوتا ہے؟''

''بہت چالاک' مکار عورت۔'' فروا نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''وہ طلسمی محل۔کل میں نے تمہیں پڑھنے کو دی تھی نا' اس میں وہ جادوگرنی تھی اسے سب پھاپھا کٹنی کہتے تھے''

ماریہ نے میری معلومات میں اضافہ کیا تو مجھے از حد رنج ہوا اور مجھے بہت افسوس ہوا کہ تائی جان جھوٹ بھی بولتی ہیں' بھلا چچی جان ایسی کب ہیں۔کٹ کٹ جادوگرنی کی طرح۔

''ضرور یہ اماں نے عنبر چچی کے لیے کیا ہوگا حالانکہ چچی تو نیلم پری ہیں۔مہربان اور نیک نیلم پری۔جو ہر ایک سے محبت کرتی اور ہر ایک کے کام آتی ہے۔'' ذیشان تائی اماں کا مزاج آشنا تھا۔

''لگتا ہے۔اماں صحیح کہتی ہیں' عنبر چچی نے تمہیں کچھ گھول کر پلا دیا ہے۔'' میران نے اس کی سرگوشی سن لی تھی' جو سرگوشی ہرگز نہ تھی۔

میں عنبر چچی کے لیے کٹ کٹ جادوگرنی کے تصور سے اس قدر بیزار ہوئی بلکہ رنجیدہ ہوئی کہ وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگی کہ امی جان کا دل کیسے نرم کیا جائے کہ وہ مجھے عنبر چچی کے ہاں جانے کی اجازت دے دیں۔لیکن انہوں نے اجازت تو کیا دینی تھی الٹا عنبر چچی کو انیکسی سے نکال دیا گیا اور یہ صرف میری وجہ سے ہوا تھا۔مہینوں

بلکہ سالوں مجھے اس بات کا رنج ہوتا رہا کہ عنبر چچی' سحرش اور روشن میری وجہ سے بے گھر ہوئے ہیں۔

ہوا یوں کہ اس روز جب تائی جان اور امی جان نے حکم صادر کیا تھا کہ ہم آئندہ عنبر چچی کے ہاں نہیں جائیں گے تو اس صبح میں نے میران کے تکیے کے نیچے سے ابن صفی کا ''زمین کے بادل'' اڑایا تھا اور عنبر چچی کے ہاں بیٹھ کر پڑھ رہی تھی اور کھانے کے وقت میں نے اسے سحرش کے کمرے میں رکھا تھا اور کھانا کھاتے ہوئے اچانک ہی ذیشان آ گیا تھا۔

''مشی! تمہیں چچی بلا رہی ہیں۔'' اس نے فرنی کا باؤل اپنی طرف کھسکایا۔

''اچھا کھا کر جاتی ہوں۔''

''وہ ایک گھنٹے سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔''

میں جانتی تھی ذیشان کی عادت ہے خوامخواہ سسپنس پیدا کرنے کی لیکن پھر بھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اسی گھبراہٹ میں ناول وہاں ہی سحرش کے کمرے میں ہی رہ گیا تھا اور گھر آ کر مجھے یاد آیا تو میں نے سوچا شام کو لے آؤں گی لیکن شام کو تو پابندی ہی لگ گئی تھی اور جب دو تین دن بعد میران نے شور مچایا کہ اس کی کتاب نہیں مل رہی اور کرایہ چڑھ رہا ہے تو مجھے یاد آیا کہ وہ تو میں عنبر چچی کے ہاں چھوڑ آئی تھی۔

''ارے تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا' وہ تو میں۔''

''دراصل پہلے میران امی کے ڈر سے چپکے چپکے ڈھونڈ رہا تھا۔''

''امی منع کرتی ہیں نا جاسوسی ناول پڑھنے سے۔''

''اب اس کا کرایہ تم دو گی مشی!'' میران نے دانت پیسے۔

''دے دوں گی۔'' میں نے فراخدلی سے کہا کیونکہ میں نے ابھی تک اپنے اس ماہ کے جیب خرچ میں سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا تھا۔

''پہلے تو ناول دو مجھے۔'' میران سر پر کھڑا تھا۔

''صبر تو کرو۔''

میں نے باہر جھانک کر دیکھا کہ تائی اور امی کہاں ہیں تا کہ میدان صاف دیکھ کر بھاگ کر عنبر چچی کے ہاں سے کتاب لے آؤں۔

دراصل گھر میں میران کو اور مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا بہت شوق تھا۔عمران اور

حمید فریدی میرے پسندیدہ کردار تھے اور جب میران لائبریری سے کتاب لاتا' میں منتیں کر کر کے اس سے پڑھنے کے لیے لے ہی لیتی اور اگر کبھی اس کا موڈ نہ ہوتا تو وہ صاف انکار کر دیتا۔ لیکن میں بھی تلاش کر ہی لیتی' کیونکہ مجھے اس کے تمام خفیہ ٹھکانے پتا تھے اور اگر کبھی نہ ڈھونڈ سکی۔ تو ذیشان میری مدد کر دیتا۔ کیونکہ بعد میں اس کے بدلے وہ مجھ سے کئی کام کروا لیتا تھا۔ مثلاً جوتے پالش کروانا۔ کپڑے استری کرنا وغیرہ۔ ذیشان اور میران کا ایک ہی بیڈ روم تا جبکہ ثوبان دس سال کا ہونے کے باوجود ابھی تک تائی جان کے کمرے میں سوتا تھا یوں اس کا اور انصر کا ایک ہی کمرہ تھا۔

''اب لا بھی چکو۔'' میران کو جلدی تھی۔

سو میں ادھر ادھر چوروں کی طرح دیکھتی رہی جب عنبر چچی کے ہاں پہنچی تو عنبر چچی برآمدے میں بیٹھی سبزی کاٹ رہی تھیں۔

''ارے مشی! میری جان اتنے دنوں بعد آئی ہو' میں تو پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں خدانخواستہ طبیعت ناساز نہ ہو۔'' انہوں نے اٹھ کر فوراً مجھے لپٹا کر پیار کیا۔

''نہیں عنبر چچی! میں بالکل اچھی ہوں۔ اس وقت کتاب لینے آئی ہوں۔ سحرش کے کمرے میں بھول گئی تھی۔''

''ہاں ہاں' وہ سامنے ٹیبل پر ہی پڑی ہے۔''

میں نے فوراً ٹیبل سے کتاب اٹھائی اور واپسی کے لیے پلٹی۔

''سحرش باتھ لے رہی ہے' بیٹھو نا' ابھی آتی ہے بہت یاد کر رہی تھی تمہیں۔''

''پھر آؤں گی میران انتظار کر رہا ہے۔''

میں تیزی سے واپس آ رہی تھی اور ابھی درمیان والی باڑھ عبور کر رہی تھی کہ امی نے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا۔

''کیسی ناخلف اولاد ہے تو' ارے ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے منع کیے اور تو پھر وہاں پہنچ گئی۔''

اس اچانک افتاد نے مجھے بوکھلا دیا' میں گرتے گرتے بچی۔

''یہ یہ کتاب ادھر رہ گئی تھی' لینے گئی تھی۔''

''بھاڑ میں جائے کتاب۔''

اماں نے ہاتھ سے کتاب چھین کر اچھال دی' جسے لاؤنج سے باہر آتے میران نے کیچ کر لیا اور دانت نکالتا ہوا گیٹ کی طرف لپکا' میں میران کو دیکھ رہی تھی کہ اماں نے دو ہتھڑ میری پیٹھ پر لگائے۔

''بدبخت، منحوس۔ ایک وہ فروا ہے جو بات کہو مان لیتی ہے اور ایک تو ہے نہ شکل نہ صورت اور اوپر سے نافرمان بھی۔''

اماں نے میرے لمبے بالوں کی چوٹی پکڑ کر کھینچی۔

''اماں! بال تو چھوڑیں۔ درد ہو رہا ہے قسم سے میں تو صرف کتاب لینے گئی تھی اور وہاں رکی ہی نہیں ذرا۔''

''بہو! کیا ہوا' بچی کو کیوں ڈانٹ رہی ہو؟''

اس وقت دادی کی آمد مجھے کسی فرشتے سے کم نہ لگی' رحمت کے فرشتے کی طرح انہوں نے اماں کے ہاتھ سے میرے بال چھڑوائے۔

''ماں جی! یہ بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔'' اماں نے مظلوم بن کر کہا۔

''اتنی بار منع کیا ہے کہ عنبر کی طرف مت جایا کرو' تمہاری دادی پسند نہیں کرتیں لیکن جب دیکھو بھاگی جا رہی ہے ادھر۔''

حالانکہ یہ پہلا موقع تھا جب اماں نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔ لیکن دادی کے سامنے اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے جب دیکھو کا لفظ لگا لیا تھا تو میں نے بھی اپنے جرم کی سنگینی کم کرنے کے لیے فوراً ذیشان کا نام لے دیا۔

''شانی بھی تو جاتا ہے اور جب سے تائی اماں اور اماں نے منع کیا ہے میں نہیں گئی اور وہ تو آج کتاب لینے گئی تھی۔''

میں نے پوری تفصیل دادی کے گوش گزار کی اور اماں کو ان کی طرف متوجہ پا کر چپکے سے کھسک لی اور دل ہی دل میں دادی زندہ باد کا نعرہ لگایا حالانکہ اس سے پہلے میرے اور دادی کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے تھے کیونکہ دادی جب بھی تینوں بہوؤں کے بیچ بیٹھتیں تو عنبر چچی کو برا بھلا کہنے لگتیں اور انہیں خوب خوب کوسنے دیتیں۔

''منحوس ڈائن میرے توقیر کو کھا گئی۔ میرا ہیروں جیسا بیٹا رل گیا اس کی وجہ سے''۔ حالانکہ ایسا بالکل بھی نہ تھا جتنا عنبر چچی توقیر چچا کا خیال رکھتی تھیں اتنا تو اماں' تائی

جان اور چچی بھی اپنے اپنے شوہروں کا نہ رکھتی تھیں۔

اماں کے شکنجے سے نکل کر میں سیدھی میران کے کمرے میں گئی اور حسبِ معمول اس کے گدے کے نیچے سے ایک عمران سیریز ڈھونڈ کر اپنے کمرے میں آ کر فروا کے بیڈ پر لیٹ کر پڑھنے لگی، کیونکہ میرے بیڈ پر میرا اسکول بیگ کھلا پڑا تھا اور کتابیں بکھری تھیں۔

باہر اماں، تائی اور چچی میں کیا میٹنگ ہوئی تھی اور دادی نے کیا فیصلہ سنایا تھا مجھے اس کی خبر نہ تھی، میں تو پڑھتے پڑھتے وہاں ہی سو گئی تھی اور میری آنکھ تو ذیشان کی آواز سے کھلی تھی۔

''مشی! مشی! اٹھو بات سنو۔'' اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے جھنجھوڑا۔

اماں نے بھی دن میں اسی بازو کو پکڑا تھا اور پہلے ہی درد ہو رہا تھا۔

''کیا آفت آ گئی ہے'' میں نے بازو کو سہلایا۔

''تائی اماں نے عنبر چچی کو گھر خالی کر دینے کا حکم دیا ہے۔'' ذیشان بے حد اداس لگ رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' مجھے حیرت ہوئی۔

''کیا تم پھر گئی تھیں عنبر چچی کی طرف۔''

''ہاں!'' میں نے اسے ساری بات بتا دی۔

''شاید اسی لیے۔'' وہ اٹھ کر چلا گیا اور میں عجیب سے احساس جرم میں گھری بیٹھی رہ گئی۔ اس رات میرا کھانا کھانے کو جی ہی نہ چاہا۔ میں صرف دو نوالے لے کر اٹھ آئی۔ حالانکہ ابا نے پوچھا بھی۔

''کیا ہوا مشی بیٹا؟''

''بھوک نہیں ہے''۔

میں نے دیکھا ذیشان بھی تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالے چمچ سے کھیل رہا تھا۔

اس رات دیر تک دادی کے کمرے میں سب بیٹھے رہے اور میں اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر بیٹھی سوچتی رہی کہ کیا واقعی عنبر چچی یہاں سے چلی جائیں گی اور میرا دل بھر بھر آتا رہا۔

عنبر چچی سے مجھے بہت محبت تھی، جب وہ اس گھر میں نہیں آئی تھیں تب سے ہی وہ مجھے اچھی لگتی تھیں۔ کبھی کبھار تو قیصر چچا مجھے اپنے ساتھ گھمانے لے جاتے تو ہم عنبر چچی کے ہاں بھی جاتے اور تب عنبر چچی ہماری بہت خاطر کرتیں، مجھے پیار کرتیں اور مجھ سے پوچھ کر میری پسند پر چپس تلتیں اور پھر عنبر چچی کا گھر بھی بہت خوبصورت تھا۔

گو وہ ہمارے گھر کی طرح بڑا نہ تھا۔ لیکن اس کے لان میں بے شمار رنگ کے گلاب تھے اور ایک خوبصورت جھولا تھا جس پر جھولنا مجھے اچھا لگتا تھا، بوگن ویلیا کی بیلیں برآمدے کے ستونوں سے لپٹی تھیں، سرخ آتشی گلابی اور سفید پھولوں سے بھری۔ پھر سحرش اور روشن کا بیڈ روم کتنا خوبصورت تھا آسمانی جھالر والا نرم نرم بیڈ کور اور شوکیس میں سجی خوبصورت گڑیا۔ جبکہ دادی جان تو گڑیوں کے سخت خلاف تھی۔

''توبہ ہے، آخرت میں جان ڈالنی پڑے گی۔ سخت گناہ ہے۔''

ایک بار ابا فروا کی ضد پر گڑیا لائے تھے اور دادی اماں نے عاقبت اور آخرت کے عذاب سے اس قدر ڈرایا تھا کہ اماں نے فوراً وہ گڑیا ڈبے میں بند کر کے آنٹی کی بیٹی کی سالگرہ پر اسے گفٹ کر دی تھی۔

''اب شاید عنبر چچی پھر اسی گھر میں جا کر رہیں۔''

میں نے خود کو تسلی دی۔

''اچھا ہے وہ گھر اس گھر سے تو ہزار درجے اچھا ہے اور وہاں سحرش کا اور روشن کا بیڈ روم کتنا اچھا ہے اور روشن کے کمرے کی کھڑکی بھی جو لان کی طرف کھلتی ہے جہاں ڈھیروں ڈھیر پھول کھلتے ہیں۔ موتیا کے جھاڑ نے ساری کھڑکی کو ڈھک رکھا ہے اور اس کا کمرہ موتیے کی خوشبو سے مہکا رہتا ہے اور کتنا مزہ آئے گا جب چاچو کے ساتھ میں وہاں جاؤں گی۔'' لیکن چاچو تو تھے ہی نہیں۔ میں پھر افسردہ سی ہو گئی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات دیر تک جاگتی رہی تھی اس لیے اگلی صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی اور جب میں منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو دس بج چکے تھے اور میرا ناشتہ ٹیبل پر ڈھکا رکھا تھا۔ میں نے ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھایا۔

''آہا! مولی کے پراٹھے۔'' میرا دل خوش ہو گیا اور میں مزے سے پراٹھا کھانے

لگی اور ابھی پراٹھا کھا کر میں نے دودھ کا گلاس اٹھایا ہی تھا کہ ماریہ نے اطلاع دی۔

''عنبر چچی گھر چھوڑ کر چلی گئیں۔''

''کہاں؟'' بے اختیار میرے لبوں سے نکلا۔

''پتا نہیں۔'' ماریہ نے کندھے اچکائے۔

''اماں کہہ رہی تھیں' دادی نے کہا ہے انہیں گھر چھوڑنے کو حالانکہ ابا نے تو کہا تھا ہمارا کیا لیتی ہے۔ مگر پتا نہیں کیوں دادی نے نکال دیا۔ کیا وہ بری عورت ہیں مشی! تم تو جاتی ہونا ان کی طرف۔''

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ وہ تو اچھی ہیں' سب سے اچھی! ماں' تائی اور چچی سے بھی زیادہ اچھی۔''

میں گلاس ٹیبل پر رکھ کر رونے لگی اور پھر کتنے ہی دن میں نے سوگ منایا۔ کسی کھیل میں شرکت نہ کی۔ عنبر چچی مجھے بہت یاد آتیں۔ سحرش بھی اور روشن بھی۔ دبلا پتلا سانولا سا روشن گو مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا بس ہر وقت پڑھتا رہتا تھا اور ذیشان ہمیشہ اسے روشن چراغ کہہ کر بلاتا تھا اور کبھی کبھی سحرش کے ساتھ مل کر اسے تنگ کرتا دونوں تالیاں بجا بجا کر گاتے۔

روشن چراغ کرنا
ماچس ذرا دکھانا
ہوا کو روک لینا
روشن چراغ کرنا

اور روشن ناراض ہو دیتا بنا کچھ کہے اٹھ کر چل دیتا تو ذیشان بھی اس کے پیچھے جا کر منٹوں میں اسے منا لیتا اور کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں گلے میں بانہیں ڈالے واپس آتے اور کیرم کے گرد بیٹھ جاتے۔ روشن کے ہاتھ میں کتاب نہ ہوتی اور تب وہ باتیں بھی کرتا ہنستا بھی لیکن اس کی آنکھیں ہمیشہ اداس رہتی تھیں پتا نہیں کیوں؟ وہ تقریباً ذیشان کا ہم عمر تھا اور سحرش میری ہم عمر تھی اور چچی کے گھر کتنا مزہ آتا تھا اور کبھی کبھی ہم چاروں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اونچی آواز میں گاتے۔

روشن چراغ کرنا

دل کو فراخ کرنا
دکھ نہ کسی کو دینا
روشن چراغ کرنا

یہ تک بندی ذیشان نے ہی کی تھی' لیکن اسے گاتے ہوئے بہت مزہ آتا تھا اور چچی ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہتیں اور جب چچا زندہ تھے تو اکثر وہ بھی اپنی آواز ساتھ ملا لیتے' روشن چراغ کرنا۔

لیکن اب تو سب کچھ ختم ہو گیا تھا' پہلے چچا چلے گئے اللہ میاں کے پاس اور اب چچی بھی واپس چلی گئی تھیں۔ سب سے زیادہ تو میں ہی ان کے یہاں آنے پر خوش ہوئی تھی۔

چھٹیوں میں تو ہر روز ہی میرال دکھا' عنبر چچی کے لیے لیکن دسمبر کی چھٹیاں ہی کتنی ہوتی ہیں جیسے ہی اسکول کھلے اسکول کی مصروفیت میں وہ شدت نہ رہی تھی ان کی یاد کی' تاہم میں انہیں بھولی نہ تھی ایک بار میں نے ذیشان سے پوچھا تھا کہ کیا اسے عنبر چچی کے پرانے گھر کے متعلق معلوم ہے۔ میرا خیال ہے وہ وہاں ہی گئی ہوں گی۔

''ہاں شاید لیکن مجھے وہ گھر ٹھیک طرح سے معلوم نہیں۔ غالباً ثمن آباد میں کہیں ہے۔ لیکن صحیح پتا معلوم نہیں۔''

اور وہ جو میرے دل میں ایک امید سی تھی کہ ذیشان کو ضرور چچی کا گھر معلوم ہوگا مایوسی میں بدل گئی تھی۔

''اب شاید ہم عنبر چچی کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے'' میں نے سوچا تھا اور پڑھائی میں دل لگانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

''تایا' ابا' چچا اور توقیر چچا چار بھائی تھے اور توقیر چچا جو سب سے چھوٹے اور دادی کے بے حد لاڈلے تھے۔

ایک بار میرے پوچھنے پر کہ دادی عنبر چچی سے نفرت کیوں کرتی تھیں' فروا نے مجھے بتایا تھا۔ تایا اور ابا کی شادی اپنی خالہ کے گھر ہوئی تھی اور چچا کی پھوپھی کے ہاں جبکہ توقیر چچا کے لیے دادی نے بچپن سے ہی اپنے بھائی کی بیٹی کو پسند کر رکھا تھا لیکن چچا کسی صورت مانتے ہی نہ تھے۔

تایا' اور چچا تو دادا جان کے ساتھ بزنس میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے جبکہ توقیر چچا

نے الیکٹریکل انجینئرنگ کا امتحان پاس کر کے کسی بڑی کمپنی میں جاب کر لی تھی اور دادی ہمہ وقت ان کے پیچھے پڑی رہتیں۔

''اب تو تیری پڑھائی بھی ختم ہوئی نوکری بھی ہوگئی' اب تو شادی پر تجھے اعتراض نہیں ہونا چاہیے اور مہوش کب تک انتظار میں بیٹھی رہے۔''

''تو کس نے کہا تھا انتظار کرنے کو۔ آپ ماموں سے کہہ دیں نا وہ جہاں جی چاہے مہوش کی شادی کر دیں۔''

چچا کہہ کر چلے بنتے۔

''کھلنڈرا ہے دو چار سال میں مان جائے گا۔''

دادی کو یقین تھا۔

توقیر چچا ہم سب کے پسندیدہ تھے۔

ہمارے ساتھ کیرم کھیلتے' لڈو میں بے ایمانیاں کرتے' ہمارے لیے ڈھیر سارے چاکلیٹ اور آئس کریم لاتے اور میرے لیے اماں سے لڑتے۔ میرے تو وہ سب سے زیادہ اپنے تھے۔ تایا کے تین بیٹے تھے۔ ذیشان' ثوبان اور میران۔ ذیشان سب سے بڑا تھا میران اس سے چھوٹا تقریباً میرا ہم عمر اور ثوبان سب سے چھوٹا۔

اور ہم دو ہی بہنیں تھیں۔ فروا اور میں۔

ذیشان کے بعد جب تائی کے ہاں میران پیدا ہوا تو اماں کو بھی پورا یقین تھا کہ ان کے ہاں بھی لڑکا ہی ہو گا لیکن بدقسمتی سے ان کے ہاں میں پیدا ہوگئی تھی اور کچھ سوکھی سڑی' کمزور اور سانولی سی تھی۔ چہرے پر بس آنکھیں ہی آنکھیں دکھتی تھیں۔ چونکہ اماں میری پیدائش پر ہرٹ ہوئی تھیں اس لیے' وہ اپنا غصہ مجھ پر نکالتی تھیں۔ جوں جوں میں بڑی ہوتی گئی میرے نقوش نکھرتے گئے۔ میں توقیر چاچو سے بہت مشابہ تھی۔

ایسی ہی آنکھیں' پیشانی اور ناک البتہ ہونٹ اماں جیسے تھے اور دائیں رخسار پر عین ہڈی کے اوپر ننھا سا تل' چاچو مجھ سے بہت پیار کرتے تھے اور اماں سے میرے لیے لڑتے تھے۔

''بھابی! آپ کا رویہ صحیح نہیں ہے اس کے ساتھ بڑی ہو کر یہ کسی نہ کسی احساسِ کمتری میں شکار ہو جائے گی۔''

لیکن توقیر چچا کے بار ہا کہنے کے باوجود اماں [illegible] ہو ائیں فروا سے تھی۔ لیکن شاید یہ بچپن میں توقیر چچا کی دی گئی [illegible] کوئی احساسِ کمتری پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ میں جو بچپن میں [illegible] لاابالی سی تھی [illegible] پڑھائی سے زیادہ جاسوسی ناول پڑھنے سے دلچسپی تھی۔ لیکن باشعور ہوتے ہی میں [illegible] پڑھائی کی طرف توجہ دینی شروع کر دی تھی اور خاصی اچھی اسٹوڈنٹس میں میرا شمار ہونے لگا تھا۔

پہلی بار جب توقیر چچا مجھے عنبر چچی کے گھر لائے تھے تو میری عمر صرف آٹھ سال کی تھی اور چچا مجھے اس روز گھمانے لے گئے تھے اور آئس کریم کھلا کر جب وہ مجھے واپس لا رہے تھے تو انہیں ایک دوست مل گیا تھا اور جب وہ دوست سے باتیں کرنے لگے تو میں ان کا ہاتھ چھڑا کر آگے ہی آگے بھاگنے لگی تھی' گاڑی کی طرف اور میرا پاؤں پھسل گیا تھا۔ یا ٹھوکر لگی تھی کسی چیز سے کہ میں منہ کے بل گر پڑی تھی اور میرے سر پر چوٹ لگی تھی اور ناک سے خون بہنے لگا تھا' توقیر چچا مجھے عنبر چچی کے گھر لے گئے تھے جو قریب ہی تھا اور تب عنبر چچی نے میری ڈریسنگ کی تھی فوراً اور مجھے کھیلنے کیلئے سحرش کی گڑیا دی تھی اور وہ روشن آنکھوں والا روشن میرے پاس بیٹھ کر مجھے تسلی دیتا رہا تھا کہ یہ تو بالکل معمولی سی چوٹ ہے اور وہ تو اتنا بہادر ہے کہ بڑی سے بڑی چوٹ پر بھی نہیں روتا اور جلد ہی میں چوٹ کا خیال چھوڑ کر کھیلنے لگی تھی سحرش اور عنبر چچی نے اس روز مجھے بے تحاشا چوما تھا اور توقیر چچا سے کہا تھا۔

''آپ نے صحیح کہا تھا مشعال تو بالکل آپ کا بچپن لگتی ہے' اتنی مشابہت''

اور وہیں میں نے عنبر چچی کی امی کو بھی دیکھا تھا۔

''یہ ہماری نانی جان ہیں۔'' سحرش نے تعارف کروایا تھا۔

اور عنبر چچی کی طرح مجھے ان کی امی بھی ہمیشہ جب تک وہ زندہ رہیں' بہت اچھی لگتی تھیں۔ وھیل چیئر پر بیٹھی ادھر سے ادھر گھومتی پھرتیں اور ہمیں مزے مزے کی کہانیاں سناتیں۔

فروا نے مجھے بتایا تھا کہ توقیر چچا عنبر چچی سے محبت کرنے لگے تھے۔ عنبر چچی جوان کے کسی پروفیسر کی بیٹی تھیں اور ایک بار جب پروفیسر زبیر اچانک کالج میں بیمار ہو گئے تو انہیں ہاسپٹل لے جایا گیا تو توقیر چچا ہی تھے جو ان کے گھر اطلاع دینے گئے تھے اور پھر ان کے صحت یاب ہونے کے بعد بھی ان کے گھر جاتے رہتے تھے' اور بیماری کے دنوں میں تو

انہوں نے بہت خیال رکھا تھا' پروفیسر زبیر کا۔ کیونکہ وائف معذور تھیں اور صرف ایک بیٹی عنبر زبیر۔ عنبر ایسی تھی کہ اس سے محبت ہو جانا کوئی انہونی نہیں تھی۔ چچا کی حیثیت ان کے گھر کے فرد جیسی ہو گئی تھی اور ظاہر ہے جب آنا جانا ہوا تو عنبر چچی کی خوبیاں بھی ان پر ظاہر ہوئیں اور وہ مہوش سے شادی سے منکر ہو گئے۔ پروفیسر زبیر پر دل کا دوسرا اٹیک ہوا تو وہ عنبر کے لیے بہت پریشان ہو گئے۔

''مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا توقیر! لیکن مجھے صالحہ اور عنبر کی فکر ہے۔ صالحہ معذور ہے اور عنبر بہت معصوم۔ میں چاہتا ہوں توقیر! کوئی ایسا لڑکا ہو جو گھر داماد بن کر رہ سکے' نہیں تو عنبر کی شادی کے بعد صالحہ کا کیا ہوگا۔

اور تب توقیر نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔

''میرے والدین ممکن ہے فی الوقت راضی نہ ہوں' کیونکہ ابھی میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ لیکن جلد یا بدیر وہ راضی ہو جائیں گے بلکہ جاب کرتے ہی میں انہیں عنبر کے متعلق بتا دوں گا۔ گو میں یہ شادی جاب کے بعد ہی کرنا چاہتا تھا لیکن آپ کی تسلی کے لیے حاضر ہوں' اگر آپ چاہیں تو ابھی نکاح کر دیں۔''

یوں توقیر چچا کا نکاح عنبر چچی سے ہو گیا اور نکاح کے چند ہی دنوں بعد تیسرا اٹیک پروفیسر زبیر کو زندگی سے دور لے گیا۔ یہ وہ دن تھے جب توقیر چچا پڑھائی کے بہانے ہوسٹل منتقل ہو گئے تھے اور دادا دادی نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا ظاہر ہے بھرے گھر میں پڑھائی مشکل تھی چار کنال پر پھیلے ہوئے اس گھر میں چار پورشن تھے' گیٹ ایک ہی تھا اور اندر وسیع لان کے دونوں اطراف میں رہائشی کمرے تھے۔ ہاں ایک ہی تھا' سب مل جل کر کھاتے تھے۔ کھانا' ایک ہی کچن میں بنتا تھا۔

یوں توقیر چچا عنبر چچی کے ہاں چلے گئے تھے اور صالحہ زبیر نے ان کا تعارف تمام عزیز واقارب میں بحیثیت داماد کروایا تھا کہ ہر آیا گیا جو پرسے کے لیے آتا ان کے متعلق پوچھتا تھا کئی مطلب خور بھی صالحہ کے گرد اکٹھے ہوئے' لیکن پھر توقیر چچا کی وجہ سے جلد ہی انہوں نے بوریا بستر سنبھال لیا۔

اور پروفیسر زبیر کے چالیسویں کے بعد ہی مسز صالحہ زبیر نے عنبر کی باقاعدہ رخصتی کر دی مختصر سی تقریب میں' تاکہ لوگوں کی زبانیں بند ہو سکیں۔ جنہیں توقیر کے وہاں رہنے پر

اعتراض تھا گو قریبی عزیز تو کوئی نہ تھا سب دور پرے کے رشتے دار تھے لیکن یہ ضروری ہو گیا تھا۔ مسز صالحہ نے بار بار چچا سے معذرت کی کہ ان کی پڑھائی کے دوران ہی انہیں ڈسٹرب کر دیا گیا لیکن چچا مسکرا دیتے۔

''کوئی بات نہیں آنٹی۔''

عنبر چچی بھی ابھی پڑھ رہی تھی۔ روشن کی پیدائش کے بعد انہوں نے اپنا گریجویشن مکمل کیا تھا۔

چچا توقیر نے حسبِ وعدہ جاب کے بعد گھر میں اپنی شادی کے بارے میں بتا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ وہ صالحہ آنٹی کی معذوری کی وجہ سے مستقل وہیں رہیں گے' البتہ گھر ملنے آتے رہیں گے۔ دادی نے خوب واویلا کیا' روئیں' پیٹیں عنبر کو برا بھلا کہا' گالیاں دی۔ لیکن ظاہر ہے اب کیا ہو سکتا تھا نہ صرف یہ کہ شادی ہو چکی تھی بلکہ چچا توقیر دو بچوں کے باپ بھی بن چکے تھے۔

''چلو اچھا ہوا'' داداجان نے یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا۔

''شادی کے جھنجھٹ سے نجات مل گئی تو میاں کب ملوا رہے ہو اپنی دلہن سے۔''

''آج ہی۔'' توقیر چچا کھل اٹھے۔

دادی بظاہر تو خاموش ہو گئی تھیں لیکن اندر ہی اندر انہیں ازحد رنج تھا اور یہ رنج اور بڑھ گیا جب اکلوتا بھائی ناراض ہو گیا اور اس نے بہن سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کر لیا۔

حالانکہ توقیر چچا دوبار ماموں سے ملنے گئے کہ ''اماں کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے ساری غلطی میری ہے۔ سو مجھ سے زندگی بھر کلام نہ کریں مگر اماں سے قطع تعلق نہ کریں۔'' لیکن ماموں نے ان کی بات نہ سنی۔

عنبر چچی پہلی بار گھر آئیں تو دادی نے ان سے کلام تک نہ کیا اور نہ ہی بچوں کی طرف دیکھا بلکہ منہ پھیر کر اندر چلی گئیں۔ البتہ دادا نے انہیں پانچ ہزار روپے دیے اور بچوں کو بھی ایک ایک ہزار دیا۔ گھر کے سب افراد کو ہی عنبر چچی بے حد پسند آئی تھیں۔ گپلو سا روشن اور پریوں جیسی سحرش پر تو اماں کو بھی ایک دم پیار آ گیا تھا۔ سب ہی عنبر چچی سے اچھی طرح ملے تھے گو دل ہی دل میں اماں اور تائی کو ماموں کے گھر توقیر کی شادی نہ ہو سکنے کا ازحد رنج تھا۔

''اماں پلیز! معاف کر دیں' میری غلطی اور عنبر کو قبول کر لیں۔'' توقیر چچا نے دادی اماں کے پاؤں پکڑ لیے' لیکن انہوں نے تو اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔

''توقیر! تو نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ ایسا نہ ہو میرے منہ سے کوئی بددعا نکل جائے۔ اس وقت چلا جا اور آئندہ کبھی عنبر کو لے کر میری زندگی میں اس گھر میں مت آنا۔''

''اماں! کیا میں بھی' میں بھی نہ آؤں۔'' توقیر چچا نے تڑپ کر پوچھا۔

''بھائی جان' بڑے بھیا' چھوٹے بھیا ان سب کو دیکھے بغیر میں کیسے جی پاؤں گا اور یہ بچے ان میں تو میری جان ہے! اماں اتنا ظلم مت کریں' آپ سب سے بچھڑ کر میں مر جاؤں گا۔''

تب دادی نے چچا کو اجازت دے دی کہ وہ آ سکتے ہیں سب سے ملنے۔ البتہ عنبر پر اس گھر کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ گو دادا نے ایک دو بار دبی زبان میں کہا بھی کہ ''اگر کبھی کبھار توقیر کی دلہن اور بچے ملنے آ جائیں تو کیا حرج ہے۔'' تو دادی بھڑک اٹھیں۔

''ٹھیک ہے اگر وہ آئیں گے تو پھر میں چلی جاتی ہوں۔''

یوں عنبر چچی تو نہ آتیں البتہ چچا توقیر آ جاتے۔ ہم سب ہنستے' کھیلتے' باتیں کرتے ہمیں گھمانے لے جاتے۔ لیکن ان کی آنکھیں اداس اداس سی لگا کرتیں ہمیشہ' دادی ان سے بات نہیں کرتی تھیں جتنی دیر وہ رہتے وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلتی تھیں۔

انہیں رنج تھا کہ توقیر چچا کی وجہ سے ان کا اکلوتا بھائی ان سے چھوٹ گیا تھا۔

''میں اماں کا مجرم ہوں۔ میں نے ان کا دل دکھایا ہے'' وہ اکثر کہتے تھے۔

''سو اماں جو بھی سزا دیں' مجھے منظور ہے۔'' لیکن انہیں یقین تھا کہ ایک روز دادی مان جائیں گی۔

''دیکھ لینا مشعال! ایک روز اماں مجھے معاف کر دیں گی۔''

ایک بار انہوں نے مجھ سے کہا تھا۔ جب میں سحرش کو اپنے ساتھ گھر لے جانے کی ضد کر رہی تھی۔

''تب ہم سب آئیں گے وہاں۔''

اس پہلی بار کے بعد جب میں زخمی ہوئی تھی اور چچا مجھے ادھر لے گئے تھے کئی بار میں چچا کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی اور میری سحرش سے بہت دوستی ہو گئی تھی اور روشن سے بھی اگر بہت دن گزر جاتے تو عنبر چچی خود ہی مجھے بلوا بھیجتی تھیں۔

''چلو یار! تمہاری چچی تمہارے لیے اداس ہو رہی ہیں۔'' اور جب ایک بار مجھے بخار ہو گیا تھا تو میں نے بہت ضد کی تھی کہ وہ سحرش اور روشن کو لائیں۔ تو چچا بے حد اداس ہو گئے تھے اور بہت دیر تک مجھے بہلاتے رہے تھے۔

''ایک دن ضرور لاؤں گا جانو لیکن بس اماں مان جائیں۔'' اور پھر ان ہی دنوں میں عنبر چچی کی امی کا انتقال ہو گیا تو دادا نے ایک بار پھر کہا دادی سے ''کہ وہ توقیر کو معاف کر دیں اور عنبر اور بچوں کو گھر لے آئیں۔ اب تو توقیر اس گھر میں رہنے کا پابند بھی نہیں رہا یوں بھی تمہاری خواہش تھی کہ سب بچے اکٹھے رہیں۔''

''ہاں خواہش تھی۔ لیکن توقیر کے لیے میں نے اپنے دل کے دروازے بند کر لیے' ہمیشہ کے لیے اور آج کے بعد آپ مجھ سے کبھی یہ مت کہیے گا۔ خوامخواہ میں نافرمانی کی مرتکب ہوتی ہوں۔''

لیکن بعض اوقات انسان جو کہتا ہے' جو سوچتا ہے وہ ہوتا نہیں ہے۔ دادی بھی اپنے کہے پر قائم نہیں رہ سکی تھیں۔ توقیر چچا کے برین ٹیومر ہو گیا تھا۔ لڑکپن سے ہی ان کے سر میں درد رہتا تھا۔ کبھی کبھی الٹیاں بھی ہو جاتی تھیں اور یہ ہی خیال تھا کہ مگرین (آدھے سر کا درد) ہے۔ لیکن اب کے جو انہیں درد ہوا تو درد کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ عنبر چچی انہیں ہاسپٹل لے کر گئیں مختلف ٹیسٹ ہوئے تو پتا چلا کہ دماغ میں ٹیومر ہے۔ یہ ایسی خبر تھی کہ جس نے سب کو دہلا دیا سب ہی ہاسپٹل پہنچ گئے تھے سوائے دادی اماں کے اور دادی اماں بھی جائے نماز بچھائے مسلسل دعا کر رہی تھیں۔

اور آپریشن سے پہلے توقیر چچا نے دادا جان سے درخواست کی کہ وہ عنبر کو اور انہیں گھر آنے کی اجازت دے دیں۔ بلکہ وہ عنبر کے ساتھ انیکسی میں رہ لیں گے لیکن انہیں یہ اطمینان ہو گا کہ عنبر بچوں کے ساتھ اکیلی نہیں ہیں محفوظ ہیں۔ سب کے ساتھ ہیں۔

دادا جان نے اب کی بار دادی سے کچھ پوچھے بغیر انہیں اجازت دے دی تھی کہ وہ عنبر کے ساتھ گھر آ سکتے ہیں اور ان کے ہاسپٹل سے آنے سے پہلے ہی انہوں نے انیکسی صحیح کروائی تھی۔ وسیع لان کے ایک طرف ایل کی شکل میں یہ انیکسی تھی اور ساتھ ہی سرونٹ کوارٹر تھا۔ انیکسی طویل عرصے سے بند پڑی تھی۔ دادا جان نے نہ صرف یہ کہ وائٹ واش

کے بعد اسے فرنشڈ کروایا۔ بلکہ اس میں ایک بیڈ روم اور بھی بنوا دیا۔ دادی نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ یوں چچا انیکسی میں منتقل ہو گئے تھے اور عنبر آنٹی والے گھر کی نچلی منزل کرائے پر چڑھا کر اوپر والی منزل میں سارا سامان بند کر دیا تھا۔ اسکیننگ وغیرہ کے بعد آپریشن تجویز کیا گیا تھا۔ ابا اور تایا چاہتے تھے کہ آپریشن باہر سے کروایا جائے۔ دادا کی بھی یہی مرضی تھی لیکن چچا نے انکار کر دیا۔

''اس سے فرق نہیں پڑتا' یہاں بھی بہت کامیاب آپریشن کیے جاتے ہیں۔ زندگی ہوئی تو یہاں بھی سب ٹھیک ہو جائے گا' لیکن زندگی ہی دغا دے گئی تو پھر وہاں دیار غیر میں جا کر کیا مرنا......''

ابا' تایا اور چچا ان دنوں چپکے چپکے روتے تھے' اس لیے کہ ٹھیک ہونے کے چانسز ایک فی صد بھی نہ تھے۔ شاید چچا عنبر چچی اور بچوں سے دور نہیں جانا چاہتے تھے۔ ورنہ ابا نے تو امریکہ کا ویزہ بھی لگوا لیا تھا۔

آپریشن سے ایک دن پہلے وہ دادی جان کے پاس آئے تھے اور ان کے پاؤں پر سر رکھے بہت دیر تک روتے رہے تھے۔

''اماں! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ آپ کو تکلیف دی ہے۔ حالانکہ میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو میری ذات سے رنج پہنچے۔ اماں! میں نے آپ سے بہت محبت کی ہے اب بھی کرتا ہوں مجھے اس بات پر شرمندگی نہیں ہے کہ میں نے عنبر سے شادی کیوں کی ہے۔ ہاں اس پر شرمندہ ہوں کہ آپ کا دل دکھایا ہے۔ اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دیں تاکہ موت کا استقبال میں حوصلہ مندی سے کر سکوں۔''

اور تب دادی جان کا ضبط شاید جواب دے گیا تھا کہ انہوں نے انہیں سینے سے لگا لیا۔

آپریشن کے بعد جب چچا گھر آئے تو پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ سر کے بال غائب اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھی۔ وہ اکثر اپنی کرسی پر بیٹھے کچھ نہ کچھ لکھتے اور پڑھتے رہتے۔ جب بچے اسکول سے آتے تو انہیں پاس بٹھا کر جانے ہولے ہولے کیا کیا سمجھاتے رہتے تھے۔ میں اور ذیشان جاتے تو ہمیں بھی پاس بٹھا لیتے کبھی کبھی عنبر چچی سے کہتے۔

''جب میں نہ رہا تو مشعال کو دیکھ لینا۔ میرا عکس نظر آئے گا تمہیں۔''

سب ہی کہتے تھے اگر میں لڑکا ہوتی تو بالکل توقیر چچا کی کاپی ہوتی۔

جس روز انہیں بجلی کے شاٹ لگتے۔ اس روز ان کی حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔ ہاسپٹل سے گھر آ کر وہ بے دم سے ہو کر لیٹ جاتے تھے اور عنبر چچی پاگلوں کی طرح ان کے بستر کے گرد چکراتی رہتیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بہتے رہتے' پھر ہولے ہولے ان کی طبیعت سنبھلنے لگی وہ لان تک آ جاتے کبھی ہماری طرف آ جاتے اور دیر تلک دادی جان کی گود میں سر رکھے لیٹے رہتے۔

''میں اپنے آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اماں نے مجھے معاف کر دیا ہے اور میرے بچے بے سہارا نہیں ہوں گے''

ان کے مزاج میں بھی شگفتگی آ گئی تھی۔

''شاید خدا نے مجھے میرے بچوں کے لیے اور تمہارے لیے بچا لیا ہے۔'' ایک بار انہوں نے عنبر چچی سے کہا تھا۔

ان کے سر پر بال بھی آ گئے تھے اور وہ پہلے کی طرح لگنے لگے تھے۔ ہنس مکھ اور خوش باش۔

میں اور ذیشان تو اکثر شام کو ان کی طرف چلے جاتے تھے ذیشان کی روشن سے بہت دوستی ہو گئی تھی' یہ ڈیڑھ سال بہت خوشگوار گزرا' ان ہی دنوں ذیشان نے روشن چراغ والی نظم گھڑی تھی اور ہم سب مل کر گاتے' چچا بھی کبھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے۔

روشن چراغ رکھنا۔

دل کا دیا جلانا۔

''یہ میرا چراغ ہے جو اپنی روشنی سے دنیا کو منور کرے گا''۔ وہ روشن کے گرد اپنے بازو پھیلا لیتے''۔ اور وہ جو میں نہیں کر سکا وہ یہ کرے گا''

اس کو نہ تم بجھانا۔

ہم چیخ چیخ کر فل والیم میں گاتے۔

لیکن خود ان کا چراغ بجھنے والا تھا۔ شاید اندر سے انہیں یقین تھا اس لیے انہوں نے عنبر چچی سے کہا تھا کہ وہ اپنا ماسٹرز مکمل کر لیں اور پرائیویٹ امتحان دے ڈالیں۔

ان دنوں عنبر چچی کے پیپر ہو رہے تھے' جب اچانک ان کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ سر میں شدید درد اٹھا تھا اور متلی رکتی ہی نہیں تھی۔ فوراً ہاسپٹل لے جایا گیا پتا چلا کہ ظالم ٹیومر نے پھر اپنی جڑیں پھیلانا شروع کر دی ہیں حالانکہ ڈاکٹرز نے اپنی طرف سے سر کے اندر سے ہر وہ جگہ صاف کر دی تھی' جہاں ٹیومر کی جڑ کا گمان تھا' اب کے ڈاکٹرز مایوس تھے' پھر بھی علاج جاری تھا کبھی ہاسپٹل اور کبھی گھر۔ ان ہی دنوں انہوں نے دادا جان سے وعدہ لیا تھا کہ ان کے بعد عنبر کو گھر سے نہیں نکالا جائے گا اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی جائے گی۔ روپے پیسے کی انہیں ضرورت نہیں ہے۔ بس تحفظ چاہیے جو انہیں یہاں ہی رہ کر مل سکتا ہے۔

سمن آباد والے گھر کا کرایہ اور کچھ رقم جوان کے والد نے ان کے جہیز کے طور پر انہیں دی تھی۔ وہ کہیں لگا دی تھی ان سے جو منافع آتا تھا وہ ان کے لے اور بچوں کے لیے کافی تھا۔ علاوہ ازیں چچا کا اپنا پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ بھی تھا یوں مالی پریشانی کوئی نہیں تھی۔

''یہ آپ پر بوجھ نہیں ہیں ابا! بس انہیں اپنے سائے میں رکھیے گا۔'' اور یہی التجا انہوں نے دادی سے بھی کی تھی۔

آخری دو ہفتے تو وہ کومے میں ہی رہے تھے۔ کبھی کبھار ہوش آتا تو روشن اور سحرش کو دیکھنے کی خواہش کرتے' عنبر چچی فوراً ہی انہیں ہاسپٹل لے آتیں۔

کبھی کبھی میں بھی عنبر چچی یا دادی کے ساتھ ضد کر کے انہیں ہاسپٹل دیکھنے چلی جاتی تھی۔ وہ ہوش میں ہوتے تو میری طرف دیکھ کر مسکراتے اشارے سے قریب بلاتے اور سرگوشی کرتے۔

''اپنی عنبر چچی کے پاس روز جایا کرنا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتی ہیں۔''

اور کبھی بے ہوش ہوتے تو ہم خاموشی سے انہیں دیکھ کر چلے جاتے۔

مرنے سے ذرا پہلے انہوں نے سحرش' روشن' ذیشان اور مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ابا ہمیں فوراً ہاسپٹل لے آئے تھے۔ انہوں نے ہم چاروں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بیک وقت لے لیے تھے اور کہا تھا چلو گائیں۔

روشن چراغ رکھنا۔

دل کا دیا جلانا۔

ذیشان اور روشن رو رہے تھے۔ میں اور سحرش بھی لیکن ہم گا رہے تھے۔

دکھ نہ کسی کو دینا

وہ بھی آواز ملانے کی کوشش کرتے' لیکن ان کی آواز بار بار بکھر جاتی۔ پھر انہوں نے ہمارے ہاتھ چھوڑ دیے صرف روشن کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا۔

''میرا روشن چراغ۔''

انہوں نے حسرت سے اسے دیکھا اور پھر ابا کو مخاطب کیا تھا۔

''بھیا!'' اور پھر روشن کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔

''توقی......توقی۔'' عنبر چچی پچھاڑیں' رونے لگیں' لیکن چچا جا چکے تھے۔ ڈاکٹر نے آ کر چیک کیا اور تصدیق کر دی۔ یوں انیکسی میں شفٹ ہونے کے دو سال بعد چچا رخصت ہو گئے تھے۔

ہم سب تو جیسے ہنسنا بھول گئے تھے۔ دادی بیٹھے بیٹھے چلانے لگتیں۔

''میرا توقیر! میرا بیٹا! مٹی میں رل گیا اور پھر بھی ماں جایا مجھے تسلی دینے دلاسے کے دو لفظ کہنے بھی نہ آیا۔ عبادالرحمٰن ایک بار گلے سے لگا لیتے' تمہارے سینے سے لگ کر رو لیتی تو شاید درد کم ہو جاتا۔''

لیکن دادی کے بھائی نہیں آئے تھے اور نہ ہی انہوں نے افسوس کا خط لکھا تھا بلکہ انہوں نے وفات پائی تو قیر چچا کے دس ماہ بعد تو کسی نے ان کی موت کی اطلاع تک نہ دی اور دادی اپنے اکلوتے بھائی کا منہ بھی نہ دیکھ سکیں اور دفن ہونے کے دوسرے دن جب کسی عزیز نے ان کی موت کا بتایا تو دادی نے یوں سینہ کوبی کی اور اس طرح بین کئے کہ توقیر چچا کی موت پر بھی نہ کیے تھے۔ سب کے دل دہل گئے تھے اماں اور تائی کو گلے لگا کر دھاروں دھار آنسو برسائے۔

''کیسی بدنصیب ہو تم سکینہ' زہرہ کہ ماموں کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔''

وہ برآمدے میں چکر لگاتی' روتیں عبادالرحمٰن کو پکارتیں۔ توقیر چچا کا نام لے کر بین کرتیں اور عنبر چچی کو کوسنے دیتیں۔

''میرا بھائی اس کی وجہ سے چھوٹا۔ میں اس کا منہ نہ دیکھ سکی' صرف اس چڑیل کی وجہ سے' میرے دل میں بیٹے کی طرف سے میل آیا۔''

تب دادا جان نے ڈانٹا۔

''بس کرو بہت ہو گیا۔''

لیکن دادی جان کے دل میں عنبر چچی کے لئے موجود نفرت اور بھی زیادہ ہو گئی تھی اتنی کہ انہوں نے انیکسی کو بالکل الگ کر دیا اور درمیان میں بہت اونچی باڑ لگا دی اور سب کو منع کر دیا کہ کوئی بھی عنبر چچی کے گھر نہ جائے گا اور نہ ہی ان سے کلام کرے گا۔ ابا تایا اور چچا سے قسمیں لیں۔ امی اور تائی کو بھی بلیک میل کیا تھا انہوں نے۔

''ارے سگے ماموں کا منہ نہیں دیکھ سکیں تم اس ناشدنی کے طفیل اور تم اس سے بول چال رکھو گی۔''

''مگر اماں! توقیر کے بچے۔''

اماں نے کچھ کہنا چاہا تو دادی نے انہیں ٹوک دیا۔

''بہت کچھ چھوڑ گیا ہے وہ ان کے لیے' بھوکے نہیں مریں گے''

دادی نے تو اپنا دل پتھر کر لیا تھا لیکن دادا عنبر چچی اور بچوں کا بہت خیال رکھتے تھے سرونٹ کوارٹر کو ساتھ ملا کر انہوں نے گھر کو وسیع کر دیا تھا اور مین گیٹ بھی باہر کی طرف کھلوا دیا تھا' انہوں نے اور صبح و شام عنبر چچی کی طرف جاتے' وہ ہر طرح سے ان کا خیال رکھ رہے تھے۔ البتہ انہوں نے دادی کے معاملات میں دخل نہیں دیا تھا۔ دادی کا خیال تو دیوار بنانے کا تھا' لیکن تایا نے اس کی مخالفت کی تھی کہ اس طرح لان کا حسن مجروح ہو جائے گا یوں باڑ لگا دی گئی تھی' لیکن میں اور ذیشان باڑ پھلانگ کر چچی کی طرف چلے جاتے تھے۔ چچی بہت پیار کرتیں میری آنکھوں کو بار بار چومتیں۔ ہمیں چپس بنا کر دیتیں۔ روشن بہت خاموش اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔

دادا نے عنبر چچی کے باہر کے سب کام سنبھال لیے تھے۔

کرایہ وصول کرنا' بینک سے رقم نکلوانا وغیرہ وغیرہ' وہ روشن کو ہمیشہ ساتھ رکھتے تھے کہتے تھے کہ جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا تمہیں اکیلا جانا پڑے گا تمہیں پتا ہے سب' ویسے میں بہت جلد بڑا نہیں ہوں گا ابھی بھی تمہارے تایا کا بڑا بھائی لگتا ہوں۔''

دادا بھی توقیر چچا کی طرح خوش مزاج تھے' وہ شام کو دو تین گھنٹے ضرور عنبر چچی کے ہاں گزارتے تھے۔ روشن اور سحرش کا ہوم ورک چیک کرتے ان سے باتیں کرتے۔ توقیر چچا

کے بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں بتاتے رہتے جنہیں روشن اور سحرش بہت دھیان سے اور عنبر چچی نم آنکھوں سے سنتی تھیں اور چچا کی وفات کے ایک سال بعد دادا بھی اچانک چل بسے بس ذرا سی سانس کی تکلیف ہوئی تھی۔ اماں کہتی تھیں انہوں نے توقیر چچا کی موت کا غم دل سے لگا لیا تھا' اس پر دادی کا رویہ جو عنبر اور بچوں کے ساتھ تھا وہ انہیں بہت تکلیف دیتا تھا۔ گو وہ ظاہر نہیں کرتے تھے اور نہ ہی دادی کی کسی بات پر اعتراض کرتے تھے۔ لیکن ان کی آرزو تھی کہ دادی بچوں کے سر پر ہاتھ رکھ لیں اور عنبر چچی کو گلے لگا لیں۔ ایک بار روشن ذیشان کے ساتھ آ گیا تو دادی نے بازو پکڑ کر نکال دیا۔

''جاؤ آئندہ ادھر مت آنا۔''

اور روشن اتنا خوددار کہ پھر مڑ کر نہیں آیا' حالانکہ ذیشان نے کئی بار اسے لالچ دیا۔ جب میران کی خرگوشنی نے بچے دیے تھے۔ جب بسنت آئی تھی' تب لیکن روشن نے ہر بار انکار کر دیا۔

''دادی پسند نہیں کرتی اور ابی نے کہا تھا کہ دادی کی کبھی نافرمانی مت کرنا۔''

دادا جان کی وفات سے عنبر چچی سچ مچ اکیلی ہو گئی تھیں۔ بس میں اور شانی تھے' جو باقاعدگی سے چلے جاتے تھے۔

دادی نے اگرچہ سب بچوں کو منع کر رکھا تھا' لیکن ہم نظر بچا کر چلے ہی جاتے تھے کئی بار سرزنش ہو چکی تھی اور اب تو حد ہی ہو گئی تھی۔ دادی جان نے عنبر چچی کو چلے جانے کو کہہ دیا تھا' فروا نے مجھے بتایا تھا کہ دادی جان کہتی ہیں۔ چونکہ توقیر چچا کی ڈیتھ دادا جان کی زندگی میں ہی ہو گئی تھی اس لیے عنبر چچی اور بچوں کا دادا جان کی جائیداد میں کوئی حق نہیں ہے۔'' دادا جان کو اس بات کا علم تھا اس لیے وہ چاہتے تھے کہ اپنی زندگی میں ہی انیکسی روشن کے نام کر دیں۔ لیکن ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ فرشتۂ اجل آ پہنچا' انہوں نے دادی سے چھپ کر سحرش اور روشن کے اکاؤنٹ میں کچھ رقم جمع کروائی تھی' عنبر چچی کو پتا چلا تو انہوں نے کہا۔

''ابا جان! اس کی ضرورت نہ تھی۔''

''جانتا ہوں لیکن اپنے دل کو مطمئن کرنے کیلئے' اس کی خوشی کے لیے میں نے یہ پانچ پانچ لاکھ روپے دونوں کے اکاؤنٹ میں رکھوا دیے ہیں۔ روشن کے مستقبل اور سحرش کی

شادی کے کام آئیں گے۔ پتا نہیں تب میں ہوں گا یا نہیں میرے اس بچے نے مجھ سے کچھ نہیں لیا نہ اس کی شادی پر کچھ خرچ کیا نہ بزنس میں حصہ بنایا۔ نہ جائداد میں۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"میں تو اور بھی بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں، تم تینوں کے لیے اور کروں گا بھی۔"

لیکن وقت نے انہیں مہلت نہ دی تھی اور دادی اماں نے عنبر چچی کو گھر چھوڑنے کے لیے کہا۔

"جس کے ساتھ تمہارا رشتہ تھا وہ چلا گیا۔ تمہارے بچوں کا یا تمہارا اس جائداد یا گھر پر کوئی حق نہیں، میں تمہیں یہاں برداشت نہیں کر سکتی سو چلی جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے بچوں کے ساتھ کوئی تعلق رکھو، شانی اور مشی کو تم نے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

اور خدا جانے دادی جان نے کیا کیا کہا تھا کہ عنبر چچی دادا کی وفات کے چند ماہ بعد ہی گھر چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔

میں نے ذرا سی دیر میں ساری باتیں سوچ ڈالی تھیں اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر روشن کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔

توقیر چاچو کی معمولی سی اور عنبر چچی کی زیادہ شباہت لیے روشن توقیر میری طرف سے بے نیاز سا علی حیدر کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی ٹی پارٹی تھی علی حیدر اور صوفیہ حیدر جو دونوں بہن بھائی تھے۔ انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کو گھر پر بلایا تھا صوفیہ سے میری دوستی کالج کے زمانے میں ہوئی۔

فرسٹ ایئر سے لے کر اب یونیورسٹی تک ہم ساتھ ہی تھے۔ علی حیدر کا چند دن پہلے اپنی کزن سے کراچی میں نکاح ہوا تھا اور رخصتی کچھ عرصہ بعد ہونا تھی واپس آ کر صوفیہ نے ہم سب کلاس فیلوز کو انوائیٹ کیا تھا۔ چند دوست علی حیدر کے بھی تھے یوں زیادہ گیدرنگ نہ تھی علی حیدر صوفیہ سے صرف دو سال بڑا تھا لیکن دونوں میں بہت دوستی تھی سب ملا کر تیرہ چودہ افراد تھے۔ ایک طرف لڑکیوں کا گروپ تھا اور دوسری طرف لڑکوں کا گروپ تھا۔ کرسیاں آمنے سامنے تھے۔ ہم سب کلاس فیلوز کی علی حیدر سے سلام دعا تھی، جب بھی وہ صوفیہ کو کالج لینے آتا تو ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی، چونکہ صوفیہ ہائی سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی اس

لیے مکس گیدرنگ تھی اور یہ کچھ عجیب بھی نہیں لگ رہا تھا۔

آمنہ سے باتیں کرتے کرتے اچانک ہی میری نظر سامنے اٹھی تھی، علی حیدر کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا وہ لڑکا بلاشبہ روشن تھا۔ مجھے اسے پہچاننے میں کچھ زیادہ وقت نہیں ہوئی تھی حالانکہ میں پورے سات سال بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ سات سال پہلے وہ ایک دبلا پتلا پندرہ سولہ سالہ لڑکا تھا، جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اب وہ بائیس، تئیس سال کا جوان تھا لیکن وہ مجھے بالکل ویسا ہی لگا ہاں اس نے مونچھیں رکھ لی تھیں جو اس پر بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں عنبر چچی کی طرح ہلکی سی نیلاہٹ لیے آج بھی بہت اداس تھیں۔

میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے کتنی ہی بار بہت غور سے اسے دیکھا۔ شاید اس نے بھی میری توجہ کو محسوس کر لیا تھا۔ لیکن دو ایک بار مجھ پر سرسری سی نظر ڈال کر وہ بالکل ہی بے نیاز سا ہو کر علی حیدر سے مصروف گفتگو ہو گیا تھا۔

"کیا اس نے مجھے نہیں پہچانا۔" میں نے سوچا جب وہ لوگ گھر چھوڑ کر گئے تھے تو میں تیرہ چودہ سال کی تھی اور اب چند دن پہلے میں نے یونیورسٹی میں ایڈمشن لیا تھا۔

یقیناً اس نے مجھے نہیں پہچانا ہو گا۔ میں بدل بھی تو بہت گئی تھی میرا رنگ پہلے کے مقابلے میں صاف ہو گیا تھا اور میرا قد پانچ فٹ چھ انچ تھا۔ میں بے حد اسمارٹ تھی، جب عنبر چچی نے گھر چھوڑا تھا تو میرے بال کندھوں تک تھے ذرا بڑھتے تو اماں قینچی لے کر برابر کر دیتی تھیں لیکن اب میرے بال کمر تک لمبے گھنے اور سیاہ چمکیلے بال۔ دادی جنہیں لڑکیاں پسند نہ تھیں اب محض اس لیے مجھ پر جان چھڑکتی تھیں کہ مجھ میں توقیر چچا کی بے تحاشا مشابہت تھی میری فرینڈز کہتی تھیں میں بہت پرکشش ہوں اور ایک بار دیکھنے کے بعد دوسری بار نگاہ ضرور میری طرف اٹھتی ہے۔ حالانکہ میں بے تحاشا گوری چٹی نہ تھی، بچپن میں تو ٹھیک ٹھاک سانولا رنگ تھا، جو اب نکھر کر دلکش ہو گیا تھا اور مجھ میں بچپن میں جو بے نیازی تھی وہ اب خود اعتمادی میں ڈھل چکی تھی۔ اس لیے میں بلا جھجک اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ صوفیہ اور دوسری کلاس فیلوز نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ میں بلا وجہ کسی لڑکے سے گفتگو نہیں کرتی تھی حالانکہ گریجویشن میں نے گورنمنٹ کالج سے کیا تھا جہاں کو ایجوکیشن تھی۔ علی حیدر نے چونک کر مجھے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت ابھر کر معدوم ہو گئی تھی۔

''مبارک ہو علی بھائی۔''

میں نے آہستگی سے کہا' لیکن میری نگاہیں روشن کے چہرے پر تھیں جس نے نظریں نہیں اٹھائیں تھیں۔

''تھینک یو مشعال اور یہ مشعال ہے' صوفیہ کی دوست۔''

اس نے میرا تعارف کرانا ضروری سمجھا۔ ''اور یہ روشن ہے میرا دوست۔''

''روشن چراغ۔''

میں ہولے سے گنگنائی تو روشن نے چونک کر سر اٹھایا لمحہ بھر اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ٹکی رہیں۔ پھر اس کی آنکھوں میں اضطراب نظر آیا اور وہ بے چین سا دکھائی دینے لگا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

''چچی اور سحرش کیسی ہیں؟ کہاں ہیں؟'' میری آواز میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔

''اچھی ہیں۔'' اس کے لہجے کا روکھا پن مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔

''کیوں آخر کیوں؟ ہم تو بہت اچھے دوست تھے سب میں' سحرش' ذیشان اور روشن پھر اس کے چہرے پر وہ چمک کیوں نہیں ہے۔ جو میرے چہرے پر ہے اس کی آنکھوں میں خوشی کے بجائے اضطراب کیوں ہے اس کے ہونٹوں پر اتنی سردمہر سنجیدگی کیوں ہے۔''

میرے دل میں جیسے کسی نے کانٹا چبھو دیا ہو۔

علی حیدر حیرت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''مشعال! آپ روشن کو جانتی ہیں۔''

''ہاں روشن میرے چچا کے بیٹے ہیں۔'' میری آواز بجھ سی گئی تھی۔

علی حیدر نے سوالیہ نظروں سے روشن کی طرف دیکھا جو کندھے اچکا کر میز پر پڑی کوک کی طرف متوجہ ہو گیا تھا گویا اس کے نزدیک اس رشتے کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو' میرے اندر جیسے کہیں کوئی دیا جل کر بجھ گیا تھا۔ چند لمحے پہلے میرے اندر خوشی کا جو باغ کھلا تھا وہ مرجھا گیا تھا۔ یکایک مجھے احساس ہوا کہ سب مجھے دیکھ رہے ہیں سو میں یکدم پلٹی لیکن بے حد خود اعتماد ہونے کے باوجود میرے قدموں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ میں یکدم بے حد ہرٹ ہو گئی تھی اور میں نے بمشکل اپنی آنکھوں کی نمی کو اپنی دوستوں سے چھپایا تھا۔

''میں روشن سے مل گئی تھی' میرا کزن ہے۔''

میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ''تو تیرے چچا کا بیٹا۔''

''سچ۔'' صوفیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''ارے سچ روشن تمہاری عنبر چچی کا بیٹا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ صوفیہ جانتی تھی عنبر چچی روشن اور سحرش کو جب بھی ہم فارغ ہوتے اس سے عنبر چچی کی باتیں کرتی اور میں نے ان کی اتنی باتیں کی تھیں کہ صوفی بھی عنبر چچی کے متعلق اتنا ہی جانتی تھی جتنا میں ''روشن تم سے مل کر اتنا خوش نہیں ہوا جتنا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔''

صوفیہ کا مشاہدہ غضب کا تھا۔

میں نے تبصرہ نہیں کیا' میرے اندر برسات ہو رہی تھی۔ میں نے سات سال جن کو سوچا تھا۔ انتظار کیا تھا' راتوں کو سونے کیلئے لیٹتی تو سوچتی کہ کوئی معجزہ ہو جائے ایسا کہ صبح اٹھوں تو بار کے اس طرف عنبر چچی کے گھر میں سب موجود ہوں۔

عنبر چچی' روشن اور سحرش۔

میں نے راہ چلتے ہر چہرے کو اس لیے غور سے دیکھا کہ ان میں کوئی چہرہ شاید سحرش' روشن یا عنبر چچی کا ہو اور اب روشن ملا تھا تو میرے اندر ایک ساتھ کتنے دیے جل اٹھے تھے۔ یکدم چراغاں ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ روشن کے اندر بھی اتنے ہی دیے جل اٹھیں گے' وہ بے قراری سے مجھ سے ملے گا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ساتھ کتنے ہی کر مک شب لو دے اٹھیں گے۔ مگر وہاں تو سردمہری کی برف جمی تھی۔

میں نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اسے دیکھا وہ میری طرف متوجہ نہ تھا لیکن میز پر دھری اس کی انگلیوں میں ارتعاش تھا جیسے اس کے اندر کہیں کوئی اضطراب اور بے چینی ہو وہ علی حیدر سے بات کرتا یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ شاید وہ اس سے گھر جانے کی اجازت طلب کر رہا تھا اور عین اسی لمحے میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''او کے صوفی! اب اجازت دو۔''

''کچھ دیر تو رکو ابھی تو سب ہیں۔''

وہ روشن کی طرف متوجہ نہ تھی جو علی حیدر سے رخصت ہو کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

''نہیں، دادی نے کہا تھا مغرب کے بعد زیادہ دیر تک نہ رکنا۔''
میں بھی روشن کے پیچھے ہی لپکی تھی اور گیٹ کے باہر ملگجے اندھیرے میں، میں نے اسے آواز دی۔

''روشن!'' وہ رک گیا اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

''روشن! کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں۔''

''پہچان لیا ہے۔''

''پھر؟ پھر تمہارا رویہ اس قدر روکھا اور اجنبی سا کیوں ہے؟''

''میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کا قائل نہیں ہوں مشعال۔''

''لیکن میں تو چچی اور سحرش سے ملنے کے لئے تڑپ رہی ہوں، پلیز روشن! مجھے گھر لے چلو۔''

''اس وقت!'' اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

''ہاں ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔''

''کیا کرو گی ان سے مل کر، کل، پرسوں اس سے اگلے روز پھر تمہاری دادی یا امی یا تائی چچی کوئی بھی منع کر دے گا وہاں آنے سے اور تم منع ہو جاؤ گی۔ سو ایسے تعلق کو کیا جوڑنا جسے پھر ٹوٹنا ہے۔ خوانخواہ اپنی انرجی ویسٹ نہ کرو۔ ہم سب بھول چکے ہیں تمہیں اور تم سے وابستہ ہر فرد کو۔''

میں جانتی تھی، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جب میں نہیں بھولی تھی کچھ تو وہ کیسے بھول سکتا ہے۔ شاید اسے غصہ ہے مجھ پر، میری وجہ سے ہی تو انہیں وہاں سے نکالا گیا تھا۔ میں اور ذیشان اگر دادی کے منع کرنے کے باوجود وہاں جاتے رہتے تھے تو غلطی ہماری تھی جس کی سزا انہیں ملی تھی۔

''تمہیں شاید غصہ ہے مجھ پر کہ اس روز دادی کے منع کرنے کے باوجود میں تمہاری طرف چلی گئی تھی اور پھر۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمکیں یا مجھے محسوس ہوئیں۔

''میں ایسے رشتوں سے دور رہنا چاہتا ہوں جن سے ہمیشہ دکھ ملے ہیں۔'' اس

کی آواز سچ مچ بھرا گئی تھی یا مجھے محسوس ہوئی تھی۔

''روشن! سحرش اور چچی کیسی ہیں کیا انہوں نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا۔''

''پتا نہیں۔'' اس کے لہجے میں وہی سرد مہری اتر آئی تھی جیسے اس نے ڈھیروں برف چبا رکھی ہو۔

''اچھا اپنا ایڈریس بتا دو میں خود آ جاؤں گی چچی سے ملنے۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ ایک دم ہی دائیں طرف جو دو تین گاڑیاں پارک تھیں مڑ گیا اور میری آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگیں۔ اس نے مجھے بہت مایوس کیا تھا۔ میں دھیمے قدموں سے اسٹاپ کی طرف بڑھی۔ اندھیرا اپھیل رہا تھا۔ گو میں نے ذیشان سے کہا تھا کہ وہ مجھے لے جائے لیکن میں روشن کے پیچھے اس کا انتظار کیے بغیر ہی نکل آئی تھی، اور اب واپس جانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا قریب ہی اسٹاپ سے مجھے گھر کے لیے وین مل جاتی۔

میں خالی الذہن سی چلی آ رہی تھی کہ ایک ٹیکسی جو سامنے سے آ رہی تھی آہستہ ہوتے ہوتے میرے قریب رک گئی۔

''کہاں جانا ہے میڈم؟''

ڈرائیور نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا اور میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

پتا نہیں اس وقت ویگن ملے گی بھی یا نہیں۔ میں نے ایک لمحہ کو سوچا کہ ٹیکسی لے لوں لیکن پھر خوفزدہ ہو گئی۔ نہیں ویگن یا بس ہی ٹھیک رہے گی۔ تب ہی مجھے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور کچھ ہی دیر بعد وہ پیچھے سے ہو کر میرے برابر آ گیا۔ میں نے ذرا سا رخ اس کی طرف کیا وہ روشن تھا۔

''مشعال!''

میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تم اکیلی جاؤ گی اس وقت......''

''ویگن مل جائے گی، یہ آگے اسٹاپ سے۔''

''کیا گھر میں کوئی نہ تھا جو تمہیں لینے آتا۔''

''ذیشان نے آنا تھا لیکن اس نے ساڑھے آٹھ تک کہا تھا آنے کو۔''

"اور تم آدھ گھنٹہ انتظار نہیں کر سکتی تھیں؟" اس کے لہجے میں ہلکی تلخی تھی۔
میں نے جواب نہیں دیا اور چپتی رہی۔
"آؤ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ گئی تھی جسے میں نے چھپانے کی کوشش کی۔
"لیکن آپ تو کسی پرانے رشتے دار سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے روشن توقیر! پھر۔"
میں نے اسے آپ کہہ کر بلایا حالانکہ بچپن میں ہی ہمارے درمیان بہت بے تکلفی تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے دو سال بڑا تھا لیکن جس طرح میں ذیشان کو تم کہہ کر بلاتی تھی اسی طرح اسے بھی تم ہی کہتی تھی۔
"ہاں، تمہیں ڈراپ کرنے کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ محض اخلاقی تقاضا ہے کہ اس وقت تمہیں اکیلا نہ جانے دوں۔"
میرا جی چاہا اس سے کہوں روشن! رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے وہ رشتے جو قدرت قائم کر دیتی ہے۔ ہزاروں نفرتوں اور دشمنیوں کے باوجود بھی قائم رہتے ہیں۔ تم ہمیشہ زبیدہ بیگم کے پوتے رہو گے اور ہمیشہ ہی میرے چچا کے بیٹے، چاہے تم ہم سب سے کتنی ہی نفرت کیوں کرو۔" لیکن میں خاموش رہی۔
"کم آن مشعال! یہاں اس وقت مشکل سے ہی ویگن یا بس ملے گی۔"
اس کے لہجے میں بیزاری تھی، لیکن میں خاموشی سے پلٹ گئی۔
میں نے سوچا شاید راستے میں وہ مجھے گھر کا پتا بتا دے۔ لیکن وہ ہونٹ بھینچے ڈرائیو کرتا رہا۔ میں نے کتنی بار کن اکھیوں سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے میں بلا کی کشش تھی اور اس کے پاس سے ایک مسحور کن مہک آ رہی تھی وہ بڑا ہو کر بہت پرکشش ہو گیا تھا۔ اس کا لانبا قد اور چوڑے شانے بالکل توقیر چچا کی طرح تھے۔ وہ یوں سیٹ پر بیٹھا ڈرائیو کرتا ہوا سائیڈ سے بالکل چچا کی طرح لگ رہا تھا۔ مجھے یکدم بے تحاشا چچا یاد آ گئے میں کتنی ہی بار ان کے ساتھ باہر گئی تھی اور وہ ڈرائیونگ کرتے کرتے مسکرا مسکرا کر مجھے دیکھتے رہتے تھے اور باتیں کرتے رہتے۔
"فروا بہت خوبصورت ہے۔ اماں کہتی ہیں۔" میں بتاتی۔

"تم فروا سے زیادہ پیاری ہو اور یہ بات تمہارا چچا کہتا ہے۔" وہ ہنستے۔
"اماں کہتی ہیں 'لڑکیاں مصیبت ہوتی ہیں نری' لڑکے اچھے ہوتے ہیں'"
میں اماں سے سنی ہوئی باتیں ان کے گوش گزار کرتی۔
"بالکل غلط لڑکیاں تو پریاں ہوتی ہیں ہماری مشعال جیسی اور لڑکے جن ہوتے ہیں۔"
"میں اور سحرش پریاں' ذیشان اور روشن جن۔" میں کھل کھلا کر ہنستی۔
"ہاں بالکل۔" وہ ایک ہاتھ سے میرا کندھا تھپتھپاتے "لیکن روشن کو یہ بات نہ بتانا ورنہ وہ خفا ہو گا۔"
اور میرا جی چاہا اب اس وقت روشن کو بتاؤں لیکن وہ تو مضبوطی سے اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے' ہونٹ بھینچے یوں ڈرائیو کر رہا تھا' جیسے کسی اہم مہم پر جا رہا ہو۔
"جن....." مجھے ہنسی آئے جا رہی تھی۔ لیکن میں نے ہونٹ سختی سے بند کیے ہوئے تھے۔
"اور دادی کہتی ہیں ابا بے چارے بدنصیب ہیں لڑکے کی جگہ میں آ گئی غلطی سے۔"
"یہ بھی غلط ہے' تمہارے ابا تو بہت خوش نصیب ہیں۔ دو پریوں جیسی بیٹیاں ہیں۔"
"مگر دادی تو ایسا نہیں کہتیں۔"
"دادی پرانے زمانے کی ہیں ناں اس لیے۔ مجھے تو اپنی بیٹی مشعال بہت پیاری لگتی ہے۔"
"روشن سے بھی زیادہ۔" میں پوچھتی۔
"ہاں۔"
"تو پھر آپ روشن' اماں ابا کو دے دیجیے اور بدلے میں مجھے ان سے لے لیجیے۔"
"تم تو میری ہی ہو نا میری جان۔"
"لیکن پکا پکا لے لیں نا۔"

''کیا پاپا بھی لے لیں گے۔'' وہ مسکراتے۔

''مگر پھر روشن آپ کو اور چچی کو یاد آئے گا'' مجھے ساتھ ہی فکر بھی ہو جاتی۔

''تو ہم ایسا کچھ کریں گے گڑیا کہ روشن کو بھی نہ دینا پڑے اور تم بھی پکی پکی ہماری ہو جاؤ۔''

اور میرا دل یکبارگی میرے سینے کے اندر ایسے دھڑکا میں نے چور نظروں سے روشن کو دیکھا۔

''کیا اب ایسا ممکن ہے۔''

اور مجھے لگا جیسے زندگی میں کوئی رنگ باقی نہ رہا ہو' گاڑی گھر سے ذرا دور ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔

''تھینک یو۔'' میں گاڑی سے اتری۔

''ویلکم'۔ اس نے دروازہ بند کیا۔

''روشن! کیا واقعی تم چاہتے ہو کہ میں کبھی چچی اور سحرش سے ملنے نہ آؤں'' میں کھڑکی پر جھکی۔

''ہاں' مجھے ایسے رشتوں سے نفرت ہے جو سائبان بننے کے بجائے سر سے چھت ہی چھین لیتے ہیں۔''

''لیکن روشن! ہم تو...... میرا مطلب ہے میں اور ذیشان' تم اور سحرش ہم تو بچپن میں اچھے دوست تھے۔''

''مجھے اس سے انکار نہیں لیکن تم نے بھی ان ہی رشتوں کی کوکھ سے جنم لیا ہے مشعال! جن سے مجھے نفرت ہے اور یہ بات ذیشان کو بھی سمجھا دینا اس سے پہلے کہ واپسی مشکل ہو جائے اسے اپنے قدموں کو وہیں روک لینا چاہیے۔''

وہ زن سے گاڑی نکال لے گیا اور میں کتنی ہی دیر تک وہیں ساکت کھڑی اس کی کہی بات کے معنی سمجھنے کی کوشش کرتی رہی اور جب سمجھی تو یقین نہ آیا۔

''کیا ذیشان ان کے گھر جاتا رہا ہے؟ کیا وہ کوئی پیش قدمی کر چکا ہے اور کیا...... کیا مطلب تھا روشن کا اس بات سے۔''

ٹی وی لاؤنج میں ٹہلتے ٹہلتے میری ٹانگوں میں درد ہونے لگا تھا۔ لیکن ذیشان ابھی

تک نہ لوٹا تھا۔ اس نے فون کر کے میرے گھر پہنچنے کی تصدیق کر لی تھی اور پھر ایک دوست کے ہاں کھانا کھا کر آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور اب دس بجنے والے تھے۔ ٹی وی لاؤنج میں میرے سوا کوئی نہ تھا۔ سب کھانا کھا کر اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے ہمارے ہاں اب بھی کھانا نو بجے کھا لیا جاتا تھا۔ دن کے کھانے پر سب اکٹھے نہ ہوتے تھے۔ سب کے گھر آنے کے اوقات مختلف تھے۔ سو رات کے کھانے پر نہ صرف یہ کہ سب اکٹھے ہوتے تھے بلکہ کھانا بھی اہتمام سے تیار ہوتا تھا آج بھی وہی جوائنٹ سسٹم تھا کچن ایک ہی تھا۔ سب کا اکٹھا کھانا بنتا تھا آج بھی میران اور انصر ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور باہر سے آنے والوں کو پتا نہیں چلتا تھا کہ کون کس کا بیٹا یا بیٹی ہے۔ عنبر چچی سے نفرت کرنے والیوں کو آپس میں بہت محبت تھی۔

گھڑی نے ساڑھے دس بجائے تو بیرونی گیٹ کھلنے کی اور گاڑی کی آواز آئی۔ ذیشان کی رنگ انگلیوں میں گھماتا ہوا ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوا اور مجھے وہاں دیکھ کر حیران ہو گیا۔

''ارے تم' ابھی تک سونے نہیں گئیں۔''

میری عادت تھی کہ میں کھانا کھاتے ہی اپنے کمرے میں چلی جاتی تھی' جبکہ میران اور ذیشان گھر پر ہوتے تو پھر ٹی وی لاؤنج میں دیر تلک محفل جمتی۔

''کسوٹی کسوٹی۔'' کھیلا جاتا' کارڈز کھیلتے' ٹی وی دیکھا جاتا۔ جب سے میران راولپنڈی میڈیکل کالج گیا تھا' یہ محفلیں جمنا کم ہو گئی تھیں۔ فروا کی عادت تھی وہ دیر تلک ٹی وی لگائے رکھتی تھیں۔ اس لیے میں سر شام ہی کمرے میں گھس جاتی تھی اس لیے کہ اس کی آمد سے پہلے ہی کچھ لکھ پڑھ لوں۔ اب بھی فروا کے کمرے سے ٹی وی کی آواز آ رہی تھی اور مجھے بھی اسی کمرے میں جانا تھا۔

''کیا میرا انتظار ہو رہا تھا؟'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''سوری یار! میں کچھ لیٹ ہو گیا تھا۔ لیکن میں نے تمہیں بتا تو دیا تھا کہ شاید لیٹ ہو جاؤں۔ اس لیے احتیاطاً میں نے تمہاری طرف جانے سے پہلے گھر فون کر لیا تھا۔ بائے داوے تمہیں یہاں کون چھوڑ گیا ہے اور یہ تم ایک گاڑی کیوں نہیں لے لیتیں چچا جان سے کہہ کر' آخر ڈرائیونگ کس دن کیلئے سیکھی ہے تم نے۔''

وہ مسلسل بول رہا تھا تان اسا چپ۔
'ہاں تو تم نے بتایا نہیں کس کے ساتھ آئی تھیں گھر؟''
وہ سانس لینے کے لیے رکا تو میں نے اطمینان سے کہا۔
''روشن کے ساتھ۔''
''اچھا یہ کون ذات شریف ہیں مسٹر روشن ضمیر صاحب۔''
''روشن ضمیر نہیں روشن چراغ۔ تصیح کرلو۔''میں نے اطمینان سے اس کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔
''یعنی تمہارا مطلب ہے' اپنے۔۔۔۔ اپنے روشن چراغ بن توقیر ملک۔۔۔! لیکن وہ تمہیں کہاں ٹکرا گئے۔''
''ذیشان!''میرا ضبط جواب دے گیا تم بہت بدتمیز ہو۔
''ہائیں!''اس نے سر سے پاؤں تک خود کو دیکھا۔
''کیا یہ انکشاف ابھی ابھی ہوا ہے۔''
''تم ہمیشہ سے بدتمیز ہو لیکن مجھے واقعی آج پتا چلا۔''میں پھٹ پڑی۔
''کب سے مل رہے ہو چچی سے اور سحرش سے؟''
''تقریباً دو سال سے۔''وہ سنجیدہ ہو گیا۔
''ایک روز اچانک ہی روشن چراغ کو انجینئرنگ یونیورسٹی میں دیکھ لیا تو لپٹ پڑا۔ گو کچھ آگ کی تپش و حرارت کے چھینٹے کپڑوں پر پڑے لیکن میں نے بھی چھوڑا نہیں گھر جا کر دم لیا۔''
''اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں ذیشان؟''میں روہانسی ہو گئی۔
''اوہ! ہاں میں بس سوچ ہی رہا تھا بتانے کا' آج کل میں بتانے والا تھا۔''اس نے کان کھجائے۔
''شانی! تمہیں پتا تھا نا کہ میں عنبر چچی کو' سحرش کو اور روشن چراغ کو کتنا یاد کرتی ہوں۔ پھر بھی تم نے نہیں بتایا اور کتنی ہی بار میں نے تم سے کہا تھا ذرا ڈھونڈو عنبر چچی کا گھر اور پھر ہم ملنے جاتے ہیں لیکن تم اکیلے چلے گئے' دو سال سے جا رہے ہو اور مجھے بتایا تک نہیں۔''
میں نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو روکا۔

''سوری مشی! یہ جو عورتیں ہوتی ہیں ان کا پیٹ بہت ہلکا ہوتا ہے اور تم کہیں کسی کو بتا دیتیں تو۔''
''میں تو بے وقوف ہوں۔ احمق ہوں۔''میں جھنجھلائی۔
''بالکل نہیں مگر یار! وہ ممکن ہے۔ تم کسی روز فروا سے کہہ دیتیں' فروا کا پیٹ پھٹنے لگتا تو وہ ماریہ سے کہہ دیتی' ماریہ ثوبان اور ثوبان بدتمیز اماں سے جڑ دیتا اور اماں کو تو تمہیں پتا ہے۔ کیسے کیسے طریقے آتے ہیں انہیں اولاد کو بلیک میل کرنے کے' ساری ماؤں سے کہیں زیادہ بس کسی روز وہ دودھ نہ بخشنے کا کہہ کر اور ماں کی ممتا کے واسطے دے کر مجھے روک دیتیں تو۔''
''بس کرو اپنی تقریر۔''میں کھڑی ہو گئی۔
''اور آئندہ مجھ سے بات نہ کرنا اور وہ تمہارے روشن چراغ صاحب فرما گئے تھے کہ آپ سے کہہ دوں کہ۔۔۔۔۔۔''
''روشن ضمیر۔''اس نے ہاتھ اٹھایا۔''تصیح کر لو۔ میں نے اب اس کا نام روشن ضمیر رکھ لیا ہے۔ کیونکہ وہ خاصا روشن ضمیر ہو چکا ہے اور اسے مستقبل کے مطلق پیش گوئیاں کرنے کا خاصا شوق ہے۔''
''تمہارے بارے میں جو پیش گوئی اس نے کی ہے' وہ بھی سن لو۔ وہ کہہ رہا تھا کہ تمہیں چاہیے کہ اپنے قدم یہیں روک لو اس سے پہلے کہ واپسی ممکن نہ رہے۔''
''کیا کیا مطلب؟''ذیشان میرے پیچھے لپکا۔
''کیا مطلب تھا اس کا اس سے؟''
''یہ تم اسی سے پوچھنا۔''میں کھٹ کھٹ کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ چند قدم میرے پیچھے چلا اور پھر وہیں صوفے پر بیٹھ گیا۔
فروا نے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز آہستہ کر کے مجھے دیکھا۔
''تمہیں آئے ہوئے تو کافی دیر ہو گئی ہے' پھر تم ابھی تک کہاں تھیں؟''
''ٹی وی لاؤنج میں۔''میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جوتوں کے اسٹریپ کھولے۔
''اور کون تھا وہاں' کیا ماریہ اور انصر؟''
''نہیں میں اکیلی تھی۔ ذیشان کا انتظار کر رہی تھی۔ کام تھا مجھے اس سے۔''
''کیا تم شانی کے ساتھ واپس نہیں آئی تھیں۔''

"نہیں اسے کسی دوست کے ساتھ ذکر کرنا تھا مجھے صوفی نے بھجوا دیا تھا۔ کسی کے ساتھ۔"

"کون دوست؟"

"پتا نہیں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"مجھے شانی نے نہیں بتایا۔"

"کمال ہے شانی کی تمہارے ساتھ تو بہت دوستی ہے اور وہ ہر بات تمہیں بتاتا ہے۔"

فروا کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا' جسے میں نے محسوس نہیں کیا۔

"نہیں وہ ہر بات مجھ سے شیئر نہیں کرتا۔"

میں نے اپنا غصہ اور ناراضگی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے نارمل لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" فروا نے بھنویں اچکائیں اور پھر آواز اونچی کر دی میں چینج کر کے بیڈ پر لیٹ گئی مجھے سچ مچ ذیشان پر بہت غصہ تھا۔

"بدتمیز۔" میں نے تکیہ کانوں پر رکھ لیا۔

"میں خود چلی جاؤں گی عنبر چچی کے گھر' وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔"

"اور۔۔۔ اور روشن نے یہ کیوں کہا تھا کہ اسے اپنے قدموں کو روک لینا چاہیے کیا۔" یکدم میرے ذہن میں روشنی کا کوندا سا لپکا۔

"او گاڈ تو تو کیا ذیشان اور سحرش' سحرش اور ذیشان کیا ذیشان سحرش میں دلچسپی لے رہا ہے اور اس دلچسپی کو روشن نے محسوس کر لیا ہے اور وہ اسے روکنا چاہتا ہے۔"

میں نے چور نظروں سے فروا کی طرف دیکھا۔ وہ اوندھی لیٹی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مجھے خوف ہوا کہیں وہ میرے خیالات نہ جان لے۔ پھر خود ہی اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ بھلا اسے کیا خبر میں کیا سوچ رہی ہوں۔ سحرش تو بچپن میں ہی بے حد خوبصورت تھی' بالکل عنبر چچی کی کاپی اب تو اور بھی خوبصورت ہو گئی ہوگی' میں نے آنکھوں کے سامنے اس کا سراپا لانے کی کوشش کی اور اگر ذیشان نصیرا سے پسند کرنے لگا تھا تو اس میں تعجب کی تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن لیکن فروا۔

فروا میری بہن تھی' قدرتی طور پر مجھے تھوڑا سا افسوس ہوا۔ گو فروا اور ذیشان کی

باقاعدہ منگنی تو نہیں ہوئی تھی' لیکن بچپن سے ہی تائی اماں کا خیال فروا کے لیے تھا اور یہ بات سب جانتے تھے ذیشان کا تو مجھے نہیں معلوم کیونکہ وہ کبھی بھی یہ جتاتا نہیں تھا۔ گو فروا کی نسبت میری ذیشان سے زیادہ دوستی تھی بچپن سے ہی۔

شاید بچپن کی اس راز داری کی وجہ سے جو ہم دونوں کے درمیان تھی یعنی عنبر چچی کے ہاں جانا۔ لیکن اس موضوع پر میری کبھی ذیشان سے بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتا تھا۔ یوں فروا اور ذیشان کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ ذیشان خوش باش رہنے والا لڑکا تھا' جبکہ فروا کے مزاج میں غرور تھا اور وہ تنک مزاج بھی تھی ذرا سے مذاق پر چراغ پا ہو جاتی تھی۔

ایک بار اماں نے مزاج کے اس فرق کا ذکر تائی اماں سے کیا تو انہوں نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ذمہ داریاں پڑیں گی تو خود ہی فروا ذیشان کے مزاج کو سمجھنے لگے گی۔"

تائی اماں کی چونکہ اپنی کوئی بیٹی نہ تھی اس لیے وہ ہم سے اپنی بیٹیوں کی طرح ہی پیار کرتی تھیں۔

"فرض کرو اگر یہ سچ ہوا' اگر ذیشان سحرش میں انٹرسٹڈ ہوا تو فروا کیسا ری ایکٹ کرے گی؟"

میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں' گو نگاہیں ٹی وی کی اسکرین پر تھیں لیکن ذہن یقیناً کہیں اور تھا۔

فروا کیسا ری ایکٹ کرے گی؟

لیکن یہ بھلا ممکن ہی کہاں ہے۔

تائی اماں دادی جان بھلا یہ کیوں گوارا کریں گے۔ جنہوں نے دادا جان کی وصیت کے باوجود عنبر چچی اور بچوں کو گھر سے نکال دیا تھا وہ بھلا۔

"ناممکن۔" میری آواز بے دھیانی میں بلند ہو گئی تھی۔

"کیا ناممکن ہے۔" اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا۔

"کچھ نہیں۔" میں ذرا سٹپٹائی۔

''کیا شانی نے کچھ کہا؟'' اس کا انداز سوالیہ سے زیادہ مشکوک تھا۔

''نہیں تو میں تو صوفی کے ساتھ پکنک پر جانے کا سوچ رہی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔ اماں اجازت نہیں دیں گی۔'' مجھے فوراً ہی سوجھ گئی اور میں نے تکیہ کانوں سے ہٹا کر آنکھوں پر رکھ لیا۔ فروا ہمیشہ لائٹ جلا کر سوتی تھی اور مجھے روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ اس لیے میں تکیہ آنکھوں پر رکھ لیتی تھی۔ سو میں تکیہ آنکھوں پر رکھے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح میں دیر سے اٹھی تھی کیونکہ میرا یونیورسٹی جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

ابھی چند دن ہی ہوئے تھے ہمیں یونیورسٹی جاتے ہوئے۔ سو اب تک کوئی خاص جی نہیں لگا تھا۔ رات نیند بھی دیر سے آئی تھی۔ ذہن الجھا ہوا تھا۔

عنبر چچی سے ملنے کی خواہش۔

روشن کا رویہ۔

سحرش اور ذیشان۔

میں جب کمرے سے باہر آئی تو میرا خیال تھا' سب ناشتہ کر کے جا چکے ہوں گے اپنے اپنے کالج اور آفسز۔ فروا اپنی ایجوکیشن ختم کر چکی تھی' لیکن ان دنوں وہ ایک ادارے میں جا رہی تھی جہاں کلنگ' بیکنگ اور میک اپ وغیرہ کی کلاسز ہوتی تھیں۔ اس نے بیکنگ کلاس جوائن کر رکھی تھی اور عموماً وہ نو بجے چلی جاتی تھی۔ لیکن آج وہ تیار ہو کر باہر لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ ماریہ' ثوبان' انصر اور ذیشان غالباً جا چکے تھے۔

''ارے فروا! آج جانا نہیں کیا؟''

میں نے ڈائننگ روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

''جانا ہے' میرا خیال تھا ذیشان آفس جاتے ہوئے مجھے چھوڑ دے گا۔ اس لیے میں نے ابا سے کہہ دیا تھا کہ وہ چلے جائیں'' عموماً ابا نو بجے آفس جاتے تو اسے ڈراپ کر دیتے تھے واپسی پر ڈرائیور پک کر لیتا تھا۔

''تو کیا ذیشان ابھی تک تیار نہیں ہوا۔''

''نہیں اس کا آفس جانے کا موڈ نہیں ہے' آرام کر رہا ہے۔''

''تو اب چھٹی' چلو اچھا ہے۔ میں نے بھی آج چھٹی کی ہے۔''

''تم بے فکر رہو' میں جا رہی ہوں۔ ابا کو فون کر دیا تھا وہ ڈرائیور کو بھیج رہے ہیں' تمہارا پروگرام خراب نہیں ہوتا۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''فروا!'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

مجھے اس کا رویہ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ اتنے غصے میں کیوں تھی۔

تب ہی باہر گیٹ پر ہارن بجا' شاید ڈرائیور آ گیا تھا۔

یہ فروا کو کیا ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی اس کا رویہ بہت عجیب سا ہو جاتا تھا اور یہ میں تقریباً ایک سال سے محسوس کر رہی تھی۔ پھر خود ہی ٹھیک بھی ہو جاتا تھا۔

''پتا نہیں فروا کے ساتھ کیا پرابلم ہے۔'' اپنے لیے چائے بناتے ہوئے میں نے سوچا۔

لیکن اگر میں فروا سے پوچھتی تو وہ مجھے کبھی نہ بتاتی۔ کیونکہ اس نے مجھے کبھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ بلکہ وہ کسی کو بھی اہمیت نہیں دیتی تھی۔ سب کے ساتھ مل جل کر کھیلتے' ہنستے' بات کرتے یکایک ہی اس کا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔ میں فروا کے متعلق سوچتے ہوئے چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی کہ ذیشان کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''میرے لیے بھی ایک کپ بنا دو پلیز۔''

میں نے خاموشی سے چائے بنا کر اس کی طرف کھسکا دی۔

''ناراض ہو پارٹنر۔'' میں خاموش رہی۔

''یار! میں بس سوچ ہی رہا تھا کہ کسی دن تمہیں بتا دوں گا' لیکن اچھا چلو معاف کر دو اور بتاؤ کب چلنا ہے عنبر چچی کی طرف......''

''مجھے جب جانا ہوگا میں خود چلی جاؤں گی۔''

''میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے۔''

مگر میں خاموشی سے چائے پیتی رہی' تب اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اب مان بھی جاؤ مشی! میں ڈرتا تھا۔ کہیں تم نے کسی کو بتا دیا مارے خوشی کے تو دادی وہاں بھی ان کیلئے زندگی مشکل بنا دیں گی اور اب اٹھو زیادہ نخرے نہ دکھاؤ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تو چلتے ہیں عنبر چچی کی طرف۔''

''تم حرش کو پسند کرتے ہو۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟'' راستے میں' میں

نے پوچھا۔

"پتا نہیں سحرش بہت اچھی بہت پیاری اور اچھی لڑکی ہے۔ لیکن ابھی تک میں نے ایسا سوچا نہیں ہے۔ گو سحرش جیسی لڑکی کو شریک زندگی بنانا کسی بھی شخص کی اولین خواہش ہو سکتی ہے۔ لیکن میرے سامنے بہت سی باتیں ہیں سوچنے والی۔ میں تو قیر چچا کی کہانی دہرانا نہیں چاہتا۔ میں نے سحرش سے کوئی ایسی بات نہیں کی مشی! نہ ہی کوئی ایسا تاثر دیا ہے کبھی، میں ریت میں پاؤں جما کر بات نہیں کرنا چاہتا میں جب کوئی بات کروں گا تو اس یقین کے ساتھ کہ میری بنیادیں مضبوط ہیں۔ لیکن یہ اپنا روشن چراغ میں نے غلط نہیں کہا تھا روشن ضمیر ہے۔"

وہ ہولے سے ہنسا اور اس نے یکدم ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا لیکن میں نے اسے ٹوکا نہیں حالانکہ اس بات پر ہمیشہ میری اس سے لڑائی رہتی تھی۔ مگر ابھی میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔

مجھے عنبر چچی سے ملنے کی خوشی بھی تھی اور مجھے فروا کا خیال بھی آ رہا تھا۔ اگر کبھی وقت ذیشان کے ہاتھ میں ہوا۔ اگر اسے کبھی لگا کہ اس کے پاؤں زمین پر مضبوطی سے جمے ہیں۔ وہ ریت پر نہیں کھڑا اور اس نے سحرش کے ساتھ زندگی بتانے کا فیصلہ کر لیا تو۔۔۔ تو فروا کا کیا ہوگا۔

فروا تو ذیشان کو پسند کرتی ہے۔ شاید اس لیے کہ تائی جان نے بارہا کہا ہے کہ فروا تو میرے شانی کی دلہن بنے گی، میں نے کئی بار محسوس کیا تھا کہ فروا ذیشان کو پسند کرتی ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو مشی؟"

ذیشان نے رفتار آہستہ کرتے ہوئے ذرا سا رخ موڑ کر مجھے دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" میں چونکی۔ اب ہم امن آباد میں داخل ہو چکے تھے۔

"تمہاری فکر قبل از وقت ہے مشی! آنے والے وقت کے چہرے پر کیا لکھا ہے کسے خبر ہے۔ خدا سے ہمیشہ بہتری کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔"

"او کے۔" میں ہنس دی۔

گاڑی ایک گھر کے سامنے رک چکی تھی۔

درمیان میں بڑا سا لوہے کا گیٹ اور گیٹ کے دونوں طرف باڑھ اگا کر تھوڑی سی

جگہ پر پھول پودے اگائے ہوئے تھے۔ میں نے دیواروں پر نگاہ ڈالی۔ عمارت گو پرانا تھا لیکن بوسیدگی کے آثار نہیں تھے۔ بائیں طرف کے اوپر کے حصے کا ٹیرس اور ٹیرس نظر آ رہا تھا۔ گاڑی کی پارکنگ کیلئے بھی جگہ تھی۔ گیٹ کے سامنے ایک گاڑی موجود تھی۔ ذیشان نے ایک طرف گاڑی پارک کی اور گیٹ کی طرف بڑھنے کے بجائے ذرا سا مڑ کر بیک کی طرف بڑھا۔ جہاں چھوٹا سا دروازہ تھا جو یقیناً سیڑھیوں کا تھا۔

"نچلا پورشن کرائے پر چڑھا ہوا ہے۔"

اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بتایا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر ٹی وی لاؤنج تھا۔ بہت کشادہ اور وسیع سامنے صوفے لگے تھے۔ ایک سائیڈ پر موڑھے پڑے تھے اور درمیان میں کارپٹ بچھا تھا۔ سائیڈ سے جگہ خالی تھی جہاں سے فرش کی ٹائلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایک کونے میں استری اسٹینڈ تھا اور ہماری طرف پیٹھ کیے عنبر چچی کپڑے استری کر رہی تھیں۔

"ہینڈز اپ!" ذیشان نے آواز بدل کر اونچی آواز میں کہا تو چچی تیزی سے پلٹیں اور پھر ذیشان پر نظر پڑی۔

"شانی! یہ کیا شرارت ہے، اگر میرا دل بند ہو جاتا تو۔"

"مجھے پتا ہے، آپ بہت بہادر ہیں۔" اس کی آنکھوں میں ستائش تھی۔

"اور یہ آپ دروازہ لاک کیوں نہیں رکھتیں۔ آپ کو پتا نہیں ہے آج کل کے حالات کا، شریفوں کی اولادوں نے بھی ڈاکوؤں کے روپ دھار لیے ہیں۔"

"وہ دراصل ابھی روشن نکلا ہے۔ سحرش باتھ لے رہی تھی اس لیے دروازہ لاک کرنے نہیں جا سکی۔"

پھر یکایک ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں ابھی تک سیڑھیوں کے اختتام پر ریلنگ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ عنبر چچی بالکل ویسی ہی تھیں۔ ویسی ہی نازک ویسی ہی باوقار۔ ہاں چہرے پر کچھ گزرتے وقت کی تھکن تھی۔

"مشی!"

وہ تیر کی طرح میری طرف بڑھیں اور مجھے اپنے بازوؤں میں لے لیا اور بے تحاشا چوما اور میری آنکھوں کو بار بار چوما۔ دادی کہتی تھیں یہ آنکھیں تو قیر کی آنکھیں ہیں

اور ذیشان کبھی کبھی مذاق کرتا تھا کہ اگر کبھی توقیر چچا کی کوئی مونث کاپی ہوتی تو وہ مشی ہوتی۔
''میں نے تمہیں کتنا یاد کیا مشی بیٹا! میں نے تمہیں ہمیشہ بہت مس کیا۔''
''تم بہت پیاری ہوگئی ہو مشی۔''
انہوں نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ تھام کر' پھر میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور مجھے اپنے ساتھ لگائے صوفے پر بیٹھ گئیں اور شکایتی نظروں سے ذیشان کی طرف دیکھا۔
''میں اس سے دو سال سے کہہ رہی ہوں کہ کسی روز مشعال کو لاؤ۔''
ذیشان رخ موڑ کر کان کھجانے لگا۔
''عنبر چچی! میں نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں میری وجہ سے آپ کو وہ گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ اگر اس روز میں آپ کے گھر نہ جاتی اور اماں مجھے نہ دیکھتیں تو شاید آپ ہمیشہ وہاں ہی رہتیں۔''
''دھیان رکھیے گا مشعال! پھر یہاں سے بھی کہیں اور نہ جانا پڑ جائے۔ حاکمان شہر کا کیا اعتبار جو لوگوں کی قسمتوں کے فیصلے اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں۔''
روشن اچانک ہی سیڑھی پر نمودار ہوا تھا۔ میں شرمندہ ہوگئی اور عنبر چچی نے غصے سے اسے دیکھا۔
''روشن تم اتنے بدتمیز کب سے ہوگئے ہو۔''
وہ فوراً ہی میری طرف متوجہ ہوگئیں۔
''تم اس کی بات پر دھیان مت دینا اور برا مت ماننا۔ صاحبزادے کمانے لگے ہیں اس لیے ان کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہے اور ہمارا اس گھر سے آنا ناگزیر تھا۔ ایک روز ہمیں آنا ہی تھا۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔'' ان کے لہجے میں تلخی تھی انہیں روشن کا اس طرح بات کرنا بالکل پسند نہ آیا تھا' روشن ایک نظر ان پر اور ذیشان پر ڈال کر اندر کہیں کسی کمرے میں گم ہوگیا۔ اس نے ذیشان سے ہاتھ تک نہیں ملایا تھا۔ لیکن ذیشان نے ذرا بھی پروا نہیں کی تھی اور یوں ٹانگیں پھیلائے آرام سے بیٹھا تھا جیسے اپنے گھر میں بیٹھا ہو میں حیران تھی کہ روشن کے اس رویے کے باوجود ذیشان دو سال سے یہاں آ رہا تھا۔
عنبر چچی کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔
''سوری چچی جان! مجھے معلوم نہیں تھا کہ روشن کو ہمارا آنا اس قدر ناپسند ہوگا۔ مگر کل رات جب میں نے روشن کو دیکھا میں تب سے آپ سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی'' میں روشن کے رویے سے از حد افسردہ ہوگئی تھی۔
''ہم بھی تمہارے لیے بہت تڑپے ہیں مشی! اور یہ روشن تو بچپن میں تمہیں اتنا یاد کرتا تھا تمہاری ایک ایک بات دس دس بار دہراتا تھا۔ مشعال ایسی تھی۔ ایسے باتیں کرتی تھی۔ ایسے ہنستی تھی یہ تو تھکتا ہی نہیں تھا تمہاری باتیں کر کر کے۔''
اور مجھے لگا جیسے میرا دل ایک بیٹ گم کر بیٹھا ہو۔ پھر بھی میں نے سوالیہ نظروں سے چچی کو دیکھا۔
''مگر اب اس طرح کیوں کر رہا ہے۔ کل پارٹی میں بھی جب میں نے گھر آنے کو کہا تو صاف انکار کر دیا۔''
''وہ کچھ اپ سیٹ ہے ان دنوں دراصل۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔
''تمہیں یاد ہے مشی۔''
انہوں نے بات بدل دی۔
''تمہارے چچا نے تم سے ہاسپٹل میں کیا کہا تھا؟''
''ہاں!'' میں نے وہ بات کبھی نہیں بھولی تھی' جب چاچو نے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر کہا تھا۔
''مشی بیٹا! اپنی چچی کو اکیلا مت چھوڑنا۔ کبھی کبھی اس کے پاس آتی رہا کرنا' ہمیشہ تمہارے وجود سے اسے میرے ہونے کا احساس ہوگا۔''
توقیر چچا کا وہ زرد چہرہ' سفید لب' لاغر وجود' میری آنکھوں کے سامنے آ گیا اور میری آنکھیں انہیں یاد کر کے برس اٹھیں۔
''لیکن مجھے آپ کا گھر پتا نہیں تھا اور کوئی نہیں تھا جو آپ تک لاتا یہ ذیشان کا بچہ اس نے تو مجھے بتایا تک نہیں کہ یہ ادھر آتا رہا ہے دو سال سے۔''
عنبر چچی نے یکدم ایک بار پھر مجھے گلے لگا لیا' اب ان کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں۔ اب ہم دونوں ایک سی یادوں میں گھر گئے تھے۔ شاید انہیں بھی توقیر چچا یاد آ رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں خود ہی سنبھل گئے۔ ذیشان اٹھ کر ادھر ہی چلا گیا جدھر روشن گیا تھا۔

تب ہی سحرش آ گئی اور میں سحرش کو دیکھ کر ایک لمحہ مبہوت رہ گئی۔ لانبا قد نازک سراپا' گلابی رنگت' سیاہی مائل براؤن آنکھیں وہ تو پہلے سے بھی زیادہ پرکشش ہو گئی تھی۔ کمر تک لانبے گیلے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا' اس قدر نکھری اور اتنی بے تحاشا خوبصورت میں یکدم اٹھی۔

''سحری! پہچانا اسے؟''

''مشعال!'' وہ دونوں ہاتھ پھیلائے میری طرف بڑھی تھی۔

توقیر چچا سے میری اتنی زیادہ مشابہت میری پہچان تھی لیکن میں اگر سحرش کو کہیں اور دیکھتی تو نہ پہچان پاتی۔ وہ بچپن میں عنبر چچی کی طرح لگتی تھی۔ لیکن اب عنبر چچی کے ساتھ معمولی مشابہت کے باوجود اس کے حسن کا رنگ جدا تھا۔ میرے پاس لفظ نہیں کہ میں اس خوبصورتی کی تعریف کر سکوں شاید یہ اس کے اندر کا حسن تھا جس نے اس کے چہرے پر اتنی معصومیت اور دلکشی پیدا کر دی تھی پھر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ جب بھی اٹھنا چاہا تو سحرش اور عنبر چچی نے روک لیا۔

میں سحرش اور چچی کے ساتھ کچن میں ہی چلی گئی اور جب ہم واپس ٹی وی لاؤنج میں آئے تو روشن اور ذیشان صوفے پر بیٹھے ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے اور روشن بھی بالکل نارمل لگ رہا تھا۔ میں اس پر ایک نظر ڈال کر صوفے پر بیٹھ گئی سحرش نے پنکھے کے نیچے کھڑے ہو کر پسینہ خشک کیا اور بالوں میں کلپ لگا کر ٹیبل پر برتن لگانے لگی کچھ دیر بعد چچی بھی آ کر بیٹھ گئیں۔ لاؤنج میں کھانے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''چچی! آپ کے ہاتھ کے پکے کھانے ہم بھی نہیں بھولے۔''

''ندیدے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں چچی! مشی جیسے یہ آپ کو یاد کرنے کے بجائے آپ کے ہاتھ کی بنی بریانی کو یاد کرتی تھی۔ شانی! چچی بریانی کتنے مزے کی بناتی تھیں ہے نا۔''

اس نے میری نقل اتاری۔

''تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔''

''آج کل تو نیکی کا زمانہ ہی نہیں رہا چچی' ایک تو میں اسے یہاں لے کر آیا ہوں اور یہ بجائے احسان مند ہونے کے۔۔۔۔''

''تم نہ لاتے تب بھی میں آج ضرور آتی چچی کی طرف۔''

''صبح نہانے سے ساتھ؟'' روشن نے مجھے مخاطب کیا لیکن میں نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور سحرش کے بالوں سے پانی کی طرف متوجہ ہو کر دوپٹے سے خشک کرنے کے متعلق بتا رہی تھی۔ روشن نے دوبارہ مجھے مخاطب نہیں کیا' کھانا کھا کر ہم فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''تم اتوار کو ضرور آنا میں بریانی پکاؤں گی۔''

چچی نے جاتے جاتے تاکید کی۔

''آپ بے فکر رہیں' اب یہ اکثر ہی یہاں دکھائی دیں گی۔'' ذیشان نے چچی کو جواب دیا۔

''تم کیوں جلتے ہو۔'' میں نے ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے بات کی۔

''میری مرضی' چاہے ساری عمر یہاں رہ جاؤں۔''

''خیر ساری عمر رہنے کیلئے تو باضابطہ طور پر آنا پڑے گا تمہیں اور صرف تمہاری مرضی سے کام نہیں چلے گا۔ دونوں کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔''

ذیشان کی بھی عادت تھی جو منہ میں آتا بلا جھجک کہہ ڈالتا' روشن کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی اور میں شرمندہ ہو گئی۔

''اس کے چچا کا گھر ہے' بھلے ساری زندگی رہے'' چچی نے مجھے اس شرمندگی سے نکالا۔ لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے رخسار تپ رہے ہوں۔ عنبر چچی سے ملنا ایک ایسا خواب تھا جو میں سات سال سے سوتے جاگتے دیکھ رہی تھی۔

''دھیان رکھنا' کسی کو بھنک بھی نہ پڑے۔''

ذیشان نے میرے دمکتے چہرے کو دیکھ کر تاکید کی اور میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے سر ہلا دیا۔ تمام راستہ ہمارے درمیان خاموشی رہی تھی۔ ذیشان بھی جو چچی کے ہاں چہک رہا تھا۔ راستہ بھر خاموش سا کچھ سوچتا رہا تھا۔ گاڑی لاک کر کے وہ میری طرف آیا تو میں نے پوچھا۔

''کیا روشن نے تمہیں بتایا ہے کہ اس نے وہ بات تم سے کیوں کہی تھی؟''

میں نے اچانک پوچھ لیا تو اس نے چونک کر اثبات میں سر ہلایا۔

''کیا؟''

''کوئی خاص نہیں پھر بتا دوں گا۔''

اس نے اندرونی گیٹ کو دھکیلا۔ وہ کھلا تھا اور سامنے ہی ٹی وی لاؤنج میں فروا اور ماریہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ فروا نے ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔

''تو چچی گھومنے پھرنے کیلئے گئی تھی۔''

''نہیں تو ہم تو۔'' ذیشان نے مجھے گھور کر دیکھا۔

''میں ایک دوست کی طرف گئی تھی' اچانک پروگرام بن گیا تھا۔ میں نے اماں کو بتا دیا تھا۔''

میں ماریہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''ذیشان کے سر میں درد تھا اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ پھر تم نے اسے کیوں تکلیف دی' ڈرائیور مجھے چھوڑ کر آ جاتا تو اس کے ساتھ چلی جاتیں۔''

بظاہر اس کا لہجہ نارمل تھا لیکن اس میں کچھ تھا جس نے مجھے چونکایا۔ لیکن میں سمجھ نہ سکی۔

''سوری فروا! میں تمہیں ڈراپ نہ کر سکا۔ اس وقت واقعی میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔'' ذیشان ہنسا۔

''سزا کے طور پر کل میں سارا دن تمہارا ڈرائیور بننے کو تیار ہوں' تم رات لسٹ بنا لینا۔ جس جس فرینڈ سے ملنا ہے' جس جس جگہ جانا ہے۔''

''او کے پھر کل مکر نہ جانا۔''

''ان دو گواہوں کی موجودگی میں مکرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

ذیشان کی رنگ گھماتا اپنے کمرے میں چلا گیا اور میں بھی اٹھ کھڑی ہوئی اس سے پہلے کہ فروا پوچھتی کہ میں کس سہیلی کے پاس گئی تھی۔ چند لڑکیوں کے سلام دعا ضرور تھی لیکن دوست میری صرف ایک ہی تھی صوفیہ' کمرے میں آ کر اپنے بیڈ پر لیٹ کر میں بہت دیر تک دل ہی دل میں اس خوشی کو انجوائے کرتی رہی جو عنبر چچی اور سحرش سے مل کر مجھے ہوئی تھی۔

روشن کے لیے میرے دل میں غصہ اور ناراضگی تھی۔ دادی جان اور تائی جان نے جو کچھ کیا تھا۔ اس میں ہمارا کیا قصور تھا۔ ہم سب بچے تو ان سے پیار کرتے تھے۔ گو ماریہ' فروا اور میران وغیرہ تائی اماں اور دادی کے خوف سے عنبر چچی کی طرف نہیں جاتے تھے لیکن

سحرش اور روشن کو وہ بھی پسند کرتے تھے۔ پھر روشن کا موڈ یوں خراب تھا جیسے اس میں ہمارا قصور ہو۔ ٹھیک ہے وہ اپنا موڈ خراب رکھے میں بھی اس سے بات نہیں کروں گی۔ میں نے بھی دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا۔

لیکن اس فیصلے پر قائم نہ رہ سکی۔ میں اب اکثر یونیورسٹی سے ہی عنبر چچی کی طرف چلی جاتی تھی کیونکہ بطور خاص گھر سے آنا مشکل تھا اس طرح سب مشکوک ہو سکتے تھے۔ کیونکہ جھوٹ بول کر ایک دن یا دو دن تو میں آ سکتی تھی' لیکن ہمیشہ نہیں' سو کئی بار تو یوں ہوتا کہ کوئی کلاس نہ ہوتی اور ہم جلدی فارغ ہو جاتے اور میں لائبریری جانے کے بجائے' عنبر چچی کی طرف چلی جاتی۔ جس روز میرا پروگرام جانے کا ہوتا میں ڈرائیور سے کہہ دیتی کہ واپسی پر مجھے لینے نہ آئے میں خود ہی آ جاؤں گی۔

یا پھر میں میران کی گاڑی لے آتی جو میران کے جانے کے بعد زیادہ تر کھڑی ہی رہتی تھی بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ کسی کو ضرورت پڑ جاتی تھی ورنہ ابا اور تایا کے پاس اپنی گاڑیاں تھیں۔ ذیشان کے پاس بھی اپنی سوزوکی تھی۔ اس روز میں یونیورسٹی جانے کے بجائے سیدھی عنبر چچی کی طرف آئی تھی میرے پاس میران کی کرولا تھا۔ دراصل مجھے چھ سات دن ہو گئے تھے ادھر آئے اور سحرش نے صوفی کو فون کیا تھا اور بتایا تھا کہ چچی کی طبیعت خراب ہے انہیں ملیریا تھا۔

''اتنے دنوں بعد آئی ہو مشی؟''

انہوں نے شکوہ کیا اور ہمیشہ کی طرح میری آنکھوں کو چوما۔

''زیادہ دن تو نہیں ہوئے چچی۔'' میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''آپ لیٹ جائیں' آپ کو ٹمپریچر ہے۔''

''اب تو بہت بہتر ہوں' لیکن دو دن پہلے تو بہت ہائی فیور تھا۔ روشن اور سحرش تو پاگل ہو گئے تھے۔ رو رو کر برا حال کر لیا تھا دونوں نے' بالکل بچے ہیں۔ روشن دو دن آفس نہیں گیا۔ آج زبردستی بھیجا ہے۔ کہہ رہا تھا چھٹی لے کر آ جاؤں گا۔

باپ کی موت نے انہیں بہت حساس بنا دیا ہے۔ ذرا میرے سر میں بھی درد ہو تو سہم جاتے ہیں۔''

سحرش کی آنکھیں اب بھی آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔

''پگلی!'' میں نے اسے ساتھ لگا لیا۔

''اللہ چچی کو انشاء اللہ بہت لمبی زندگی دے گا اور وہ تمہارے بچوں کو کھلائیں گی۔''

سحرش سرخ ہوگئی۔

''میں تو چاہتی ہوں کہ جلد ہی اس کی شادی کر دوں ابھی پچھلے دنوں ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ لیکن اس نے رو رو کر برا حال کر لیا۔''

عنبر چچی افسردہ سی ہوگئیں۔

''ہاں تو میں نے کہہ دیا ہے نا کہ مجھے نہیں کرنی شادی کسی سے بھی نہیں۔''

سحرش آنسو چھپاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ عنبر چچی کسی گہری سوچ میں پڑ گئیں اور شاید اس انکار کی وجہ سے ہی روشن نے وہ سب سوچا ہو اور اگر سحرش کے دل میں ذیشان کا خیال ہے تو بھلا یہ کیسے ممکن ہے کیا وقت کے صفحے پر کوئی اور کہانی رقم ہونے والی ہے۔

سحرش کا بے پناہ حسن

اس کے آنسو، چچی کی سوچ

ذیشان کی خاموشی

اور روشن کی تنبیہہ

''میں ذرا سحرش کو دیکھوں، کہاں چلی گئی ہے۔''

اپنی پریشان خیالی سے گھبرا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی تو چچی نے بھی سر ہلا دیا میں ان کے کمرے سے باہر نکلی تو ٹی وی لاؤنج میں روشن کھڑا دکھائی دیا وہ ابھی ابھی آیا تھا۔

''مشعال کیسی ہو؟''

اس روز کے بعد میری آج ملاقات ہوئی تھی۔ کیونکہ عموماً میں جب آتی وہ آفس میں ہوتا تھا۔

''اچھی ہوں۔''

میں جواب دے کر کچن کی طرف مڑی۔ میرا خیال تھا سحرش کچن میں ہوگی، کیونکہ اس نے بتایا تھا کہ وہ میرے آنے سے پہلے چچی کیلئے ساگودانہ بنانے جا رہی تھی۔

''مشو!'' اس نے بچپن کی طرح پیچھے سے آواز دی۔

''خفا ہو؟''

''نہیں تو بھلا مجھے کیا حق ہے خفا ہونے کا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی میرے منہ سے نکل گیا۔

''ایسا مت کہو مشعال! ہم بچپن کے دوست ہیں۔ جب کوئی بھی نہیں تھا تب بھی ہم سب اکٹھے تھے۔ بابا تمہیں ساتھ لایا کرتے تھے ساری میرے رویے سے تم ہرٹ ہوئی ہو۔ لیکن مشعال تمہیں کیا خبر ہم نے کتنا مشکل وقت گزارا ہے اکیلے اور تنہا ہمیں مالی پریشانی نہیں تھی امی نے بھی ایک پرائیویٹ سکول میں جاب کر لی تھی جواب سال بھر پہلے چھوڑی ہے۔ لیکن ہم کتنے تنہا تھے کوئی بھی اپنا نہیں تھا۔ ایک بار جب امی بیمار ہوئیں تو میں اور سحرش پوری پوری رات ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اکیلے جاگتے اور روتے تھے۔ پھر امی کو ہاسپٹل میں داخل کروانا پڑا تب...... خیر چھوڑو، چلو دوستی کر لیں۔''

اور میں مسکرا دی۔ تب ہی سحرش بھی آ گئی وہ منہ دھو کر آئی تھی اس کی آنکھیں روئی روئی لگ رہی تھیں۔

''امی جان کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' روشن نے پوچھا۔

''کچھ دیر پہلے میں نے ٹمپریچر چیک کیا تھا۔ بخار نہیں تھا۔ اب سو رہی ہیں۔''

سحرش نے بتایا اور ہم تینوں وہاں ہی بیٹھ گئے۔ اس روز ہم نے بہت باتیں کیں۔ بہت ساری باتیں جو میرے ذہن سے نکل گئی تھیں، وہ روشن کو یاد تھیں کیونکہ وہ بڑا تھا۔

''مشعال! میں نے ہمیشہ تمہیں اور شانی کو مس کیا اور اتنا ہی یاد کیا جتنا سحرش اور امی یاد کرتی تھیں۔''

جب میں جا رہی تھی تو روشن نیچے تک مجھے خدا حافظ کہنے آیا، میری گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھے اس نے کہا۔

''لیکن جب اس روز تم ملیں تو میں خوفزدہ ہو گیا۔ سحرش نے ڈاکٹر علی کے پروپوزل کو قبول کرنے سے منع کر دیا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر علی میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ انکار کیا جاتا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بہترین رشتہ تھا امی جان کی ایک کولیگ کا بیٹا۔ یہ سوچنے والی بات تھی میں نے سوچا اور پریشان ہو گیا کیا سحرش کچھ اور سوچ رہی ہے؟ کوئی ناممکن بات جو اگر ممکن ہو بھی جائے تو...... تو کیا ہوگا' رومیاں' دوریاں نفرتیں ان رشتوں سے جو بہت

پیارے ہوتے ہیں بہت اپنے جو دکھ ہم نے سہا ہے۔ جو کرب ہم نے جھیلا ہے وہ ہماری نسل نہیں جھیلے گی مشعال! ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے جو ہمارے بچوں کو ہماری طرح اکیلا کر دے۔

ہم جبر کرلیں گے' اپنی ذات پر کہ ہم نے جبر کرنا اور صبر کرنا سیکھا ہے لیکن ہم اپنی اولاد کو اپنی محرومیاں منتقل نہیں کریں گے۔ میں نے ذیشان سے بات کی تھی' اسے میری بات سے اتفاق ہے۔ سحرش کو بھی ہے۔''

اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی تھیں۔ جیسے وہ مجھ سے بھی یہی کہہ رہا ہو۔

''مشعال! ایسا کوئی خواب نہ دیکھنا' جس کی تعبیر کی صورت میں ہمارے بچے رشتوں کی محبتوں سے محروم ہو جائیں۔ کوئی ایسی آرزو دل میں مت پالنا' جو حسرت بن جائے''۔

اور میں نے مسکرا کر اس کی تائید کی۔

''تم صحیح کہتے ہو روشن! اور بے فکر رہو' تمہاری اولاد رشتوں سے محرومی اور اپنوں سے دوری کا دکھ نہیں پائے گی۔ انشاءاللہ''

اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی اور مضطرب آنکھوں میں سکون سا پھیل گیا۔

لیکن جذبوں پر کس کا اختیار ہوتا ہے' وہ تو بے اختیار ہوتے ہیں۔ ان پر بند نہیں باندھے جا سکتے اور انہیں زنجیریں نہیں پہنائی جا سکتیں۔ مجھے بھی پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کب اور کیسے روشن میرے دل میں اتر آیا تھا۔ کہاں مجھ سے یا اس سے کوئی چوک ہو گئی تھی ہم چاروں بہت اچھے دوست تھے۔

ذیشان کی نظروں کو میں نے کئی بار بھٹکتے دیکھا تھا اور سحرش کی پلکوں کا جھکنا اور اٹھنا۔ لیکن ذیشان کو خود پر اختیار تھا اور مجھے بھی۔ ہم چاروں ایک ان دیکھے وعدے کی زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ شاید ہم ایک دوسرے کیلئے اپنے جذبات کو سمجھتے تھے لیکن اظہار سے ڈرتے تھے۔ جانتے تھے کہ آگے راستے بند ہیں۔ دو سالوں کی قربت نے ہمیں ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

گھر میں فروا اور ذیشان کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں اور ذیشان از حد پریشان

تھا۔ وہ رات دیر تک لان میں ٹہل ٹہل کر سگریٹ پیتا میں نے کئی بار اسے دیکھا میں جانتی تھی کہ اسے کیا پریشانی ہے لیکن میرا تو دل خود ریزہ ریزہ ہوا جاتا تھا۔

تائی جان' فروا اور ذیشان کی شادی کے ساتھ ہی مجھے اور میران کو بھی ایک دوسرے سے منسلک کرنے کی باتیں کر رہی تھیں۔ میں ذیشان کا درد سمجھتی تھی اور میں خود کو اس درد سے پگھلتے پاتی تھی۔

میرے پیپرز ہو گئے تھے۔ اب میں یونیورسٹی سے عنبر چچی کے ہاں نہیں جا سکتی تھی سو کبھی کبھار ہی دس بارہ دن بعد جا پاتی تھی۔

اس روز بھی کوئی پندرہ دنوں بعد میں صوفیہ کے گھر جانے کا کہہ کر گھر سے نکلی تھی اور صوفیہ کے پاس صرف پندرہ منٹ بیٹھ کر میں اسے بتا کر سمن آباد چلی آئی۔ چھٹی کا دن تھا اس لیے روشن بھی گھر پر ہی تھا۔

''مشعال! تمہیں پتا ہے' کتنے دنوں بعد آئی ہو' پورے پندرہ دنوں بعد۔''

''ہاں اب یونیورسٹی جو نہیں جانا ہوتا اور یہ چچی جان کہاں ہیں؟''

''وہ نیچے کرائے داروں کی طرف گئی ہیں' سحرش! جاؤ بلا لاؤ انہیں۔''

روشن نے سحرش سے کہا اور پھر میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''تم اب کیا کرو گی' جاب؟''

''نہیں' دادی اور اماں کہاں جاب کی اجازت دیں گی۔''

''پھر۔۔۔۔شادی۔'' وہ ہولے سے ہنسا' میں خاموش رہی۔

''مشعال! یہ قدرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ دل ان لوگوں کے ساتھ کی تمنا کرتا ہے جو کبھی ہمارے نہیں ہو سکتے۔''

میرے آنسو میرے اندر گرنے لگے قطرہ قطرہ کر کے۔

''مشو!'' وہ یکدم کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا نچلا ہونٹ اتنے زور سے دانتوں تلے دبایا کہ خون چھلک آیا۔

اور پھر کتنی ہی دیر وہ ٹہل ٹہل کر جیسے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ میں ہاتھ گود میں دھرے ساکت بیٹھی تھی۔

''مشی!'' یکایک وہ میرے سامنے آ کر ٹھہر گیا۔

"مشعال! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میرا دل تمہاری رفاقت کا تمنائی بن گیا ہے۔"

اور یہ روشن کہہ رہا تھا' جس نے عہد لیا تھا کہ ہم ایسی کوئی آرزو اپنے دل میں نہیں پالیں گے۔ جو اپنی اولاد کو ان محرومیوں سے بچانا چاہتا تھا جو اس کا مقدر بنی تھیں۔

"مشعال!" وہ میرے قریب ہی کارپٹ پر بیٹھ گیا۔

"جانتی ہو' کیا سوچتا ہوں؟"

میں نے پلکیں اٹھائیں۔ خواب تو میری آنکھوں میں بھی جل رہے تھے اور ان دو سالوں میں پتا نہیں کب کیسے کس لمحے وہ دل کی آرزو بن بیٹھا تھا لیکن ہم تو وعدوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

"ایک رات کو مستعار مل جاؤ تم تو اگلی صبح تمہارے قریب کہیں جلے ہوئے پروں کے ساتھ پایا جاؤں۔ کیسی عجیب سی حسرت ہے مشعال! بہت سی خواہشوں کو مٹی کر کے یہ خواہش میرے وجود کو کسی خشک لکڑی کی طرح جلائے جاتی ہے۔"

اس کی آواز بھاری اور خوابناک ہو گئی تھی۔

"روشن' تم نے تو کہا تھا کہ ایسا کوئی خواب نہ دیکھنا جس کی تعبیر ممکن نہ ہو۔"

"ہاں لیکن مشعال! تعبیر نہ ملنے کا ڈر ہو تو کیا خواہشوں بھرے خواب ببول کے کانٹوں سے بھر دینا چاہئیں۔ کہیں کچھ نہ کچھ حسین سا سرا کوئی دلدار سا دھوکہ۔" اس کی آواز ڈھے گئی۔

"تم نہیں جانتیں مشعال! میں اپنے آپ سے لڑتے لڑتے تھک گیا ہوں میں نے اپنی آنکھوں کو ان خوابوں کے حوالے کر دیا ہے۔ جن کی تعبیر کہیں نہیں' میں جانتا ہوں مشعال! پھر بھی' پھر بھی میں نے ایسا کیا ہے۔"

وہ ہولے سے ہنسا' عجیب درد بھری ہنسی تھی۔

"آنکھوں کو خواب دیکھنے سے کون روک سکتا ہے۔ دل کو کس نے پابۂ زنجیر کیا ہے مشعال! مجھے تو پتا ہی نہیں چلا کب میں ذرہ ذرہ ہو کے تمہارے اندر مدغم ہو گیا۔ کب میرا اپنا آپ باقی نہیں رہا۔ لیکن مشعال! اس کے باوجود عہد جو ہم نے خود سے کیا ہے' وہ تو اپنی جگہ ہے۔ عہد ٹوٹنے کے لیے نہیں ہوتے۔ ہم اپنے بچوں کو وہ محرومی نہیں دیں گے مشعال! جو ہمارا

نصیب بنی اور میرا اور سحرش کا' ہم کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جو ہمیں ہمارے اپنوں سے دور کر دے میں جانتا ہوں' تم سے امی بہت محبت کرتی ہیں لیکن تمہارے ہاں تو کوئی مجھے نہیں چاہتا نا۔ یہ محرومی صرف ہمارا نصیب ہے۔ ہمارا ہی رہے گی ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ یکدم اٹھا اور تیز تیز چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں ساکت بیٹھی رہ گئی۔ میرے اندر نارسائی کا کرب جاگ اٹھا تھا۔ لیکن نارسائی کے کرب کے ساتھ ساتھ بے کل سی خوشی بھی دل میں کسی جگنو کی طرح جگر جگر چمک سی پیدا کرتی جاتی تھی' روشن کی محبت کا احساس۔ ندی کے کناروں کے نہ مل سکنے کے باوجود بھی یوں لگ رہا تھا جیسے نیلے پانیوں میں بھٹکتے بھٹکتے اچانک زمین کی موجودگی کی خوشخبری مل جائے۔ کہیں اوپر آسمانوں پر اڑتے پرندے دیکھیں اور دل میں کہیں چراغ جل اٹھیں۔ گو دور تک صرف پانی ہی پانی ہو لیکن ایک احساس کہ کہیں زمین موجود ہے۔

کیا خبر کبھی کشتی امید ساحل سے آ لگے' میں بھی بیک وقت نارسائی اور محبت کا درد سنبھالے ششدر بیٹھی تھی کہ سحرش اور چچی آ گئیں۔ میں نے دیکھا کہ سحرش بھی بجھی بجھی سی تھی۔ شاید ذیشان نے اسے گھر میں ہونے والی باتوں کے متعلق بتا دیا تھا۔ میں زیادہ دیر نہ بیٹھی حالانکہ چچی نے بہت روکا اور میں اماں کو بتا کر آئی تھی کہ کھانا صوفی کے ساتھ کھا کر آؤں گی۔

فروا نے مجھے دیکھ کر بھنویں اچکائیں۔

"تمہیں تو کھانا کھا کر آنا تھا پھر۔"

"ہاں طبیعت ٹھیک نہ تھی۔"

میں فروا کی بات کا جواب دے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو فروا نے آواز دی۔

"کیا بات ہے مشی! آج کل تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ کچھ اپ سیٹ سی لگتی ہو بہت دنوں سے۔"

"نہیں تو وہم ہے تمہارا۔"

میں نے اسے دیکھے بغیر کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ آج کا دن بہت خاص تھا' بہت انوکھا۔ آج روشن نے اپنی محبت کا اقرار کیا تھا لیکن ساتھ ہی نارسائی کی پیش گوئی بھی کر دی تھی۔ میں تو جانے خود کب کس لمحے سے اس کی محبت میں گرفتار تھی یہ جذبہ یک طرفہ تو نہ تھا لیکن اس کا انجام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کیسی عجیب سی کیفیت تھی۔ کبھی جی چاہتا زور زور سے ہنسوں، اتنی ساری خوش ہوں

اور کبھی جی چاہتا بہت سارا رو لوں۔

میں چپ چاپ آنکھیں موندے اپنے کمرے میں لیٹی رہی۔

میں اس خوشی کو اپنے اندر اتارنا چاہتی تھی، محسوس کرنا چاہتی تھی اور اس دکھ کو برداشت کرنا تھا مجھے۔

نارسائی کا دکھ۔

لاحاصلی کا غم۔

میں کھانے کیلئے باہر نہ آئی۔ ماریہ دو بار بلانے آئی تھی اور میں نے بھوک نہ ہونے کا کہہ دیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ آج مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے مجھے کسی سے بات نہ کرنا پڑے اور میں یونہی آنکھیں موندے لیٹی رہوں اور اس محبت کی خوبصورتی کو محسوس کرتی رہوں جو میں نے آج روشن کی آنکھوں میں اپنے لیے پائی تھی۔

اس کا گھمبیر لہجہ میرے کانوں میں رس گھولتا تھا اور اس کی دلکش آنکھیں۔ اس کا وجیہہ سراپا۔ میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ میں اس کیفیت سے باہر نہیں آنا چاہتی تھی لیکن شام کو ماریہ زبردستی مجھے کھینچ کر باہر لے آئی۔

''تم تو ایسے موسم پر مرتی ہو مشی! پھر اندر کیوں گھسی ہو۔''

باہر ہلکی بارش تھی اور موسم غضب کا ہو رہا تھا۔ سب بھیگ رہے تھے، ہنس رہے تھے، خوش ہو رہے تھے، ماریہ مجھے بھی کھینچ کر بارش میں لے آئی ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگنا اچھا لگا۔ یکایک میرا جی چاہا کہ بہت تیز بارش ہو، موسلا دھار اور میں اس میں بھیگتی رہوں یہاں تک کہ میرے ہونٹ نیلے ہو جائیں۔

''کیا سوچ رہی ہو۔''

لان چیئر برآمدے میں کھینچ کر بیٹھتے ہوئے ماریہ نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''میں چونکی۔

فروا نے بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر مڑ کر گیٹ سے باہر آتے ذیشان کو جو خلاف معمول بے حد سنجیدہ سا لگ رہا تھا۔

''کہیں جا رہے ہو ذیشان؟''میں نے پوچھا۔

''ہاں۔۔۔!''اس نے سنجیدگی سے کہا اور پھر وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔

''بھائی!''ماریہ نے اسے آواز دی۔

''رک جائیں نا، میں پکوڑے بنانے جا رہی ہوں کچن میں۔''

''مجھے کام ہے۔''وہ گیٹ کھول کر واپس مڑا اور پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھا میں نے دیکھا فروا کی نگاہیں اسی پر تھیں۔

''مشی! تم نے محسوس کیا کہ شان آج کل بہت سنجیدہ اور چپ چپ رہتا ہے۔''

ماریہ نے مجھے مخاطب کیا۔

''اس سے کیا کہتی ہو، یہ تو خود کھوئی کھوئی رہتی ہے۔''

فروا کا لہجہ بظاہر نارمل تھا لیکن پچھلے کئی دنوں کی طرح میں نے محسوس کیا کہ کچھ ہے اس کے لہجے میں لیکن کیا۔۔۔۔ یہ مجھے سمجھ نہیں آیا۔

''شان کے ساتھ ضرور کوئی مسئلہ ہے۔''ماریہ نے پھر خیال ظاہر کیا۔

''شاید۔''میں نے مختصراً کہا۔

''لیکن مجھے معلوم نہیں۔''

اور اس سے بھی تو پوچھو، اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟''فروا نے ماریہ کی طرف دیکھا۔

''میرے ساتھ تو کوئی مسئلہ نہیں۔''میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''تمہیں پتا ہے مشی! دادی جان وغیرہ کیا سوچ رہی ہیں۔''

''کیا؟''میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کہ ذیشان اور فروا کے ساتھ تمہارا ابھی میران کے ساتھ نکاح کر دیا جائے اور رخصتی پھر میران کے ہاؤس جاب کے بعد۔''

میرے لیے یہ نئی خبر نہ تھی، لیکن میں نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

''میران بھائی اچھے ہیں۔ قد بھی لمبا ہے تمہارے ساتھ سوٹ کریں گے۔''

''ہمارے بزرگ ہمارے لیے جو بھی سوچتے ہیں، بہتر سوچتے ہیں۔''

میرے سامنے روشن کا سراپا آ گیا۔ بلند قامت، میں اٹھ کر اندر چلی آئی، یکایک میرا

دل آ جٹ ہو گیا تھا ہر چیز سے۔

''اور یہ کتنا مشکل ہے روشن شاید تم نے سوچا نہ ہو اپنے اوپر جبر کرنا اور خود کو خود ہی پابہ زنجیر کرنا اور تم نے تو لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔

اس جنگ کے جیت جانے کی کیا دعا کی جائے اور کیا امید ہو جسے لڑا ہی نہ گیا ہو۔''

میں نے افسردگی سے سوچا اور اس نکاح کے لیٹ ہو جانے کی دعا کی' کچھ دن تو میں اس محبت کا مزا چکھ لوں اسے محسوس کر لوں۔

اپنے پور پور میں اتار لوں۔

لیکن اسی رات کھانے کی ٹیبل پر تائی اماں نے تایا ابا سے ذکر چھیڑ دیا۔

''میری خواہش تو آپ جانتے ہیں۔ زہرا کی بھی یہی خواہش ہے اور اب بچے اس قابل ہو گئے ہیں کہ ان کی شادیاں کر دی جائیں۔''

''ہاں ٹھیک ہے لیکن پہلے بچوں سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔''

یہ ابا کا خیال تھا لیکن تایا اور چچا نے بھی اس کی تائید کی۔

''یہ زندگی بھر کا مسئلہ ہے' کوئی ایک دن کی بات نہیں۔''

''گو اس کی ضرورت نہیں پھر بھی پوچھ لیا جائے گا اور میں چاہتی ہوں اگلے ماہ کے پہلے ہفتے میں نکاح ہو جائے' رخصتی پھر بعد میں ہوتی رہے گی۔''

تائی جان کی آواز کچن تک آ رہی تھی برتن سمیٹ کر میں باہر آ گئی ماریہ بھی میرے ساتھ تھی۔ فروا کھانا کھاتے ہی کمرے میں چلی گئی تھی بزرگ سب ابھی تک کھانے کی ٹیبل پر ہی تھے اور وہیں بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ میرا دل یکدم بے حد گھبرایا۔

''چلو ماریہ! باہر چلتے ہیں لان میں اندر بہت گھٹن ہے۔''

''ہے تو کچھ لیکن اس وقت نو بجے باہر لان میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔''

''تو آؤ اوپر ٹیرس پر چلتے ہیں۔''

''ہاں چلو فروا کو بھی لے لیتے ہیں۔''

تب ہی تائی جان نے ماریہ کو آواز دے کر قہوہ بنانے کیلئے کہا۔

''تم چلو مشی! میں قہوہ لے کر آتی ہوں۔''

ماریہ کچن کی طرف مڑ گئی اور میں ٹیرس پر جانے کیلئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

ایک ہی دن میں' میں نے اپنے اندر خوشیوں کے باغ کو کھلتے اور مرجھاتے دیکھا تھا۔

ٹیرس کی ریلنگ پر کہنی دھرے تھوڑا سا جھکا ہوا ذیشان باہر سڑک پر دیکھ رہا تھا۔ میں سمجھی تھی شاید وہ اپنے کمرے میں چلا گیا ہے اور انٹرنیٹ پر بیٹھا ہے۔ جب سے اس نے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کنکشن لیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ٹی وی لاؤنج میں بیٹھنے کے بجائے اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اکثر ثوبان اور انصر بھی چلے جاتے تھے اسی کے ساتھ یوں ٹی وی لاؤنج جو رات گئے تک ہمارے شور و غل سے گونجتا رہتا تھا ویران سا ہو گیا تھا اب تو انصر بھی کمپیوٹر لینے والا تھا۔ چچا جان نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اس نے A گریڈ لیا تو وہ اسے اپنا کمپیوٹر لے دیں گے۔

''ذیشان!'' میں نے آہستہ سے اسے بلایا تو وہ چونک کر مڑا اور ریلنگ کے پاس سے ہٹ کر چیئر پر آ کر بیٹھ گیا میں بھی دوسری کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

''تم یہاں تھے' میں سمجھی اپنے کمرے میں ہو۔''

''بس دل گھبرا رہا تھا یہاں چلا آیا۔''

''تم کچھ پریشان لگتے ہو ذیشان!''

میں نے ملگجے اندھیرے میں اس کے چہرے پر کچھ کھوجنے کی کوشش کی۔

''نہیں تو۔''

''مجھ سے کچھ مت چھپاؤ ذیشان! تم نے کھانا برائے نام ہی کھایا ہے۔ بلکہ کئی دنوں سے تم پریشان ہو کیا سحرش کی وجہ سے؟''

وہ خاموش ہی رہا۔

''بتاؤ نا۔''

''جب جانتی ہو تو کیوں پوچھتی ہو؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

''اس کا انجام؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ اپنے لہجے کی افسردگی کو چھپا نہ سکا۔

''تم جانتے ہو تمہارے اٹھنے کے بعد تائی جان نے تمہاری اور فروا کی شادی کی بات کی ہے۔''

''مجھے خبر ہے بہت دنوں سے۔''

''پھر تم کیا کرو گے ذیشان! کیا فروا سے شادی کرلو گے جب کہ تم سحرش کو پسند کرتے ہو۔''

''پسند تو بہت معمولی سا لفظ ہے میں تو اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' اس کے لہجے میں یکدم تھکن اتر آئی تھی۔

''اور اگر میں نے روشن ضمیر سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو میں عنبر چچی کی منت کرلیتا۔ کچھ بھی کرتا لیکن سحرش کو شریک زندگی کرلیتا۔''

''اور کیا تم سب کو چھوڑ دیتے' تائی جان' تایا جان' میران' ثوبان''

''بعض محبتیں پاور فل ہوتی ہیں مشی ساری محبتوں پر غالب آجاتی ہیں لیکن۔''

اس نے پاکٹ سے سگریٹ نکال کر جلایا۔

''یہ تم سگریٹ کب سے پینے لگے ہو؟''

''بہت دنوں سے جب میں نے روشن ضمیر سے وعدہ کیا اور جب سے مجھے پتا چلا کہ سحرش کیسے میری زندگی کا حصہ بن چکی ہے کیا میں اس کے بغیر جی پاؤں گا مشی'' وہ یکدم کھڑا ہوگیا اور مضطرب سا ٹہلنے لگا۔ سگریٹ اس کے ہاتھوں میں جل کر راکھ ہوا جاتا تھا اور وہ اپنے آپ سے بھی بے خبر بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔

وہ تو مرد تھا تو قیر چچا کی طرح فیصلہ کرنے کی قوت رکھتا تھا اور اگر روشن سے اس نے وعدہ نہ کیا ہوتا تو شاید وہ سحرش سے شادی کرلیتا لیکن میں۔۔۔۔۔

اور ایک لمحہ کو مجھے یوں لگا جیسے میرا دل ہولے ہولے ڈوب رہا ہو۔

''اب تم کیا کرو گے ذیشان؟'' میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

''کیا کرسکتا ہوں میں۔'' اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''اور فروا'' میں نے پھر بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔

''اس کا کیا ہوگا۔''

''کیا مطلب؟'' ذیشان ٹہلتے ٹہلتے رک کر مجھے دیکھنے لگا۔

''تمہاری اس سے شادی ہوجائے گی۔ لیکن تمہارے دل میں تو ہمیشہ سحرش رہے گی پھر فروا کا کیا قصور ہے کہ وہ تمہاری محبت سے محروم رہے' تمہیں تو کبھی نہ پاسکے۔''

فروا میری بہن تھی' میں اپنا دکھ بھول کر اس کے دکھ میں مبتلا ہوگئی تھی۔

''کاش ہم عنبر چچی کے ہاں نہ جاتے جو یوں ہوتا تو تمہیں آنے والے لمحوں کی کے خبر ہوتی ہے۔''

فروا تو بہت مختلف قسم کی لڑکی ہے۔ اماں اور تائی کی بے تحاشا محبت نے اسے نازک بنادیا ہے۔ بہت کومل اور نازک تو وہ ذیشان کی بے اعتنائی برداشت نہیں کرپائے گی۔

''یہی بات میں تم سے بھی تو پوچھ سکتا ہوں مشی! میران کا کیا قصور ہے؟''

وہ بالکل میرے سامنے کھڑا میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ میں ٹپٹا گئی۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب تم اچھی طرح جانتی ہو مشی!'' وہ تھکا تھکا سا میرے سامنے بیٹھ گیا اور میں انکار بھی نہ کرسکی۔

''تقدیر کبھی کبھی ہم انسانوں پر بہت ہنستی ہے۔ تم اور روشن ضمیر میں اور سحرش۔ میران' فروا یہ سب نصیب کے کھیل ہیں۔''

''لیکن یہ ظلم ہے ذیشان اور فروا پر۔''

''اور میران پر بھی۔'' اس نے میری بات مکمل کردی۔

''یہ نہیں ہونا چاہیے دیکھو جب تائی جان تم سے پوچھیں تو تم انکار کردینا۔'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔

''اور تم بھی منع کردینا'' اس نے بھی مشورہ دیا۔

''لیکن اگر انہوں نے اس کی وجہ پوچھی تو کیا کہوں گی میں۔''

''کہہ دینا تم روشن ضمیر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔''

وہ ہولے سے ہنسا لیکن اس کی ہنسی میں سینکڑوں کانچ تھے جن کی چبھن میں نے اپنے دل پر محسوس کی۔

ہم جانتے تھے کہ یہ بہت مشکل ہے لیکن ہم دونوں ہی دیر تلک وہاں بیٹھے مختلف تراکیب سوچتے اور رد کرتے رہے اور بالآخر یہ طے پایا کہ زندگی اسی طرح کٹے گی اور زہر کا یہ جام ہمیں پینا ہی ہوگا قطرہ قطرہ کرکے۔ ٹیرس کا دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے چاروں طرف دیکھا اور یہ ٹی وی لاؤنج تھا جہاں میں کھڑی تھی۔ سامنے دو بیڈ تھے اور سائیڈ پر اسٹور اور کچن تھا۔ یہ ایک مکمل گھر تھا جو توقیر چچا کا تھا لیکن خالی پڑا تھا۔ تایا جان' چچا جان اور ابا

جان کے پورشن نیچے تھے۔تو قیر چچا کا پورشن کبھی آباد نہیں ہوا تھا۔عنبر چچی وغیرہ کو انیکسی میں ٹھہرایا گیا تھا۔تائی جان کا خیال تھا کہ شادی کے بعد فروا اور ذیشان اوپر شفٹ ہو جائیں گے میرا دل بھر آیا مجھے تو قیر چچا بہت یاد آئے۔

ان کی محبتیں، ان کی شفقتیں، وہ ہم سب بچوں کے ساتھ بچہ بنے رہتے تھے اور پھر ان کی بیماری۔

ان کی وفات سب سوچتے ہوئے میں ہولے ہولے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور میں یکدم آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی اور گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔

''کیا ہوا مشی؟'' ذیشان نے جو مجھ سے پہلے نیچے آ گیا تھا اس نے مڑ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں مجھے تو قیر چچا یاد آ رہے ہیں۔''

میں نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''وہ کتنی جلدی چلے گئے تھے۔ابھی تو موسم گل پوری طرح ان کے آنگن میں آیا بھی نہیں تھا اور وہ دامن سمیٹ کر چل دیے تھے۔

میں نے اماں کا دل دکھایا ہے ناشاید اس لیے، بیماری کے دنوں میں وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

''کیا خبر کبھی اماں نے بددعا دی ہو۔''

''کاش دادی خوشی خوشی عنبر چچی کو قبول کر لیتیں تو شاید چچا زندہ رہتے شاید انہیں کچھ نہ ہوتا۔''

''ذیشان!'' میں نے بے اختیار اٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔''تم ایسا مت کرنا تم ایسا کبھی بھی مت کرنا ذیشان جیسا چچا نے کیا۔تم بالکل بھی چاچو کی طرح مت کرنا۔''

میرے آنسو میرے رخساروں پر بہتے چلے آ رہے تھے۔

''اگر تائی جان نے تمہیں بھی بددعا دے دی، اگر ان کا دل دکھانے پر تم بھی چاچو کی طرح نہیں پلیز نہیں۔''

''پاگل ہوگئی ہو مشی!'' اس نے آہستہ سے میرے ہاتھ الگ کیے۔

''میں ایسا کچھ کب کر رہا ہوں میں تو پہلے ہی تمہارے روشن ضمیر سے وعدہ کر چکا ہوں۔''

میں نے نم آنکھوں کے ساتھ چہرہ اوپر اٹھایا تو میری نظر فروا پر پڑی وہ شاید ابھی ابھی اپنے کمرے سے باہر آئی تھی۔یا پھر جب میں نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر ذیشان کا ہاتھ تھاما تھا تب۔لیکن جب میں سیڑھیاں اتر رہی تھی تب تو ٹی وی لاؤنج خالی پڑا تھا۔وہ چند قدم ہماری طرف بڑھی اور مڑ کر گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ ابھری۔

''رات کے ساڑھے بارہ بجے تم دونوں کون سا مسئلہ حل کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

''اچھا!'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔''پھر تم رو کیوں رہی ہو؟''

اس کے لہجے کی چبھن شاید ذیشان نے محسوس کر لی تھی۔

''اسے چاچو یاد آ رہے تھے۔'' ذیشان نے جواب دیا۔

''چاچو کو یاد کرنے کا بہت اچھا وقت ہے، ہے نا۔''

''فروا!'' ذیشان اس کی طرف مڑا۔''ایسا ہی ہے ہم چاچو کی باتیں کر رہے تھے کہ۔''

وہ ہولے سے ہنسی اور اس نے ذیشان کی بات کاٹتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔

''تمہیں آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے مشی! سب کچھ تمہارے حسب منشا ہی ہوگا۔''

اور پھر یکدم اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔

''یہ یہ کیا کہہ رہی تھی شان کیا میرے حسب منشا ہوگا؟''

میں نے شان سے کہا اور اس کے پیچھے لپکی۔

''فروا! فروا! سنو تم کیا کہہ رہی ہو اور تم بالکل غلط سمجھ رہی ہو۔''

میرے کمرے میں پہنچنے تک وہ لائٹ آف کر کے بیڈ پر لیٹ چکی تھی۔

''فروا!'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

''فروا پلیز!'' میں اس کے بیڈ پر ہی بیٹھ گئی۔''یہ تم نے ابھی جو کچھ کہا ہے پلیز اس کی وضاحت کرو۔کیا مطلب ہے تمہارا، اس سے مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم نے کچھ غلط تو نہیں سوچ لیا میں اور ماریہ اوپر جا رہے تھے ٹیرس پر لیکن ماریہ کو تائی جان نے قہوہ بنانے کیلئے

بلا لیا اور پھر وہ قہوہ بنا کر نہیں آئی اوپر وہاں ذیشان تھا ہم بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ چاچو کا پورشن دیکھ کر مجھے ان کی بہت ساری باتیں یاد آ گئیں' تمہیں تو پتا ہے میں اور ذیشان چاچو سے کتنے قریب تھے۔ جب عنبر چچی ادھر نہیں آئی تھیں تب وہ ہمیں گھر بھی لے جایا کرتے تھے ہمارے پاس ان کی بہت ساری یادیں ہیں۔''

میں مسلسل بول رہی تھی لیکن فروا خاموش دوسری طرف کروٹ لیے لیٹی تھی۔

''فروا!'' میں نے پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس نے پھر جھٹک دیا۔

''مجھے تنگ مت کرو مشی! مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''لیکن فروا! تم۔''

''پلیز صبح بات کرنا۔''

مگر صبح تو میرے اٹھنے سے پہلے ہی وہ تائی اور اماں سے بات کر چکی تھی کہ میں اور ذیشان چونکہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اس لیے ذیشان کی شادی اس کے ساتھ کرنے کے بجائے میرے ساتھ کر دی جائے اور میں ابھی ناشتہ کر رہی تھی کہ میرا بلاوا آ گیا۔ ہمیشہ کی طرح کالج اور آفس جانے والے ناشتہ کر کے جا چکے تھے۔ ثوبان' انصر اور ماریہ' ابا' چچا اور تایا' ذیشان عموماً نو بجے جاتا تھا آفس کیونکہ تایا پہلے جا چکے تھے۔ سو اگر اسے کبھی دیر بھی ہو جاتی تھی آج بھی میرا اور ذیشان کا ناشتہ ٹیبل پر ہاٹ پاٹ میں موجود تھا لیکن میں نے صرف چائے لی تھی اور ایک سلائس چائے کے ساتھ لے لیا۔

اماں اور تائی دادی کے کمرے میں تھیں۔

میں دادی جان کو سلام کر کے وہیں ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور اماں کی طرف دیکھا۔

''آپ نے بلایا تھا اماں۔''

اماں کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور پیشانی پر لاتعداد شکنیں تھیں۔ انہوں نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا۔

تائی نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا' اندر تک اترتی ایکسرے کرتی نظریں۔ مجھے گھبراہٹ سی ہوئی۔

''بات کیا ہے آخر۔'' فروا کی رات والی بات اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھی اور نہ ہی مجھے گمان تھا کہ فروا صبح ہی صبح اماں سے کہہ دے گی کچھ۔

''خیریت ہے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اماں کی طرف دیکھا۔

''تجھے شرم نہیں آئی مشی!'' اماں پھٹ پڑیں۔

''ذیشان اور فروا کی بات بچپن سے ہی طے تھی اور کیا تو نہیں جانتی تھی۔''

''اماں!'' مجھے شاک لگا۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''وہی جو سچ ہے اور جو۔۔۔۔''

''زہرا! حوصلے سے بات کرو۔'' تائی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔

''دونوں میری بیٹیاں ہیں اور میران اور ذیشان دونوں میرے بچے ہیں۔ ذیشان نہ سہی میران سہی میران اور فروا۔ ذیشان اور مشعال کا کر دیں گے۔ گھر کی بات ہے کیوں خالہ جان! اس میں کیا حرج ہے۔'' وہ بات کرتے کرتے دادی جان سے مخاطب ہو گئیں۔

''ہاں سکینہ! اس میں کیا حرج ہے۔ زندگیاں تو بچوں کو ہی گزارنی ہیں۔ ان کی جیسے خوشی ہو۔'' دادی جان نے بھی تائی کی تائید کی۔

''مگر خالہ!'' اماں روہانسی ہو رہی تھیں۔

''میری فروا کا کیا قصور ہے۔ بچپن سے ایک نام سنتی رہی ہے۔ آپا نے سینکڑوں بار کہا ہوگا کہ فروا میرے شان کی دلہن بنے گی۔ یہ ذرا سا منہ ہو گیا تھا اس کا۔''

میں ساکت بیٹھی تھی۔ یوں جیسے کسی نے میری گویائی چھین لی ہو جیسے میرے ہاتھ پاؤں زبان سب سن ہو گئے ہوں۔

''عنبر کا نمک ہے اس کے منہ میں' بچپن میں گھسی رہتی تھی اس کے پاس' اس کا تو مہوش سے کوئی رشتہ نہ تھا اگر اس نے توقیر کو چھینا تھا' تیری تو بہن تھی فروا۔''

اماں کی نظریں تیر کی طرح مجھے چبھیں' میں نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا ہونٹ کھولے لیکن لفظ اندر ہی کہیں چکرا کر گم ہو گئے۔ اتنا بڑا الزام میرے اعصاب کو چٹخا گیا تھا۔

''عنبر کا بھی کیا قصور ہے زہرا۔'' دادی جان نے ایک گہری سانس لی۔

''ہونی ہو کر رہتی ہے۔ کیا پایا اس نے بھی' بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی اور مہوش

ماشاء اللہ راج کر رہی ہے اپنے گھر میں چار بیٹوں کی ماں بن کر میاں اور سسرال والے پاؤں کے نیچے ہاتھ رکھتے ہیں' اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔''

یہ دادی جان بول رہی تھیں' جو عنبر چچی کا نام بھی نہیں سن سکتی تھیں۔

''تم نے تو بچی کو دہلا دیا۔'' انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''دادی جان!'' میرے لبوں سے بمشکل نکلا اور میں رونے لگی۔ زور زور سے۔

''کچھ نہیں' کوئی نہیں۔ اچھا ہوا پتا چل گیا پہلے ہی' بس اب اللہ کا نام لے کر ایک دن مقرر کر دو' اور نسبت طے کر دو دونوں کی' خاندان بھر میں پتا چل جائے سب کوئی لوگ پوچھتے ہیں۔''

''نہیں' پلیز دادی جان نہیں۔''

میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''ایسا نہیں ہے' ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ فروا کو غلط فہمی ہوئی ہے' آپ قسم لے لیں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔''

میں پھر رونے لگی۔ تب ہی ذیشان کی رنگ انگلیوں میں گھماتا اندر داخل ہوا۔

''اچھا اماں! میں چلا آفس۔''

''اے۔'' اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ ''اسے کیا ہوا صبح صبح رونے کا پیریڈ کیوں چل رہا ہے۔ کیا کوئی خاص میٹنگ تھی یہاں؟''

یکدم سنجیدہ ہو کر باری باری اس نے سب کی طرف دیکھا۔

''ذیشان!'' میں دادی جان کے بازو ہٹا کر کھڑی ہو گئی۔

''یہ۔۔۔۔۔۔ یہ فروا۔''

اور میری آواز گھٹ گئی۔ بہت سارے آنسوؤں نے حلق میں پھندا سا ڈال دیا۔

''بیٹا! تم فروا کے بجائے مشعال سے شادی کرنا چاہتے ہو کیا؟'' دادی جان نے دوٹوک بات کی۔

''کیا۔۔۔؟ کس نے کہا آپ سے؟'' اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی

''مشعال کو میں نے ہمیشہ اپنی بہن کی طرح سمجھا ہے بچپن سے ہماری کوئی بہن نہیں تھی اور یہ میری ایسی ہی بہن ہے جیسی ماریہ اور نصرت بہن ہے یہ فضول خیال آپ کے

ذہن میں کیسے آیا کہ میں مشعال سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

میرے وجود پر کپکپی سی طاری ہوئی اور میں روتے ہوئے پیچھے کھسکتی چلی گئی۔

''اور تم مشی! اتنی سی بات نہیں بتا سکتی تھیں کہ تم۔'' اس نے ایک نظر مجھے دیکھا اور پھر تائی جان کی طرف مڑا ''یہ لغو بات کہی کس نے۔''

''فروا نے۔''

''اس سے حماقتوں کے علاوہ کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اس نے یہ غلط بات کیوں سوچی اور کہی۔۔۔۔۔''

''یہ غلط نہیں ہے۔''

فروا اندر آ گئی اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''یہ غلط ہے فروا!'' ذیشان کا لہجہ سلجھانے والا تھا۔

''میں نے کبھی مشعال کے متعلق ایسا نہیں سوچا۔''

''فروا بیٹی!'' دادی جان نے اسے مخاطب کیا۔

''تم۔۔۔۔۔۔''

''اسے مشعال سے شادی نہیں کرنا تو نہ کرے لیکن مجھے ذیشان سے شادی ہرگز نہیں کرنی۔''

اس نے دادی جان کی بات کاٹ دی۔

وہ اس گھر کی پہلی پوتی تھی اور سب کی لاڈلی تھی۔ بلکہ ذیشان اور وہ دونوں ہی لاڈلے تھے۔

''میں ساری زندگی اس عذاب میں نہیں گزارنا چاہتی کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ مشی سے۔''

''ایسا نہیں ہے فروا! میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ وہ مشعال نہیں ہے جس سے میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا کوئی اور ہے؟''

وہ یکدم اس کی طرف مڑی تھی ذیشان ٹپٹا گیا۔

''تمہارا دماغ خراب ہے۔'' وہ جھنجھلا کر باہر نکل گیا۔

”میرا دماغ صحیح ہے یا خراب لیکن اماں! اگر آپ نے ذیشان کے ساتھ میری شادی کی تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گی۔“

”خدا نہ کرے۔“ تائی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اور اگر تمہاری شادی میران سے کر دی جائے تو۔“ دادی جان بے حد سکون سے بیٹھی تھیں۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ فروا جھپاک سے باہر نکل گئی۔

”تو پھر طے کر دو سکینہ! میران اور فروا کی اور مشعال اور ذیشان کی۔“

”نہیں۔“ میں نے تڑپ کر دادی جان کی طرف دیکھا۔

”ذیشان میرے لیے سگے بھائیوں جیسا ہے۔ میں نے ایسا کبھی سوچا نہیں۔ پلیز دادی جان۔“ میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”کہیں بھی کر دیں لیکن شان سے نہیں۔“

”کیا میران کو پسند کرتی ہو تم؟“ دادی جان نے مجھ سے سوال کیا۔

”نہیں میں نے کبھی کسی کے متعلق کچھ نہیں سوچا اس طرح ہم سب تو بہن بھائیوں کی طرح رہتے ہیں آپ فروا کی میران سے کر دیں وہ خوش رہے گی۔ اسے ڈاکٹر پسند بھی ہیں۔ اس نے کتنا کہا تھا ذیشان سے کہ وہ میڈیکل میں جائے لیکن شان کو پسند نہ تھا۔“

میں مسلسل روتے روتے کہہ رہی تھی۔

”تو پھر ذیشان اور تم۔۔۔۔“

”میرا انصر بھی تو ہے۔“ چچی جان نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔

”گو انصر مشی سے چار سال چھوٹا ہے لیکن اپنوں میں کوئی چھوٹائی بڑائی کون دیکھتا ہے اور ذیشان سے بڑھ کر مجھے کوئی عزیز نہ تھا اگر ماریہ کے لیے چند دن پہلے ہی میں نے باجی کو ہاں نہ کی ہوتی۔“

رشتے جوڑے جا رہے تھے اور میں دادی جان کے گھٹنوں پر سر رکھے ایک بار پھر ساکت بیٹھی تھی۔

”مشی!“ اماں نے کاٹتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”کزن سب آپس میں بہن بھائیوں کی طرح ہی ہوتے ہیں رہتے ہیں۔ لیکن جب شادیاں ہوتی ہیں تو سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ یہ کوئی بات نہیں ہوئی کہ ذیشان تمہارے بھائیوں جیسا ہے یا وہ تمہیں بہن سمجھتا ہے۔ تم اور ذیشان بچپن سے قریب ہو۔ تم ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہو گے۔“

”اماں!“ میں نے تڑپ کر انہیں دیکھا ان کی آنکھوں میں شک کے کوڑیالے اب بھی لہرا رہے تھے۔

”اب فروا اتنی بھی نادان نہیں ہے اور جب یہ طے ہو گیا کہ فروا اور میران کی شادی ہو گی تو پھر تمہیں ذیشان کے ساتھ شادی سے انکار نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تو نے بہن کا بھی خیال نہیں کیا۔“

اماں کا لہجہ اتنا سرد تھا کہ اس کی ٹھنڈک مجھے اپنی رگوں میں اترتی محسوس ہوئی۔ میرے اعصاب یکدم جواب دے گئے۔ میں نے بچپن سے اماں کی بے اعتنائی کا کرب سہا تھا۔ لیکن یہ بے اعتباری تو مجھے ریزہ ریزہ کیے دے رہی تھی۔ میں بولی تو میری آواز بلند تھی پھٹی پھٹی۔ سی میں اپنے آپ میں نہ تھی۔

”میں نے کچھ نہیں کیا اماں! کچھ نہیں، ذیشان شروع سے بہت شروع سے سحرش کو پسند کرتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا اماں۔ مجھے فروا سے محبت ہے میں فروا کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔ میں تو میں تو۔۔۔۔۔“

پھر جیسے سب کچھ معدوم ہو گیا، دھندلے ہوتے ہوتے سب کے چہرے میری نظروں سے غائب ہو گئے۔

”ارے بچی کو دیکھو زہرا۔“

دادی جان چلائی تھیں اور میری آنکھیں بند ہو گئی پھر پتا نہیں کتنی دیر بعد ہوش آیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو میں دادی جان کے بیڈ پر تھی، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

”لیٹی رہو بیٹا!“ دادی جائے نماز پر بیٹھی تھیں۔

”میں۔۔۔ کیا ہوا تھا مجھے؟“

”کچھ نہیں۔“ انہوں نے اٹھ کر پھونک ماری اور پھر میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“

اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔

''دادی جان!'' میری آواز بھرا گئی اور میری آنکھیں نم ہوگئیں۔

''اماں جو کچھ سمجھ رہی ہیں وہ غلط ہے دادی جان!''

''مجھے یقین ہے۔'' انہوں نے میرے ہاتھ تھپتھپائے۔

''تم دل پر مت لو۔''

''سب کو یقین ہے تم پر۔'' انہوں نے پھر مجھے دلاسا دیا اور تسبیح ایک طرف رکھی

''کھانا کھالو جا کر پھر میرے پاس آنا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

دو بج رہے تھے۔ دادی نے غالباً ظہر کی نماز پڑھی تھی ابھی۔

''یہ سحرش کون ہے بیٹا؟'' انہوں نے بے حد رسان سے پوچھا۔

میں گھبرا گئی۔

''کون سحرش؟''

''وہی جس سے ذیشان شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''آپ۔۔۔آپ کو کس نے بتایا''

''تم نے ہی تو کہا تھا۔''

''اف!'' میں نے آنکھیں موندلیں۔ یہ میں نے کیا کر دیا تھا۔ شاید میں اپنے آپ میں نہ تھی۔ بے اختیاری میں شاید میرے ہونٹوں سے نکلا تھا سحرش کا نام' اماں کی بے اعتباری مجھے مارے ڈال رہی تھی۔

''کیا توقیر کی بیٹی؟'' دادی جان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

اب کچھ چھپانا بے کار تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور آنسو میرے رخساروں پر پھسل آئے۔

''ذیشان کو کہاں ملی؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''وہ' وہ چار سال پہلے اچانک ہی روشن ملا تھا' اسے اور تب' تب سے وہ ادھر جا رہا ہے۔''

''کیسا ہے وہ؟ تم نے کبھی دیکھا؟ کبھی ملیں؟''

دادی جان کی آنکھوں میں چمک اور لہجے میں اشتیاق تھا۔ ''کیا وقی کی طرح ہی ہے۔''

''کچھ کچھ مشابہت ہے۔''

میں نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ میں سوچ رہی تھی دادی ابھی مجھے بیڈ سے اٹھا دیں گی' لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نہ انہوں نے مجھے ڈانٹا' نہ غصہ ہوئیں۔ بس نم آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہیں۔

''میرا وقی نامراد چلا گیا اس دنیا سے۔'' وہ جیسے اپنے آپ سے مخاطب تھیں۔

''اتنی تھوڑی زندگی تھی لیکن کوئی خوشی نہ دیکھی۔ تڑپتا ہی رہا' ارے میں کیسی ظالم ماں تھی۔ اس کی التجا نہ سنی' اسے دیکھا نہیں معافیاں ہی مانگتا رہا آخری دم تک۔''

آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر بہہ آئے۔

''چاچو آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔'' میں نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔

''ہاں وہ تو میری سہیلی تھا' میرا پیارا بیٹا۔ بیٹیوں کی طرح میری خدمت کرتا تھا۔ میرے آگے پیچھے پھرتا رہتا۔''

''اماں! پیاز کاٹ دوں۔''

''اماں! لائیے کپڑے استری کردوں۔''

وہ خواب میں آتا ہے تو ناراض ناراض اور خفا خفا سا ہاں میں نے جو ظلم کیا۔ اس کے بچوں کے ساتھ اور تمہارے دادا بھی کبھی خواب میں نظر آئیں تو منہ پھیر لیتے ہیں۔''

میں حیران سی دادی کی باتیں سن رہی تھی اور ان کے آنسوؤں کو دیکھ رہی تھی۔ جوان کے جھریوں بھرے رخساروں پر پھسل پھسل کر نیچے گر رہے تھے۔

''مشی! تو لے آنا سحرش کو' روشن کو اور عنبر کو' میں معافی مانگ لوں گی ان سے۔''

''نہیں۔'' میں نے یکدم دادی کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ میرے اعصاب ابھی تک میرے قابو میں نہ تھے۔ شاید میں ابھی تک صحیح طرح سے سوچ نہیں پا رہی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

''آپ انہیں نقصان پہنچائیں گی۔ آپ کا انہوں نے تو کچھ نہیں بگاڑا قصور تو ذیشان کا ہے' لیکن ذیشان بھی سحرش سے شادی تو نہیں کر رہا اس نے وعدہ کیا تھا روشن سے' عنبر

چچی سے کہ وہ چاچو کی طرح نہیں کرے گا۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھائے گا۔ پھر بھی آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں آپ کیا کریں گی ان کے ساتھ میں ہرگز نہیں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں دہشت زدہ سی ہوگئی تھی۔

''مشعال بیٹی! کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ میں تو بیچ جانے کب سے تڑپ رہی ہوں ان کے لیے۔ اپنے وقی کے بچوں کے لیے انہیں سینے سے لگانے کو۔ اس روز سے جب سحرش آئی تھی مجھ سے ملنے اور اس نے کہا تھا۔ پھپھو! میں تو بہت خوش ہوں۔ آپ بھول جائیں سب خدا نے میرے مقدر میں خوشیاں لکھی تھیں ورنہ میں آج سہاگن کے بجائے بیوہ ہوتی۔ ہاں اسی روز میں نے وقی کو خواب میں دیکھا تھا۔ ناراض ناراض اور روٹھا روٹھا سا۔''

اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے دادی جان! آپ روئیں نہیں' میں آپ کو لے جاؤں گی عنبر چچی اور سحرش سے ملوانے۔''

میں نے انہیں دلا سا دیا' تب ہی میران کمرے میں داخل ہوا شور مچاتا۔

''سنا ہے نصیب دشمناں طبیعت خراب ہے۔''

''ارے بیٹا تم کب آئے۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے۔'' دادی جان نے اسے پیار کیا۔

''پورے ایک ہفتے کے لیے کالج بند ہو گئے ہیں اور میں یہ پورا ایک ہفتہ سو کر گزاروں گا۔ یہ میڈیکل کی پڑھائی بھی بس نیند کی دشمن ہے۔''

وہ اعلان کرتا ہوا دادی جان کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور بازو پکڑ کر میری نبض چیک کی۔

''کیا پرابلم ہے تمہیں؟''

میں خاموش رہی۔ میرا ذہن سویا سویا سا تھا۔

''ڈاکٹر آیا تھا کیا اسے دیکھنے۔''

''ہاں آیا تو تھا۔'' دادی جان نے بتایا۔ اس نے ٹیبل سے ڈاکٹر کا لکھا نسخہ اٹھایا۔ دیکھا۔

''سو جاؤ' سکون تمہارے لیے ضروری ہے۔''

میری آنکھیں خود ہی بند ہو رہی تھیں اور ذہن میں بار بار ایک ہی بات آ رہی تھی۔ کیا میران نئی صورت حال کو قبول کر لے گا۔ کیا اسے سب معلوم ہو چکا ہے۔ اور کیا اس نے

خیال ہے کہ ہیں۔

''ڈاکٹر نے جو انجکشن دیا تھا اسے' اس کے مطابق تو اسے شام تک سوئے رہنا چاہیے تھا۔'' اس نے دادی جان سے کہا۔

''غالباً ڈسٹرب ہو کر اٹھ گئی ہے۔''

''آئیں باہر چلتے ہیں۔''

اس نے دادی جان کا ہاتھ تھاما اور میری طرف دیکھا۔

''اور تم سو جاؤ مشی! اطمینان سے۔''

وہ دروازہ بند کرتا ہوا دادی جان کے ساتھ باہر چلا گیا میں نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

جب دوبارہ میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا پھیل چکا تھا اور باہر ٹی وی لاؤنج میں ہنگامہ مچا تھا۔ آوازیں اندر تک آ رہی تھیں۔ میں بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ میران اور ذیشان کے قہقہوں کی آوازیں باہر تک آ رہی تھیں۔ بڑے دنوں بعد یوں سب ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔ مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ میں پہلے کچن کی طرف ہوئی وسو آلو کاٹ رہا تھا۔

''وسو! مجھے کچھ کھانے کو دو۔''

وسو کا نام پتا نہیں کیا تھا' لیکن بچپن سے ہی ہم سب اسے وسو کہہ کر بلاتے تھے۔ ہر قسم کے کھانے پکانے میں ماہر تھا۔ گو اماں تائی اور چچی بھی اس کے ساتھ کچن میں مصروف رہتی تھیں' لیکن اگر کبھی مہمان آ جاتے تو وہ اکیلے ہی پکا لیتا تھا۔ اس روز وہ بہت خوش ہوتا۔ کیونکہ اسے کچن کی بادشاہت مل جاتی تھی۔ آج بھی وہ گنگناتے ہوئے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔

''کیا بات ہے وسو! آج لگتا ہے بادشاہت مل گئی کچن کی۔''

''جی' جی وہ بیگم صاحبہ آپا جی اور چھوٹی دلہن سب کہیں گئے ہیں۔''

میری نظر ٹرالی پر پڑی۔ جس میں دہی بھلے' سموسے' رول' پکوڑے وغیرہ پڑے تھے۔ بچے کھچے۔

''کیا کوئی آیا تھا؟'' میں نے ٹرالی میں سے پکوڑا اٹھا کر کھایا۔

اس وقت میں بہت پرسکون تھی اور میرے ذہن میں گزری صبح کی کوئی بات نہ تھی

''ہاں جی وہ مہمان آئے ہیں' ابھی ادھر ہی ٹی وی لاؤنج میں۔''

''یعنی جو بھی مہمان تھا کوئی اپنا قریبی تھا۔ ورنہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا شاید ماریہ کے کزن وغیرہ ہوں۔ میں نے سوچا اور کھڑے کھڑے رول اور کچھ دوسری چیزیں پلیٹ میں رکھ کر کھانے لگی۔

''ارے سامان ابھی تک سنبھالا کیوں نہیں۔''

میں نے وسوسے پوچھا۔

''یہ کالو کا کام ہے نا' لیکن وہ تو ٹرالی رکھ کر پتا نہیں کدھر غائب ہو گئی ہے۔ آپ اس کو سمجھاتے ہی نہیں ہو جی' سب نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔''

''تو تم سنبھال دیتے نا۔'' کالو بھی آ گئی تھی۔

''دیکھ نہیں رہیں میں کلنگ کر رہا ہوں۔'' آج وہ واقعی بادشاہ تھا۔

میں مسکرائی اور کالو کو چائے بنانے کا کہہ کر کچن سے باہر نکل آئی۔

پتا نہیں اماں اور تائی وغیرہ اس وقت کہاں گئی ہیں۔ آٹھ بجنے والے تھے۔ دادی کا کمرہ ذرا دوسری طرف تھا۔ چچی جان دائیں پورشن میں ٹی وی لاؤنج سے ذرا فاصلے پر۔

میں نے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا' اور پھر جیسے وہاں ہی ٹھٹھک گئی۔ بالکل سامنے روشن اور سحرش بیٹھے تھے کھلتے چہروں کے ساتھ اور مجھے سب یاد آ گیا اور دادی کی گفتگو بھی تو کیا دادی انہیں لے آئی ہیں عنبر چچی۔

''ماریہ! ذرا مشی کے بازو پر چٹکی بھرو زور سے۔''

اسے پتا چل سکے کہ یہ خواب نہیں دیکھ رہی۔''

میران نے اونچی آواز میں کہا تو میں چونکی اور میری نظریں روشن پر پڑیں جو چمکتی نظروں سے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا مشی!'' ذیشان اٹھ کر میرے پاس چلا آیا۔

''جانے تم نے دادی پر کیا جادو کیا کہ وہ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئیں کہ ابھی مجھے لے چلو' وقی کے بچوں کے پاس۔ تھکا ہارا آفس سے آیا تھا۔ تپتی دوپہر میں دادی کو لے کر گیا عنبر چچی کی طرف اور پھر وہاں معافی تلافی' رونا دھونا' اف کیا فلمی سچویشن تھی۔''

وہ ہمیشہ کی طرح چہک رہا تھا۔

''پھر دادی نے فون کھڑکایا' ابا اور تایا اماں اور چچی کو۔ اور مجھے حکم ملا کہ فوراً جا کر اماں اور چچی صاحبان کو لے آؤں تو جناب پھر ان ہی قدموں پر واپسی ہوئی تینوں خواتین کو لا کر

وہاں لے گیا اور جناب دادی جان نے جھولی پھیلا دی۔ کہ میرے ہیروں جیسے پوتے کو اپنی شہزادی دان کر دو اور عنبر چچی نے کہا ایک شرط پر کہ بدلے میں میرے مجازی خدا کی آنکھوں جیسی آنکھیں رکھنے والی پری مجھے دے دو اور اب ہم ٹھہرے شریف اور حیادار بچے' ظاہر ہے جب موضوع ہماری شادی ہو تو ہمارا وہاں ٹھہرنا کچھ مناسب نہ تھا سو چچی اور دادی کی اجازت سے ہم روشن چراغ اور سحرش توقیر کو لے آئے یہاں اور ادھر ابا اور چچا صاحبان کو روانہ کیا من آباد۔''

ذیشان نے پوری تفصیل بتائی۔ میں نے سنی بھی لیکن میرا ذہن ماؤف سا تھا کل سے لے کر اب تک واقعات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے تھے کہ ذہن کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں یوں ہی ہونقوں کی طرح کھڑی تھی تب ہی ماریہ نے ذیشان کی توجہ میران اور فروا کی طرف دلوائی۔

''دیکھو تو یہ دونوں آپس میں کیا کھسر پھسر کر رہے ہیں۔''

''ایک تو تمہاری نظر بہت تیز ہے چیل کی سہیلی۔'' میران نے اسے جھڑکا۔

''میں فروا سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں اتنا ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ تمہیں ڈاکٹر پسند تھے تو ایسے ہی کہہ دیتیں دل و جان سے حاضر ہو جاتا۔ خوامخواہ بے چاری مشی پر الزام دھرا مجھے تو یوں بھی سبز مرچ بہت پسند ہے۔''

وہ نچلے لب کا کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔

میں نے فروا کی طرف دیکھا' اس کی گلابی رنگت دمک رہی تھی۔ بہاروں کے سارے رنگ تھے وہاں اور آنکھوں میں ہزاروں کرمک شب لودے رہے تھے۔ اتنی خوبصورت وہ اس سے پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ شاید وہ ہمیشہ سے ہی میری اور ذیشان کی بے تکلفی اور دوستی سے مشکوک رہتی تھی۔ میں نے سوچا اور یکایک مجھے لگا جیسے میں بہت تھک گئی ہوں۔ بے تحاشا تھکن کے احساس سے مجھے اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ میری ٹانگوں میں واضح لرزش تھی۔

ذیشان نے مجھے سنبھالا۔

''چیئر اپ مشی! سب ٹھیک ہے۔''

اس نے ہولے سے میرا ہاتھ تھپتھپایا' اور سہارا دے کر بٹھا دیا۔ میں [illegible] کی مانند بیٹھ گئی۔

''اس پانچ فٹ چھ انچ قد کے ساتھ اتنا کمزور دل 'مشی ! کچھ جچتا نہیں۔'' انسر نے تبصرہ کیا۔

''میں تو تمہیں بہت بہادر سمجھتا تھا۔''

''سمجھنے کی کیا بات ہے 'مشی ہے ہی بہادر۔''

ذیشان نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے حوصلہ دیا اور پھر اپنا روشن چراغ ساتھ ہو عمر بھر تو کیا ڈر ہے نا مشی۔''

وہ مسکرایا۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

روشن چراغ رکھنا۔

وہ ہولے سے گنگنایا۔

دل کو فراغ رکھنا۔

دکھ نہ کسی کو دینا

سحرش اور روشن نے بھی اپنی آواز اس کی آواز میں ملائی۔ وہ بلند آواز میں گا رہے تھے۔ میران 'فروا' ماریہ' انسر اور ثوبان نے تالی بجا کر ان کا ساتھ دیا۔

روشن چراغ رکھنا' میں ہولے سے گنگنائی بہت مدھم آواز میں۔

''دل کا دیا جلانا۔''

ذیشان نے بلند آواز میں کہا۔

''دل کا دیا جلانا'' میں نے اس کا ساتھ دیا۔ ہولے ہولے میری آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ مجھے لگا جیسے کہیں آس پاس توقیر چچا بھی ہوں اور انہوں نے بھی اپنی آواز ہمارے ساتھ شامل کر لی ہو۔ تالیوں کے ساتھ بچپن کی طرح۔

ہم سب بلند آواز میں گا رہے تھے۔

روشن چراغ رکھنا

روشن چراغ رکھنا

☆ ☆

انتہا پسند

EXTREMIST

''تحسین کی تو تم فکر ہی نہ کرو بوا! اس کی اور افشار کی بات تو بچپن سے طے ہے، باقی رہ گئیں فرحین اور ماہین، تو خاندان میں لڑکوں کا کال تو نہیں پڑ گیا، جو تم اتنا سوچتی ہو۔''

تائی اماں نے انگلی پر لگا ہوا کتھا چاٹتے ہوئے پاندان کا ڈھکن زور سے بند کیا۔

''نہیں آپا! بس یونہی سوچتی ہوں، ان بچیوں کے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے، پتا نہیں اس لئے۔''

''اے بیکار نہ سوچا کرو۔ لاکھوں میں ایک ہیں تمہاری لڑکیاں۔ نصیر تو کئی بار کہہ چکے ہیں کہ وہ اپنے عدیل کا رشتہ تمہارے ہاں ہی کریں گے اور وہ تمہاری بھاوج بھی کئی بار ذکر کر چکی ہیں۔''

''اچھا، مگر مجھ سے تو کبھی ذکر نہیں کیا انہوں نے''

''بھئی، جب وقت آئے گا' کر لیں گے''

تائی اماں نے پان کی پیک اگال دان میں تھوکی۔

''افشار بھی عرصہ سے کبھی ادھر نہیں آیا، نہ ہی بھائی صاحب نے کبھی خبر لی۔''

''لو بھئی، افشار اپنی تعلیم مکمل کر رہے تھے اور رہے بھائی صاحب، تو ابھی جب میں گئی تھی تو انہوں نے صاف صاف کہا تھا کہ وہ جلد ہی افشار کے سلسلے میں تمہارے پاس آنے والے ہیں''

''اچھا۔''

زبیدہ کے چہرے پر اطمینان اتر آیا اور باہر جالی سے لگی فرحین نے پیچھے ہٹتے ہوئے دو تین گہرے گہرے سانس لیے اور پھر تقریباً بھاگتی ہوئی تحسین کے کمرے میں آ گئی جہاں تحسین، ذہین اور اقصیٰ سر جوڑے بیٹھی کوئی پلان بنا رہی تھیں''

''خواتین۔۔۔۔خواتین۔۔۔!'' وہ سانس لینے کو رکی۔ ''ایک اہم خبر۔۔۔۔''

''کیا؟'' تینوں نے بیک وقت پوچھا۔

''خبر۔۔۔۔۔۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے تحسین کو دیکھا۔

''یہ کہ بڑے تایا کے ایک بیٹے ہوتے ہیں۔ افشار ملک۔!''

''ہاں، یہ نام تو سنا ہوا سا لگتا ہے۔''

تحسین نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ کیونکہ بڑے تایا کی فیملی کو انہوں نے بہت بچپن میں کہیں دیکھا تھا وہ کراچی میں رہتے تھے، بس ذکر سنا تھا کہ ایک بیٹا ہے دو بیٹیاں ہیں اور تایا ان کے ہوش میں دو تین بار ہی ساہیوال آئے تھے۔

''اور جناب ہم بنفس نفیس خود اپنی ان گناہگار آنکھوں سے انہیں دیکھ کر آئے ہیں۔ لہٰذا ہم آپ کی بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ یعنی افشار ملک وجود رکھتے ہیں۔''

اقصیٰ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

اقصیٰ ایک ماہ قبل ہی تائی اماں کے ساتھ کراچی گئی تھی۔ اسے سمندر دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ لہٰذا ضد کر کے وہ کراچی چلی گئی تھی۔ حالانکہ تائی اماں نے بہت چاہا تھا کہ وہ نہ جائے۔

''لو کراچی بھی کوئی جانے کی جگہ ہے۔ ہر لمحے خوف سر پر سوار رہے، کہ بس ابھی کہیں سے بم آیا، یا گولی آئی، سنا ہے وہاں ہر قدم پر کوئی نہ کوئی کلاشنکوف اٹھائے پھرتا ہے اور جیسے ہی کوئی بے چارا بدنصیب نظر پڑ گیا، وہیں ٹھاہ کر کے گرا ڈالا۔''

''نہیں اماں! اب ایسی بھی دھاندلی نہیں ہے۔''

اقصیٰ کو انہیں سمجھانے میں بڑے دن لگے تھے۔

''بس کبھی کبھی ہنگامے ہو جاتے ہیں۔ شر پسند تو ہر جگہ ہوتے ہیں یہاں ساہیوال میں بھی ملک دشمن تو ہوں گے''۔

تائی اماں اپنی اکلوتی بیٹی کی بات رد نہیں کر سکتی تھیں لیکن گاڑی میں قدم رکھتے ہوئے بھی کہہ رہی تھیں۔

''اب بھی سوچ لے اقصیٰ! میری مان تو لاہور چلے چلتے ہیں، تیری پھپھو کے ہاں۔''

''ہزار بار کا دیکھا ہوا۔''

''اسلام آباد تیرے ماموں کے ہاں چلتے ہیں ایسا صاف ستھرا خوبصورت شہر۔''

''پر اماں! وہاں سمندر تو نہیں ہے۔''

اور بے چاری تائی اماں اگلے پچھلے سارے گناہ بخشوا کر ٹرین پر سوار ہوئیں۔

سو اقصیٰ کی تائید کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ واقعی بڑے تایا کے ایک بیٹے محترم افشار ملک ہیں۔

''تو پھر۔؟''

ماہین نے سر اٹھا کر فرحین کی طرف دیکھا۔

''افشار بھائی کو کیا ہوا؟''

(اس کی عادت تھی کہ وہ ہر ایک کے ساتھ فوراً بھائی کا اضافہ کر لیتی تھی۔)

''ان کو۔۔۔۔۔'' فرحین نے پھر شرارت سے تحسین کی طرف دیکھا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم تینوں چپکے چپکے سر جوڑے کیا سازش کر رہی تھیں۔ پھر بتاؤں گی۔''

''نہ بتاؤ ہمیں کوئی شوق نہیں ہے۔''

ماہین سر جھٹک کر رسالے کی ورق گردانی کرنے لگی۔

''بڑی بمباسٹک خبر ہے جناب، زبردست۔''

''یار! بتا ہی دو۔ خوامخواہ کا سسپنس مت پیدا کرو۔''

تحسین نے بے زاری سے کہا تو اس نے جھٹ ہتھیار پھینک دیے۔

''خبر یہ ہے کہ ہماری پیاری تحسین آپی کی اور افشار ملک صاحب کی نسبت بچپن سے طے ہے اور مزید پیش قدمی کی غرض سے بڑے تایا بہت جلد تشریف لانے والے ہیں۔''

''اوہ نو......!'' اقصیٰ کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹنے کو تھیں۔

''اگر یہ سچ ہے تو مجھے تم سے ہمدردی ہے تحسین!'' کچھ دیر بعد اقصیٰ کے حواس بحال ہوئے تو اس نے تحسین سے کہا۔

تحسین کا رنگ جو ذرا دیر کو گلابی ہوا تھا، لمحہ بھر کے لیے زرد پڑ گیا۔

''کیوں کیا وہ بہت خوفناک ہیں۔ آئی مین بہت بدصورت ہیں؟''

''نہیں......'' اقصیٰ نے اطمینان سے کہا۔ ''بلکہ یوسف ثانی ہیں۔''

''یعنی بہت خوبصورت ہیں؟''

فرحین نے اشتیاق سے پوچھا۔

''ہاں۔''

''پھر واقعی تحسین کے ساتھ ہمدردی کرنی چاہیے۔ خوبصورت شوہروں کی بیویاں قابل رحم ہوتی ہیں۔''

ماہین نے رسالہ بیڈ پر اچھال دیا اور شرارت سے تحسین کو دیکھنے لگی۔

''وہ کیوں ماہی؟''

فرحین نے پوچھا۔

''قابل رحم نہیں، قابل رشک ہونا چاہیے انہیں تو......''

''بھئی، قابل رحم اس لیے کہ خوبصورت مردوں کو لڑکیاں ہر وقت گھیرے رکھتی ہیں اور وہ بھی راجہ اندر بنے رہتے ہیں اور بیوی کو یہ سنا سنا کر جلاتے رہتے ہیں کہ فلاں لڑکی......اور فلاں لڑکی۔''

''مگر ماہی کیا شادی شدہ مردوں کو بھی لڑکیاں گھیرے رکھتی ہیں۔''

''تم ابھی بچی ہو بی بی' ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں۔'' فرحین نے حیرت سے پوچھا۔

''اور تم تو جیسے اماں حوا ہو۔''

فرحین بچی کہنے پر بہت چڑتی تھی۔

''تم سے بڑی ہوں۔''

''کتنی؟'' فرحین نے پوچھا۔ ''صرف دو سال نا۔ تو دو سال کی بڑائی، چھوٹائی کچھ نہیں ہوتی۔ مجھے تم سے زیادہ پتا ہے۔''

''کیا پتا ہے؟'' ماہین مسکرائی۔

''یہ کہ لڑکیاں۔'' اس نے تیزی سے پلکیں جھپکیں۔ ''کہ لڑکیاں، مرد خوبصورت نہ بھی ہوں تب بھی ان کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ ٹرینڈ بدل گیا ہے زمانے کا۔ پہلے لڑکے لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ اب لڑکیاں لڑکوں کے پیچھے بھاگتی ہیں۔'' اس نے فخر سے ماہین اور اقصیٰ کی طرف دیکھا۔

''اچھا......!'' ماہین نے اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں میری ایک دوست ہے ناپنکی۔ وہ اپنی گاڑی میں ایک لڑکے کا تعاقب کرتی ہے روز۔ اور لڑکا بھی شکل وصورت کا ایویں ہی ہے، بس ایک مل اونر کا بیٹا ہے۔''

''فرحی! کتنی دفعہ منع کیا ہے تمہیں کہ ان پنکی ٹنکی قسم کی لڑکیوں سے مت دوستی رکھا کرو تم۔''

تحسین کو فوراً اپنے بڑے پن کا خیال آ گیا۔

''وہ میری کوئی پکی والی دوست تھوڑی ہی ہے بس کلاس میں پڑھتی ہے اور اس نے تو خود ساری کلاس کو بتا رکھا ہے کہ وہ اظہار کا تعاقب کرتی ہے۔ اظہار نام ہے نا اس لڑکے کا۔''

''اچھا، اچھا۔ فضول باتیں مت کرو۔''

تحسین نے اسے ٹوک دیا اور اقصیٰ کی طرف دیکھا۔

''اصل بات تو رہ ہی گئی کہ مجھے تحسین سے ہمدردی کیوں ہے؟'' اقصیٰ نے کہا۔

''جاہل ہیں۔ زیادہ پڑھے لکھے نہیں نا۔'' فرحین نے رائے دی۔

''نہیں ایم۔ ایس۔ سی کیا ہے، غالباً فزکس میں اور میرا خیال ہے کہ وہاں ہی کراچی میں کسی کالج میں جاب بھی کر رہے ہیں۔''

''پھر یار! کیا بات ہے۔ دل پھینک ہیں۔'' ماہین نے پوچھا۔

''تو۔ نیور کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔'' اقصیٰ نے تفصیل بتائی۔

''دراصل وہ انتہائی مذہبی قسم کے آدمی ہیں اور...... میں ٹھیک طرح سے وضاحت نہیں کرسکتی۔ عجیب سے ہیں۔ روبی اور زمی تو ان سے بہت ڈرتی ہیں

نماز پڑھا کرو۔ دوپٹا صحیح طرح سے اوڑھو، باہر مت جاؤ، زور زور سے مت ہنسو۔ خوشبو نہ لگاؤ، میک اپ نہ کرو۔ اونچی آواز میں بات نہ کرو۔ شوخی و شرارت کو تو وہ بالکل پسند نہیں کرتے۔ ٹخنوں سے اوپر شلوار باندھتے ہیں۔ داڑھی بھی رکھی ہوئی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ داڑھی ان پر سجتی بہت ہے۔''

''مگر نماز تو ہم بھی پڑھتے ہیں اور تحسین آپی نے تو شاید کبھی کوئی نماز قضا کی ہی نہیں۔''

''ہاں، لیکن وہ ...... میں نے کہا ناں۔ میں وضاحت نہیں کرسکتی، لیکن وہ EXTREMIST (انتہا پسند) ہیں۔ پتا ہے ربی، زمی تو ہر وقت کہتی رہتی ہیں۔''

اس نے سر اٹھا کر تحسین کی طرف دیکھا۔

''سچی تحسین! تمہارا گزارا کیسے ہوگا۔ تمہارا مزاج تو بالکل اور طرح کا ہے۔ ہر وقت ہنسنا ہنسانا، خوش رہنا اور وہ، توبہ ایک ماہ میں جو ایک دن بھی میں نے انہیں ہنستے ہوئے دیکھا ہو۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اماں سے کہہ دوں گی کہ ہم نہیں کرتے تحسین آپی کی شادی افشار ملک صاحب سے۔''

فرحین نے فیصلہ سنایا۔

''جیسے یہ بڑا آسان ہوگا نا۔ بچپن کی نسبت طے ہے۔'' ماہین نے جتایا۔

''اور پھر اماں بڑے تایا کی بات تو کسی صورت ٹال ہی نہیں سکتیں۔''

''تم بھی کچھ کہو تحسین۔'' اقصیٰ نے کہا۔

''میں کیا کہوں، جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''یہ تمہارے کٹے ہوئے بال۔ یہ نیل پالش سے رنگے ہوئے لمبے لمبے ناخن۔ یہ

لیٹسٹ فیشن کا لباس۔ یہاں سے ہضم نہیں ہوگا بی بی!'' اقصیٰ نے اس کی سمت اشارا کیا۔

''نہ ہو ہضم، گھر بیٹھیں۔'' تحسین نے اطمینان سے کہا۔

اس کے اندر بلا کی خود اعتمادی تھی۔

''میں خود بڑے تایا سے کہہ دوں گی کہ میرے اور ان کے صاحبزادے کے مزاج میں چونکہ بہت فرق ہے۔ لہٰذا اس بچپن کی نسبت کو ختم ہی کردیں تو بہتر ہے، اور بڑے تایا اپنے صاحبزادے کی طرح EXTREMIST (انتہا پسند) ہرگز نہیں ہیں۔ بہت لچک ہے ان میں۔''

''تو تم تایا جان سے یہ کہہ لوگی تحسین!'' ماہین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''شیور ......!'' تحسین نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''بعد میں ساری زندگی رونے سے بہتر ہے کہ پہلے ہی فیصلے پر نظر ثانی کرلی جائے اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔''

تحسین، فرحین اور ماہین دونوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کے نقوش میں عجیب کی طرح کی جاذبیت تھی۔ لمبا قد، نازک سا جسم، بڑی بڑی دلکش آنکھیں، گلابی رنگت، اس پر باتیں کرنے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ وہ بہت ویل ڈریسڈ تھی لیکن اس نے فضول فیشن کبھی نہیں کیے تھے۔ اس میں بلا کی خود اعتمادی تھی۔ اگرچہ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا لیکن معاشی پرابلم کوئی نہیں تھی۔ چھوٹے تایا ہر ماہ معقول رقم خرچ کے لیے دے دیتے تھے۔ بزنس میں باقاعدہ ان کا حصہ تھا۔ وہ لوگ چھوٹے تایا کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے تھے جبکہ بڑے تایا اور چچا کی فیملی کراچی میں تھی۔ تحسین نے بھی کچھ ہی دن پہلے یونیورسٹی میں ایڈمشن لیا تھا پولیٹکل سائنس میں۔

تحسین سے چھوٹی ماہین تھرڈ ایئر میں تھی۔ جب کہ فرحین فرسٹ ایئر میں۔

چھوٹے تایا کی ایک ہی بیٹی تھی اقصیٰ، جو تحسین کے ساتھ ہی پڑھتی تھی۔ بلکہ تحسین نے اقصیٰ کے اصرار پر ہی پولیٹکل سائنس میں ایڈمشن لیا تھا اور دونوں لاہور ہوسٹل میں رہتی تھیں، آج کل چھٹیاں تھیں۔

''کیا افشار ملک کے متعلق سوچا جا رہا ہے۔'' اقصیٰ نے جھک کر تحسین سے پوچھا۔

''تو۔۔۔۔۔۔۔''

''کیا تم پریشان ہو؟'' ماہین نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔۔'' تحسین نے لاپروائی سے کہا۔

''چلو اٹھو اب!'' اس نے مڑ کر ماہین کا بازو پکڑا۔

''حسب وعدہ اب تم اجازت لو اماں سے۔''

''کہاں جانا ہے؟'' فرحین نے پوچھا۔

''افشاں کی طرف۔'' اقصیٰ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تو سر جوڑ کر یہ میٹنگ ہو رہی تھی۔'' فرحین نے سر ہلایا۔

''میں بھی چلوں۔؟''

''تمہاری عمر کی وہاں کوئی بچی نہیں ہے۔'' ماہین نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور تمہاری عمر کی وہاں کون ہے؟ افشاں آپی تو تحسین آپی کی سہیلی ہیں۔''

''میری بھی دوستی ہے ان سے۔ اور یوں بھی آج کل ان کی کزن آئی ہوئی ہیں، میری ہم عمر ہے۔'' ماہین اسے چڑا رہی تھی۔

''تو میں گھر پڑی سڑتی رہوں۔ ٹھیک ہے۔ میں اماں کا برقع پہن کر چلی جاؤں گی اور افشاں آپی کی امی سے گپ شپ لگاؤں گی۔''

اقصیٰ اور تحسین بے اختیار ہنس پڑیں۔

''یار! کیوں تنگ کرتی ہو اسے؟'' تحسین نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

''پہلے تیرے بغیر کبھی ہم کہیں گئے ہیں، جواب جائیں گے۔''

''تھینک یو آپی۔!'' اس نے تحسین کے ہاتھ پر پیار کیا، اور تیار ہونے کے لیے بھاگ گئی۔

تحسین، ماہین اور اقصیٰ ہنستی ہوئی اس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگیں۔

اقصیٰ نے افشار ملک کا نقشہ کچھ اس قدر بھیانک کھینچا تھا (اور وقتاً فوقتاً وہ اس میں اضافہ کرتی رہتی تھی) کہ ایک لمحہ کے لیے بھی تحسین نے اس کے متعلق نہیں سوچا تھا اور دل ہی دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ جب بھی اماں نے اس سلسلے میں اس سے بات کی، وہ صاف انکار کر دے گی کہ اسے افشار ملک ایسے شخص سے ہرگز شادی نہیں کرنا۔ مگر ابھی نہ تو

بڑے تایا ساہیوال آئے تھے اور نہ ہی اماں نے اس سلسلے میں اس سے بات کی تھی کہ لاہور میں پھپھو کے بڑے صاحبزادے سرفراز کی شادی کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔

اور وہ ہوسٹل سے پھپھو کے گھر منتقل ہو گئیں۔ ساہیوال سے بھی سب آ گئے تھے فرحین اور ماہین خوب ہنگامہ بپا کیے رکھتی تھیں۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر ڈھولک سنبھال لی جاتی اور خوب گلے پھاڑ پھاڑ کر گیت گائے جاتے۔ چچا کی فیملی بھی کراچی سے آ گئی تھی۔ ان کی دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ بڑے تایا نے البتہ بارات سے دو دن پہلے آنے کا وعدہ کیا تھا اور ابھی بارات میں پورا ایک ہفتہ باقی تھا۔ تحسین، اقصیٰ اور ماہین پورے چھ گھنٹے تک بازار کی خاک چھان کر میچنگ جوتے اور جیولری خرید کر واپس آئیں تو ایک ہنگامہ مچا تھا۔ پھپھو کے دیور اور نندیں وغیرہ ملتان سے پہنچے تھے اور خوب شور ہو رہا تھا۔ ان کی لڑکیاں لڑکے سب ہی شوخ و شریر تھے، قہقہے، ہنسی، شور۔

''آہا ہا! اب مزا آئے گا۔ زینب وغیرہ آ گئی ہوں گی۔''

اقصیٰ نے پیکٹ تحسین کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''تم جاؤ۔ اوپر یہ رکھ آؤ۔ تحسین، میں اور ماہی ذرا زینب وغیرہ سے مل آئیں۔''

تحسین سر جھکائے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہی تھی کہ اوپر سے آتے ہوئے افشار ملک سے ٹکرا گئی۔ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے پیکٹ نیچے گر گئے۔

''سوری۔''

آنے والے کے لبوں سے بے اختیار نکلا اور وہ جھک کر پیکٹ اٹھانے لگا۔ تحسین وہیں کھڑی حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ شخص کون ہے۔؟

یقیناً پھپھو کے کسی دیور یا نند کا بیٹا۔ جبھی تو اوپر سے آ رہا ہے۔ یقیناً گھر کا ہی فرد ہے پھپھو کے اکثر سسرالی عزیزوں کو وہ پہچانتی تھی، مگر یہ۔۔۔۔۔۔ شاید اس سے پہلے اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

''سوری مس!'' پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے پھر معذرت کی۔

''میں اپنے دھیان میں تھا اس لیے آپ کو نہ دیکھ سکا۔''

''جی۔۔۔۔۔۔ سوری، میں بھی اپنے دھیان میں تھی۔''

تحسین نے اس کے ہاتھ سے پیکٹ لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔لیکن اس
کی نگاہیں زمین کی طرف تھیں۔

روشن کشادہ پیشانی

بڑی بڑی دل فریب آنکھیں

سفید رنگ

بھرے بھرے ہونٹ

سیاہ گھنے بال اور چھوٹی سی داڑھی۔

اس اجنبی کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔وہ گڑبڑا کر ایک طرف ہوگئی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔

آخری سیڑھی پر رک کر تحسین نے مڑ کر نیچے دیکھا کہ شاید وہ بھی وہاں مڑ کر پیچھے دیکھ رہا ہو لیکن وہ تو سیدھا کوریڈور میں مڑتا چلا گیا تھا۔

''اف کس قدر ڈسٹرب کردینے والی پرسنیلٹی ہے،اس بندے کی۔''

اپنے کمرے میں آکر پیکٹ پلنگ پر پھینکتے ہوئے وہ بستر پر گر گئی۔

''افوہ! کس قدر تھکن ہوگئی ہے۔ایک تو تیز گرمی تھی،اس پر اتنا چلنا پڑا۔ایک تو یہ بیگم ماہین صاحبہ کو کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔اتنی بھاگ دوڑ کے باوجود،اس کی پسند کے جوتے نہیں ملے۔۔۔۔۔ابھی نہ جانے کل کتنا خوار کرے گی۔''

نرم نرم تکیے پر سر رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔لمحہ بھر کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے اس اجنبی کا سراپا لہرایا۔

جانے کون تھا۔

اس نے بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ سوچا۔

بہر حال جو بھی ہو مجھے کیا،خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ذرا ستالوں تو پھر نیچے جاتی ہوں،لیکن وہ جو ذرا ستانے کیلئے لیٹی تھی۔شام گئے تک سوتی رہی۔

اقصیٰ اور فرحین اسے دو تین بار دیکھ گئی تھیں لیکن وہ گہری نیند سو رہی تھی۔پھپھو نے اسے جگانے سے منع کر دیا تھا۔

''سونے دو اسے۔نازک سی تو ہے۔اتنے دنوں سے بے سکون ہو رہی ہے،کہیں

طبیعت ہی خراب نہ ہو جائے۔''

حالانکہ ماہین کے دل میں کھد بد ہو رہی تھی کہ کب تحسین جاگے اور کب وہ اسے افشار ملک کی آمد کا بتائے اور فرحین نے تو جب سے افشار ملک کو دیکھا تھا،کتنی بار اقصیٰ کے کان میں سرگوشی کر چکی تھی۔

''اللہ! اقصیٰ آپی! یہ افشار بھائی کی تو بڑی زبردست پرسنیلٹی ہے،آپ یوں ہی ڈرا رہی تھیں۔''

''بی بی! ظاہر پر نہ جاؤ۔''

اقصیٰ نے بڑے بوڑھوں کی طرح اسے سمجھایا۔''اصل جوہر تو ابھی کھلیں گے۔''

''نہیں بھئی،مجھے تو افشار بھائی بہت اچھے لگے ہیں اور میں آپی سے کہہ دوں گی کہ وہ ہرگز ہرگز شادی سے انکار نہ کریں۔''

فرحین نے اقصیٰ کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ مسکرا دی۔

''ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی مائی ڈیر کزن۔''مگر فرحین نے اس کی بات سنی ہی نہیں اور ایک بار پھر تحسین کو دیکھنے کے لئے اوپر جا پہنچی وہ ابھی تک سو رہی تھی۔

''اوہو تحسین آپی!''

اس نے اس کا بازو پکڑ کر ہلایا۔

''کیا گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہی ہیں؟اب اٹھ بھی جائیں۔''

''اوں ہوں۔سونے بھی دو۔''

تحسین نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

''سونے دو،پتا ہے۔کیا وقت ہونے والا ہے۔''فرحین نے اسے پھر جھنجھوڑ ڈالا۔

''پتا ہے،مغرب ہونے والی ہے اور اماں جان کہتی ہیں کہ مغرب کے وقت سونا نہیں چاہئے۔''

''اوہ نہیں......''

تحسین ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور سامنے کلاک پر نظر ڈالی۔

''عصر کی نماز بھی چلی گئی۔تم نے جگا دیا ہوتا۔''

''پھپھو صاحبہ کا حکم تھا کہ ان کی ساری چیزیں وہیں بھر کر رکھ دیا جائے۔ ورنہ میں نے تو دس چکر لگائے ہیں آپ کے کمرے کے۔''

تحسین مسکرا دی۔

''لگتا ہے تمہارے پاس کوئی اہم خبر ہے۔''

تحسین نے اس کی بے تابی سے اندازہ لگایا۔

''ہوں۔۔۔۔۔'' فرحین اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''تو اب بتا بھی دو۔۔۔۔۔۔''

فرحین نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''افشار بھائی سے ملی ہوں۔ رئیلی آپی! اتنی شاندار پرسنیلٹی ہے نا کہ کیا بتاؤں''۔

''ارے تایا ابا آ گئے۔''

تحسین کو حیرت ہوئی۔

''پھپھو تو کہہ رہی تھیں کہ وہ لوگ بارات سے دو دن پہلے ہی آ سکیں گے۔''

''تایا ابا وغیرہ نہیں آئے، صرف افشار بھائی آئے ہیں۔ اپنے کالج کے لڑکوں کے ساتھ آئے ہیں یہاں، تو ادھر چلے آئے۔ اب شادی بھگتا کر ہی جائیں گے اور سچ آپی! میں نے تو یونہی اقصیٰ آپی سے سن سن کر اتنا خوفناک خاکہ بنا رکھا تھا ان کا وہ تو ذرا بھی میرے تصور کے مطابق نہیں ہیں۔''

''اچھا۔!'' تحسین نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔

بہر حال یہ طے تھا کہ اگر افشار بالکل ایسے ہی ہیں' جیسے اقصیٰ نے بتایا تھا تو ان کے ساتھ زندگی بسر کرنا انتہائی مشکل امر تھا۔

مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر جب وہ نیچے آئی تو ماہین نے بھی سب سے پہلے اسے یہی خبر سنائی۔

''افشار بھائی آئے ہیں۔''

''[illegible] مل چکی ہے۔'' وہ مسکرائی۔

''[illegible]ت تو شاندار ہے۔'' ماہین نے [illegible]یا۔

''میرے خیال میں یہ بات اتنی اہمیت بتا چکی ہے۔'' تحسین نے افشار کے [illegible] میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لی اور زینب وغیرہ سے ملنے لگی۔ پھپھو کے سسرالی رشتہ دار سب ہی بڑی محبت کرنے والے تھے۔ تحسین کو ہمیشہ ہی ان سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر پھپھو سب کو سرفراز کی بری دکھانے لگیں۔ لڑکیوں نے ڈھولک سنبھال لی تھی۔

''رات کو گائیں گے بھئی، کھانے کے بعد۔'' اقصیٰ نے مشورہ دیا۔

''جی نہیں۔'' زینب نے صاف انکار کر دیا۔

''شادی والا گھر ہے۔ پتا تو چلے لوگوں کو۔ پتا ہے اتنی مشکل سے تو بوبی کی منتیں کر کے ڈھولک منگوائی ہے''۔

''میں تو افشار بھائی کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ وہ چلے جائیں تو پھر گائیں گے۔''

اقصیٰ نے وضاحت کی۔

''کیا افشار بھائی ادھر نہیں ٹھہریں گے؟'' ماہین نے پوچھا۔

''نہیں' پھپھو بتا رہی تھیں۔ جب تک ان کے اسٹوڈنٹس لاہور میں ہیں، تب تک وہ ان کے ساتھ ہی رہیں گے۔ ویسے چکر لگاتے رہیں گے۔'' اقصیٰ نے تفصیل بتائی۔

''افشار بھائی کب جائیں گے؟'' زینب کو ڈھولک بجانے کی جلدی تھی۔

''کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔''

''افوہ!'' زینب کا منہ بن گیا۔

''خوشی کا اظہار کرنے سے کسی مذہب میں منع نہیں کیا گیا۔

کچھ لوگوں نے خوامخواہ مذہب کو ہوا بنا رکھا ہے۔ ہمارا مذہب کسی سختی کی تلقین نہیں کرتا۔ اس میں تو بڑی گنجائش ہے۔ نرمی ہے اور پھر خوشی کے اظہار کے لیے تو کسی مذہب میں منع نہیں کیا گیا۔ آپ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تھے تو بچوں نے دف بجا کر اور گیت گا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ بس یہی ہے کہ خوشی کا یہ اظہار اعتدال اور تہذیب کے اندر ہو اور اس سے مذہب پر چوٹ نہ پڑتی ہو۔''

اقصیٰ نے اچھی ناصحی [illegible] ڈالی۔

''[illegible]''

سرفراز اور ہانی وغیرہ نے تالیاں بجائیں۔ جو نہ جانے کب اندر آ گئے تھے۔ اقصیٰ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ سرفراز کے بالکل ساتھ وہی کھڑا تھا۔ وہی صبح والا اجنبی جس سے سیڑھیوں پر ٹکر ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

''یہی افشار بھائی ہیں۔'' فرحین نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہ......!'' تحسین چونکی۔

واقعی اس کی شخصیت چونکا دینے والی تھی۔ فرحین اور اقصیٰ سچ ہی کہتی تھیں۔

''آؤ......آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔''

پھپھو نے محبت سے افشار کی طرف دیکھا۔

افشار ان کے پہلے بھتیجے تھے۔ سب سے بڑے بھائی کی بڑی اولاد، اور وہ انہیں بے حد چاہتی تھیں۔

''نہیں پھپھو جان! میں یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا تھا کہ میں رات کے کھانے تک نہیں رک سکوں گا۔''

''کیوں بیٹا! وہاں ہوسٹل میں اللہ جانے کیسا کھانا ملتا ہوگا۔ کھا کر چلے جانا۔ میں ابھی لگوا دیتی ہوں۔''

''نہیں پھپھو جان! ابھی تو چائے پی ہے، کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے، پھر وہاں لڑکوں کے ساتھ وعدہ کیا تھا میں نے رات گلشن اقبال جانے کا، وہ منتظر ہوں گے۔''

''اے تو تم خود ہی بتا رہے تھے کہ ایک اور استاد بھی ہیں۔ ان کے ساتھ چلے جائیں گے۔''

''نہیں پھپھو جان! ذمہ داری ہوتی ہے، صبح حاضر ہو جاؤں گا۔''

اس کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں اور اس کے لہجے میں بڑی نرمی اور حلیمی سی تھی تحسین سر اٹھائے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''بیٹا! یہ تحسین سے ملے تم، مہروز بھائی کی بیٹی ہے۔''

اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''چچی جان نہیں آئیں کیا؟''

''نہیں، تینوں بچیاں ہی آئی ہیں، فرحین اور ماہین سے تو تم مل چکے ہو۔''

''وہ بھی۔ شام چائے پر ملاقات ہوئی تھی۔''

''چچی جان ٹھیک تو تھیں۔ صحت کیسی تھی ان کی......؟''

اب کے اس نے براہِ راست تحسین سے پوچھا۔

''جی اچھی تھیں۔''

تحسین نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''اچھا پھپھو جان! خدا حافظ۔''

ایک اچٹتی سی نظر سب پر ڈال کر وہ چلا گیا۔ تو اقصیٰ نے تحسین کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

''اب واپس آ جائیں خاتون! اب وہ ایسے بھی یوسف نہیں ہیں۔''

''تم بھی بس ــــــــــ'' تحسین جھینپ گئی۔

''وہ تمہارے حسن جہاں سوز سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوئے۔''

اقصیٰ نے پھر اس کے کان میں سرگوشی کی۔ جو قریب بیٹھی ماہین نے سن لی۔

''متاثر تو تب ہوں جب وہ کسی کی طرف دیکھیں وہ تو کسی کی طرف دیکھتے ہی نہیں۔ نگاہ ہمیشہ نیچے ہی رہتی ہے۔ لگتا ہے انہیں جوتے بہت پسند ہیں۔''

ماہین نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

''یہ کیا کھسر پھسر شروع کر دی ہے تم نے۔ یہ آدابِ محفل کے سراسر خلاف ہے۔''

زینب نے انہیں ٹوکا اور ڈھولک تحسین سے لے لی۔

''اب تو تمہارے افشار بھائی گئے۔ اب تو ڈھولک بجائی جا سکتی ہے۔''

''ہاں کیوں نہیں۔''

''بڑا نیک بچہ ہے۔'' پھپھو اپنی نند کو بتانے لگیں۔

''ادھر ادھر کی خرافات سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔''

زینب نے گیت شروع کر دیا تھا لیکن تحسین کا سارا دھیان پھپھو کی طرف تھا جو افشار کی بے حد تعریف کر رہی تھیں جب کہ اقصیٰ نے جو کچھ بتایا تھا وہ اس کے قطعی برعکس تھا۔

اگلے چند دنوں میں کئی بار اس نے افشار کو دیکھا۔

بہت سنجیدہ اور خاموش طبع سا اپنے آپ میں گم سم اس نے شادی کے ہنگاموں میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی رہتا تھا۔ کھانے پر ہی ملاقات ہوتی تھی۔ یا پھر کبھی کبھار سرفراز اسے زبردستی لاتے تو وہ سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ ماہین اور فرحین نے اس سے فری ہونے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں شدید قسم کی ناکامی ہوئی۔

''یہ افشار بھائی تو انتہائی بور قسم کی چیز ہیں۔'' اپنے کپڑے استری کرتے ہوئے فرحین نے انکشاف کیا۔

''اور کیا۔۔۔۔۔۔'' ماہین نے بھی تائید کی۔

''خالی خولی پرسنیلٹی دیکھتے رہو بس۔''

''یہ تو پھپھو کا گھر ہے جناب۔''

اقصیٰ جو تحسین کے پاس اس کے بیڈ پر ہی کپڑے پھیلائے بیٹھی تھی، اس نے وہیں سے کہا۔

''ذرا گھر پر انہیں ملاحظہ کرتے تو ہوش اڑ جاتے۔ خون خشک کیے رکھتے ہیں سب کا۔''

''ہاں تحسین!'' وہ فرحین سے کہہ کر تحسین کی طرف مڑی۔

''یہ گرین اور پنک سوٹ ٹھیک رہے گا، کل کے فنکشن کے لیے۔ تم بھی یہی والا نکال لینا اب، ہے نا یونیورسٹی فنکشن پر ہم دونوں نے یہی پہنا تھا اور تم کس قدر پیاری لگ رہی تھیں۔''

''اچھا!'' تحسین پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی۔

''تم پریشان ہو یار؟'' اقصیٰ نے پوچھا۔

''نہیں تو۔۔۔۔۔۔''

''کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتاؤ۔ اگر تم تایا ابا سے کچھ نہیں کہہ سکتیں، تو میں کہہ دوں [illegible] پھپھو سے کہ تحسین اور افشار بھائی [illegible] مزاج اور سوچ میں بہت فرق ہے۔''

''نہیں، نہیں ایسی تو کوئی [illegible] نہیں ہے' اور مجھے تو افشار میں [illegible] برائی نظر نہیں [illegible] مذہبی ہونا کوئی قابل [illegible] نہیں ہے۔''

''[illegible]۔۔۔۔۔۔۔'' [illegible] نے آنکھیں پھاڑیں۔

''[illegible] تغیرات دیکھ رہی ہوں میں بی بی ان کی ظاہری شکل وصورت پر نہ جاؤ۔ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔ جو بھی فیصلہ کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ مذہبی ہونا بری بات نہیں ہے۔ لیکن وہ انتہائی کٹر قسم کے ہیں اور میرے خیال میں ان کے نظریات کچھ عجیب سے ہیں۔''

''لیواٹ۔ یار (چھوڑو) کوئی اور بات کرو۔ فی الحال ہمیں اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے خیال میں بال نہ سیٹ کروا آئیں۔''

تحسین نے اٹھ کر آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔

''دیکھو، کس قدر بے ڈھنگے ہو رہے ہیں۔''

''چلو۔ میں بھی کٹنگ کروالوں گی، پھر کہاں ٹائم ملے گا۔ آج سب لوگ آجائیں گے۔ کراچی سے بھی اور ساہیوال سے بھی اور میرے ابا اماں نے تو پھر مجھے ہلنے نہیں دینا۔''

''اکلوتے ہونے کا ایک یہ فائدہ بھی ہے۔'' ۔۔۔۔۔۔۔ تحسین ہنسی۔

''یار! ایسی بھی کیا محبت کہ آدمی ہل جل ہی نہ سکے۔ اب دیکھو اماں آئیں گی نا، تو جدھر جدھر جاؤں گی پیچھے پیچھے۔'' (وہ لاڈ میں ہوتی تو تائی اماں کو اماں کہہ کر بلاتی تھی)

''اقصیٰ چندا! دو گھڑی ماں کے پاس بھی بیٹھ جا۔۔۔۔۔۔''

اس نے تائی اماں کے لہجے کی نقل کی۔

''اور تائی اماں کی یہ محبت سسرال میں تمہیں یاد آئے گی۔ تب کوئی نہیں آگے پیچھے پھرے گا۔''

''میری سسرال بھی تو میری امی کا میکہ ہے جب دل چاہے گا آجایا کریں گی۔''

''آپی! ہم بھی ساتھ چلیں۔''

فرحین نے کپڑے لٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''چلو' واپسی پر بانو بازار کی چاٹ کھائیں گے۔'' اور وہ کارز والے بابا سے قلفہ بھی۔''

''چلو قلفہ بھی۔''

تحسین ہنس دی۔

بانو بازار سے چاٹ کھا کر وہ چاروں قلفہ کھا رہی تھیں۔ یہ قلفے والا ایک دکان کے باہر بیٹھتا تھا کوئی بیٹھنے کی جگہ تو تھی ہی نہیں [illegible] سب گاہک وہیں کھڑے ہو کر کھایا کرتے

تھے۔ فرحین ادھر ادھر سے گزرتے لوگوں پر ریمارکس پاس کر رہی تھی۔

''آپی دیکھیں اس کو، کس قدر موٹی خاتون ہے کوئی آپ سے پوچھے کہ خاتون آپ کو کیا تکلیف تھی جو آپ شاپنگ کرنے چل پڑیں اور ذرا محترمہ کے خاوند کو دیکھو بے چارا کیسے سر جھکائے ساتھ چل رہا ہے۔''

''ضروری نہیں خاوند ہو، بھائی بھی ہو سکتا ہے۔''

''ہرگز نہیں۔''

اقصیٰ نے منہ میں چمچ بھر کر قلفہ ڈالا۔

''شکل سے ہی مسکین لگتا ہے، اور ایسی مسکینی صرف شوہروں کی شکل پر ہی ہوتی ہے؟''

''اف!'' اقصیٰ نے جلدی سے رخ موڑا۔

''افشار بھائی!''

تحسین سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں افشار کی نظروں سے ٹکرائیں۔''

عین اسی لمحے افشار نے بھی ان کی طرف دیکھا۔ ایک ہاتھ میں قلفے کی پلیٹ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس نے گلے میں لٹکتے ہوئے دوپٹے کو سر پر لینے کی کوشش کی اور اس کا یہ عمل قطعی غیر اختیاری تھا۔

افشار کی نظروں میں بے زاری اور اکتاہٹ تھی اور نہ جانے کیا کیا کچھ۔۔۔ تحسین کی نظریں جھک گئیں۔ عجیب سی گھبراہٹ اس پر طاری ہو گئی تھی۔

خدا جانے افشار کیا سوچیں گے۔ افشار ان کے قریب سے گزر گئے۔

''افوہ!'' اقصیٰ نے قلفے کا پیالہ بنچ پر رکھ دیا۔

''افشار بھائی! نہ جانے گھر جا کر کیا حشر کریں۔''

''کیوں؟''

''انہیں لڑکیوں کا اس طرح بازار میں کھڑے ہو کر کھانا پینا بالکل پسند نہیں ہے، اور پھر ہم جس پوزیشن میں کھڑے ہیں۔ دوپٹے گلے میں ڈالے۔ وہ تو بہت ناراض ہوں گے۔''

''یار! تمہارا قلفہ پگھل رہا ہے۔'' ماہین نے کہا۔

''اب موڈ نہیں رہا۔'' تحسین نے بھی پلیٹ نیچے رکھ دی۔

''پتا ہے ایک بار وہاں کراچی میں ہم شاپنگ کرنے کے لئے گئے۔ ربی اور رفی بھی تھیں میرے ساتھ۔ وہاں راستے میں دہی بھلے والے کو دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ تمہیں پتا تو ہے۔ دہی بھلے میری کمزوری ہیں۔ رفی بے چاری تو بہت ڈر رہی تھی لیکن میں نے ضد کر کے انہیں بھی مجبور کر دیا۔ ہماری بدقسمتی کہ افشار بھائی نے وہاں سے گزرتے ہوئے ہمیں دیکھ لیا۔ کیا بتاؤں دونوں کو گھر آ کر کس قدر ڈانٹ پڑی۔''

''وہ دونوں ان کی بہنیں تھیں۔''

فرحین نے ٹشو سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''وہ انہیں ڈانٹ سکتے تھے۔ لیکن وہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔ دیکھ لینا۔''

اور واقعی افشار نے انہیں کچھ بھی نہ کہا۔ حالانکہ رات کے کھانے پر اقصیٰ بڑے ڈرتے ڈرتے گئی تھی لیکن افشار نے کوئی بات نہیں کی' وہ یوں بھی کم ہی بات کرتے تھے۔ کوئی بات ان سے پوچھی جاتی تو جواب دے دیتے ورنہ خاموش ہی رہتے۔

کراچی اور ساہیوال سے سب آ گئے تھے۔ ربی' رفی اگرچہ ایک طویل عرصہ بعد ملی تھیں لیکن بڑی محبت سے ملیں۔ تائی اماں اور تایا ابو ہمیشہ محبت سے ہی ملتے تھے۔ افشار سے چھوٹے دونوں بھائی افشار سے بالکل مختلف مزاج رکھتے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں سب گھل مل گئے تھے اور اب سب کے ساتھ مل کر تالیاں بجا بجا کر رات گئے تک گیت گاتے۔

''پتا نہیں، یہ افشار بھائی کس پر چلے گئے ہیں، حالانکہ ابرار اور اسرار بھی ان کے ہی بھائی ہیں لیکن مزاجاً مختلف۔''

فرحین نے تبصرہ کیا۔

''کاش، افشار بھائی بھی اسرار اور ابرار کی طرح ہوتے تو ہماری تحسین بی بی دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں سے ایک ہوتیں۔''

اقصیٰ نے فرحین کے ہاتھوں پر مہندی سے ڈیزائن بناتے ہوئے کہا۔

''تحسین آپی، اب بھی دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکیوں میں سے ایک ہوں گی انشاءاللہ۔'' فرحین نے دعا کی۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔ بہر حال سنا ہے تایا ابا امی جان سے بات کرنے والے

ہیں اور یہاں لاہور میں ہی افشار بھائی اور تحسین آپی کی منگنی اناؤنس کردی جائے گی۔ یوں بھی افشار بھائی فضول رسموں کو پسند نہیں کرتے۔''

ماہین جو ابھی ابھی کمرے میں آئی تھی۔اس نے اطلاع دی۔

''ریلی......''اقصیٰ نے کون نیچے رکھ دی۔

''تمہیں کس نے بتایا ہے؟''

''پھپھو جان بتا رہی تھیں اپنی نند کو۔''

''اوہ گاڈ......!''اقصیٰ نے گہری سانس لی۔

''تحسین تولیے سے بال جھٹکتے ہوئے باتھ روم سے باہر آئی۔

''خیریت ہے؟''

''خیریت ہی نہیں ہے جان! وہ ماہی بتا رہی ہے کہ تایا جان تمہارے اور افشار کے سلسلے میں چچی جان سے بات کرنے والے ہیں۔میرے خیال میں تم آج چچی جان سے بات کرلو۔''

''کیا بات......؟''تحسین نے پوچھا۔

''یہی کہ تمہارے اور افشار بھائی کے مزاج میں بہت فرق ہے۔''

''میرے خیال میں ہمارے بڑے ہمارے متعلق جو فیصلہ کرتے ہیں،بہتر ہی کرتے ہیں۔''تحسین نے سنجیدگی سے کہا۔

''یعنی۔۔۔۔۔یعنی تم افشار بھائی سے شادی کرلوگی۔۔۔۔۔؟''

تحسین خاموش ہی رہی۔اب وہ اسے کیا بتاتی کہ اس کے دل نے پہلے دن ہی افشار کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔اسے افسانے یا کہانیاں پڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔اس نے پہلی نظر کی محبت کے متعلق سن رکھا تھا اور اسے کبھی کبھی بڑی حیرت ہوتی تھی کہ بھلا کسی کو ایک نظر دیکھ کر کیسے دل میں محبت پیدا ہوسکتی ہے۔کتنی افسانوی سی بات ہے اور یہ افسانوی بات اس کے ساتھ ہوئی تھی۔وہ رات کو بستر پر لیٹتی تو خود بخود افشار کا تصور اس کے ذہن میں [illegible] آتا تھا۔باوجود اس کے کہ اس نے اپنے متعلق افشار کی رائے اتفاقی طور پر سن لی تھی۔[illegible] کل اچھی نہیں تھی لیکن پھر بھی اس [illegible] فیصلہ کیا تھا کہ اگر امی جان نے افشار کے متعلق اس [illegible] رائے پوچھی تو وہ انکار نہیں کرے گی۔

کل رات پھپھو جان نے [illegible] دیا تھا۔

''اوپر جارہی ہو تحسین [illegible] بھائی جان کے لیے دودھ لے جاؤ۔کھانا بھی انہوں نے نہیں کھایا۔''

اور دودھ لے کر جب وہ [illegible] کمرے کے پاس پہنچی اور اندر جانا چاہتی تھی کہ اندر سے تایا ابا کی آواز سن کر ٹھٹھک [illegible] گئی۔

''آخر برائی کیا ہے تحسین [illegible]؟''

''بابا جان! تحسین میں وہ خوبیاں نہیں ہیں، جو میں اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''یہ افشار کی آواز تھی۔

''وہ بہت ماڈرن لڑکی ہے۔چند دن پہلے وہ تینوں بہنیں اور اقصیٰ انار کلی میں کھڑی قلفہ کھا رہی تھیں۔دوپٹے گلے میں پڑے تھے اور انہیں کسی بات کا احساس نہیں تھا۔آتے جاتے لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔میری خواہش ہے کہ میری بیوی ایک مکمل مسلمان لڑکی ہو۔''

''دیکھو بیٹا! تحسین بہت [illegible] لڑکی ہے۔میرے مرحوم بھائی کی بیٹی ہے تم جب اسے بیاہ کر لاؤ گے تو ظاہر ہے جو تم [illegible] ہو گے۔وہ ایسا ہی کرے گی۔اچھی لڑکیاں شوہر کی رضا کو اپنی رضا سمجھتی ہیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے بابا! لیکن عادات اس عمر میں پختہ ہو جاتی ہیں' اور ان کا بدلنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ابرار اور اسرار [illegible]۔''

''ابرار اور اسرار ابھی پڑھ رہے ہیں اور بھابی جلد از جلد بچیوں کے فرائض سے فارغ ہونا چاہتی ہیں۔''

اور وہ دودھ کا گلاس ہاتھ میں اٹھائے اپنے کمرے میں آ گئی۔وہ جو افشار کو دیکھنے سے پہلے سوچ رہی تھی کہ وہ تایا ابا سے صاف صاف کہہ دے گی کہ اس کے اور افشار کے مزاج میں بہت فرق ہے۔خود افشار ہی اسے رد کر رہا تھا۔

حالانکہ جب سے اس نے افشار کو دیکھا تھا [illegible] سوچ رہی تھی کہ وہ خود کو افشار کی

مرضی کے مطابق ڈھال لے گی اور پھر افشار کچھ غلط بھی تو نہیں کہتے تھے۔ بہرحال مسلمان لڑکیوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اس طرح ننگے سر بازاروں میں جائیں۔ حالانکہ ساہیوال میں وہ چادر اوڑھا کرتی تھیں لیکن پھر یہاں لاہور میں سب کی دیکھا دیکھی اس نے بھی چادر اوڑھنا چھوڑ دی تھی۔

کچھ دیر بعد فرحین آئی، تو اس نے فرحین کے ہاتھ دودھ تایا ابا کے لیے بھیج دیا، اور خود تھکان کا بہانا کر کے لیٹ رہی۔

''آپی! چلیں نا۔ آج زینب آپی وغیرہ کا بہت دیر تک جاگنے کا پروگرام ہے۔''

مگر وہ نہ گئی۔ دل عجیب سا ہو رہا تھا۔

وہ افشار کے معیار پر پوری نہ اتری تھی۔

افشار نے اسے رد کر دیا تھا۔

اور اب اقصیٰ کچھ اور کہہ رہی تھی۔ کیا افشار نے تایا ابا کی بات مان لی تھی۔ یا پھر اقصیٰ نے ہی غلط سنا تھا لیکن اقصیٰ نے غلط نہیں سنا تھا۔

شام کو تایا ابا نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھی ڈال کر اسے افشار سے منسوب کر دیا۔ اور ساتھ ہی چھ ماہ بعد رخصتی بھی طے کر دی۔

''لیکن اماں! میری تعلیم ــــــــ!''

اس نے احتجاج کیا۔

وہ افشار کے ساتھ منسوب ہو کر بے حد خوش تھی لیکن اسے اپنی تعلیم کی بھی فکر تھی۔

''تعلیم کا کیا ہے تحسین۔ بہت پڑھ لیا۔ مجھے اپنی زندگی کا اعتبار نہیں۔ تمہارے بعد مجھے ماہین اور فرحین کو بھی بیاہنا ہے۔''

اور وہ چپ ہو گئی تھی۔ سرفراز کی شادی کے بعد وہ یونیورسٹی جانے کے بجائے اماں کے ساتھ واپس ساہیوال آ گئی۔ جب چھ ماہ بعد بھی پڑھائی چھوڑنی ہے، تو اب ہی کیوں نہ چھوڑ دی جائے۔ اقصیٰ کو اس کے پڑھائی چھوڑنے کا بہت ہی دکھ تھا۔

''تو نے ایک بار بھی تایا ابا سے کہا ہوتا نا، تو وہ کبھی بھی رخصتی کے لیے جلدی نہ کرتے لیکن تو تو خود مری جا رہی ہے۔ سارا چارم افشار صاحب کا شادی کے بعد ختم ہو جائے گا۔''

''دیکھ لیں گے اقصیٰ بی بی! جب وقت آئے گا تو۔''

اور جب وقت آیا اور وہ دلہن بن کر تایا ابو کے گھر پہنچی تو اسے پتا چلا کہ اصل آزمائش تو اب شروع ہوئی ہے اور اس نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے اندر وہ تمام خوبیاں پیدا کر لے گی، جو افشار اس میں دیکھنا چاہتا ہے لیکن چند ماہ میں ہی وہ تھکنے سی لگی تھی

افشار ملک واقعی بہت انتہا پسند تھا۔

''لپ اسٹک مت لگاؤ۔''

''میک اپ نہ کرو۔''

''دوپٹہ سر پر اس طرح لپیٹو کہ سر کا ایک بال بھی نظر نہ آئے۔''

''ابرار اور اسرار کے سامنے مت جاؤ۔''

''سرفراز اور احسن سے پردہ کرو۔''

''مگر وہ پھپھو کے بیٹے ہیں اور ہم بچپن سے۔''

''مگر وہ تمہارے محرم نہیں ہیں۔'' وہ حیرانی سے افشار کے احکام سنتی رہی اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرتی۔

مگر یہ بہت مشکل تھا کہ ایک ہی گھر میں رہ کر ابرار اور اسرار کے سامنے نہ آنا۔ ان سے بات چیت نہ کرنا۔ پھر ابرار اور اسرار محبت سے اس کے پاس آ کر بیٹھتے، ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس سے باتیں کریں گپ شپ لگائیں، لیکن وہ سہم جاتی، خوفزدہ ہو جاتی۔

''کیا ہے بھابی! آپ شادی کے بعد بالکل ہی بدل گئی ہیں۔ پہلے تو آپ ایسی نہیں تھیں۔''

ایک روز ابرار نے گلہ کر ہی ڈالا۔

''عورت کو شوہر کی مرضی پر چلنا ہوتا ہے باری ــــــ!'' اس نے افسردگی سے کہا۔

اس کا بھی دل چاہتا تھا کہ وہ ربی اور رفی، باری اور اسرار کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرے۔ اقصیٰ، فرحین اور ماہین اسے بہت یاد آتی تھیں۔ گھر میں وہ سب کتنا انجوائے کرتی تھیں۔ اس کا اپنا کوئی بھائی نہیں تھا۔ ابرار، اسرار اسے بھائیوں جیسے ہی لگتے تھے اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ہمیشہ ان سے بھائیوں جیسی محبت ہی کرے گی۔

لیکن افشار نے صاف صاف منع کر دیا تھا۔

اس کی امی نے کتنے شوق سے اس کے لیے کپڑے بنوائے تھے۔ پورے چھ ماہ وہ ماہین، فرحین کو لے کر بازاروں کے چکر لگاتی رہی تھیں۔ کتنے نفیس اور خوبصورت کام والے کپڑے تھے مگر وہ سب یوں ہی بکسوں میں پڑے رہ گئے تھے۔

میک اپ' جب وہ دلہن بنی تھی تب ہی اس نے کیا تھا۔ یا پھر ولیمے والے دن، خود اسے میک اپ کرنا پسند نہیں تھا لیکن وہ ہلکی سی لپ اسٹک لگا لیا کرتی تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگانا بھی اسے اچھا لگتا تھا۔ لیکن افشار نے اسے منع کر دیا۔ ''مجھے یہ سب خرافات پسند نہیں ہیں۔ مت لگایا کرو لپ اسٹک وغیرہ۔''

یوں میک اپ کا قیمتی سامان پڑا سڑ رہا تھا ایک روز رفی کے بے حد اصرار پر اس نے ساڑھی باندھ لی۔ ڈارک گرین ہلکے سے کام والی ساڑی میں جوڑا باندھے بغیر میک اپ کے سادگی میں بھی وہ بہت دلکش لگ رہی تھی۔ افشار کالج سے آیا تو اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی تھی۔

''یہ کیا واہیات لباس پہن رکھا ہے۔ اتارو اسے اور شلوار قمیض پہن لو۔''

وہ لمحہ بھر حیرت سے اسے دیکھتی رہی پھر خاموشی سے کپڑے بدل کر آ گئی۔

''بھابی! آپ نے ساڑھی کیوں تبدیل کر لی۔ اتنی اچھی لگ رہی تھی۔'' کھانے کی میز پر رفی نے حیرت سے پوچھا۔

''بس یوں ہی مجھے پسند نہیں ہے۔''

اس نے اپنے آنسو اپنے اندر اتار لیے۔

کیا تھا اگر افشار بعد میں کسی دن نرمی اور محبت سے اسے اپنی پسند سے آگاہ کر دیتا اسے تو خود بھی ساڑھی باندھنے کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔

لیکن افشار کے مزاج میں سختی تھی۔

وہ سخت لہجے میں بات کرتا۔

معمولی بات پر ڈانٹ دیتا۔ اس کا رویہ اس قدر حقارت آمیز ہوتا۔ جب وہ کسی مذہبی مسئلے پر بات کر رہا ہوتا اور تحسین بولنا چاہتی تو وہ اسے ٹوک دیتا۔

''تم چپ رہو۔ تمہیں کیا علم ہے اس کے متعلق، تم جو مسلمان عورت کے مرتبے اور مقام سے بھی بے خبر ہو۔''

اور وہ سوچتی رہ جاتی کہ کیا۔۔۔۔ کیا ایسی حرکت اس سے سرزد ہو گئی ہے جو مسلمان عورت کے مرتبے اور مقام سے اسے گرا گئی ہے۔

''تم بازاروں میں ننگے سر گھومتی ہو۔ بال کٹواتی ہو، تم کیا جانو کہ اسلام کیا ہے۔ مذہب کیا ہے؟''

افشار غصے سے کہتا، اور وہ اندر ہی اندر کڑھ کر رہ جاتی۔

شاید اس نے غلط فیصلہ کیا تھا۔ افشار جیسے آدمی کے ساتھ گزارا کرنا آسان نہ تھا۔

لیکن وہ اس دل کا کیا کرتی جو اب بھی افشار کے نام کی مالا جپ رہا تھا۔ وہ افشار سے محبت کرتی تھی' وہ اس کے رنگ میں رنگ گئی تھی۔ وہ ہر وقت خود کو بڑے سے دوپٹے میں لپیٹے رکھتی۔ سادہ سے کپڑے پہنتی۔ میک اپ نہ کرتی۔ بلکہ بعض اوقات تو دو، دو، تین، تین دن تک کپڑے تبدیل نہ کرتی۔

بڑی تائی کو ہول آتا۔

''بیٹا! یہ کیا ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرتی رہتی ہو۔ یہی تو دن ہوتے ہیں اوڑھنے پہننے کے۔''

''بس تائی اماں! جی نہیں چاہتا۔''

''کیوں جی نہیں چاہتا بیٹا! تو خوش تو ہے نا۔؟''

وہ پریشان ہو کر پوچھتیں۔

''جی تائی اماں! خوش ہوں۔''

وہ بے یقینی سے اسے دیکھتیں۔

''میں تیری ماں جیسی ہوں تحسین۔ کیا افشار کا رویہ تیرے ساتھ صحیح نہیں ہے۔''

''نہیں تو تائی اماں! وہ تو بہت اچھے ہیں۔''

''خوش رہا کرو بیٹا۔ وہ تھوڑا سا سخت مزاج ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے۔ کوئی برائی نہیں، سگریٹ تک نہیں پیتا۔''

''جی تائی اماں!''

وہ خوش تھی۔ لیکن افشار کے رویے نے اسے تھکا دیا تھا۔

نماز تو وہ شادی سے پہلے بھی پابندی سے پڑھتی تھی لیکن افشار سمجھتا تھا کہ آج کل کی لڑکیوں کو نماز روزے کا کیا پتا۔ سو وہ اکثر اس موضوع پر بھی لیکچر دیا کرتا تھا۔ اس نے ایک بار بھی اسے سراہا نہیں تھا۔ ایک بار بھی اس کی تعریف نہیں کی تھی۔ زندگی میں نہ کوئی رنگ تھا نہ خوشبو۔ اس نے بال کٹوانے چھوڑ دیے تھے لیکن افشار اکثر اس کو کٹے بالوں کا طعنہ دیتا۔

یوں ہی ایک برس بیت گیا تھا۔

جن دنوں افشار تبلیغی دورے پر چلا جاتا تو وہ افشار کی لائبریری سے اسلامی کتابیں نکال نکال کر پڑھا کرتی تھی۔ اس کے علم میں خاصا اضافہ ہوا تھا اور مذہب سے اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ جوں جوں مذہب سے اس کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ افشار کے رویے کی تلخی کم محسوس ہو رہی تھی۔

اب وہ ہر وقت افشار کی باتوں کو سوچ سوچ کر کڑھتی نہیں تھی۔ پورا ایک برس اس نے افشار کی محبت اور توجہ حاصل کرنے کے لیے صرف کیا تھا۔ اپنی ہر خواہش کو مار کر خود کو اس کے رنگ میں ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن پھر بھی وہ خوش نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں وہی شادی سے پہلے والی تحسین تھی۔ انارکلی میں دوپٹہ گلے میں ڈالے قلفہ کھاتی ہوئی۔ سرفراز اور احسن سب کزنز کے ساتھ مل کر ہنستی قہقہے لگاتی لڑکی۔ اس کے خیال میں تحسین میں وہ خوبیاں نہیں تھیں، جو ایک مکمل مسلمان لڑکی میں ہونی چاہئیں۔

اس نے اپنے ابو کے مجبور کرنے پر اس کے ساتھ شادی کر تو لی تھی، لیکن ذہنی طور پر شاید اسے ایک دن بھی قبول نہیں کیا تھا۔ اس لیے اس کے اندر اب تک اسے کوئی خوبی دکھائی نہیں دی تھی' جب کہ تحسین نے اس کے عشق میں اپنے آپ کو بالکل بدل ڈالا تھا۔

اس روز بڑی تائی جی کے کہنے پر اس نے رفی اور ربی کے ساتھ مل کر اپنے بکسوں میں فینائل ڈالی تھی۔ اپنے اتنے اچھے اچھے کپڑے دیکھ کر اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اس نے پیچ کلر کا نیٹ کا سوٹ نکالا۔ جس کے دامن پر بالکل ہلکا سا کام کیا ہوا تھا۔ یہ اس نے اپنی پسند سے بنوایا تھا۔

''کتنا پیارا ہے بھابی! آج یہی پہن لیں۔''

اس شام وہ بڑے دنوں بعد شوق سے تیار ہوئی تھی۔ افشار آج پورے پندرہ دن

بعد دورے سے آیا تھا اور کسی دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ آج افشار اسے دیکھے، اسے سراہے اور تعریف کرے اس کی۔ اور یہ کوئی ایسی ناجائز خواہش نہیں تھی۔ وہ بیوی تھی اس کی اور یہ اس کا حق تھا لیکن افشار کا موڈ خراب ہو گیا۔

''یہ اتنا بننے سنورنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس نے غصے سے پوچھا۔

''تمہیں کچھ احساس نہیں ہے کہ گھر میں جوان دیور ہیں لیکن تم کیا جانو۔ تم آج کل کی لڑکیوں کو فلمی کہانیاں تو یاد ہوں گی۔ جس اداکار کا نام پوچھ لو۔ بتا دو گی۔ لیکن مذہب کی الف۔ ب کا تمہیں نہیں پتا۔۔۔۔۔۔''

وہ بولتا جا رہا تھا اور تحسین کے اندر جو ایک ننھی سی خوشی کی رمق تھی۔ وہ بجھتی جا رہی تھی۔ کوئی جذبہ اس کے اندر ہولے ہولے مر رہا تھا۔

کیا اس نے اس شخص سے عشق کیا ہے محبت کی ہے۔ کیا ہے اس میں۔ کیا میں صرف اس کی شکل وصورت دیکھ کر اس سے محبت کرنے لگی تھی۔ اقصیٰ نے سچ کہا تھا، ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

افشار نے آگ برساتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کھانے کے لیے باہر آؤ تو منہ ہاتھ دھو کر اور دوپٹہ سر پر اچھی طرح لپیٹ کر باہر آنا۔''

تحسین کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک لمبا طویل سفر کر کے آئی ہو اور بے دم ہو کر گرنے والی ہو۔ اس نے سر اٹھا کر افشار کو دیکھا اور ادھر جیسے وہ اندھا جذبہ اس کے اندر مر گیا وہ جذبہ جس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ افشار کی ہر غلط صحیح بات پر سر جھکا دیتی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے اندر وہی تحسین بیدار ہو گئی تھی۔ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہنے والی۔

بولڈ اور خود مختار

''افشار ملک صاحب۔۔۔۔۔۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔'' میں اپنے شوہر کے لیے بنی سنوری تھی' اور اطلاعاً عرض ہے کہ مذہب کے متعلق آپ کا علم انتہائی ناقص اور محدود ہے اور یہ جو کتابیں سنن، ابوداؤد، ابن ماجہ وغیرہ آپ نے ریک پر سجا رکھی ہیں۔ یہ غالباً آپ نے دوسروں پر محض اپنی علمیت کا رعب جمانے کے لئے رکھی ہیں۔ انہیں پڑھنا تو درکنار' آپ نے شاید انہیں کھول کر بھی نہ دیکھا ہو۔''

"تحسین!" افشار زور سے بولا۔

"مت چیخیں! اتنی زور سے۔ ایک سال سے میں آپ کی باتوں کو برداشت کررہی ہوں۔ آج آپ کو میری بات سننا ہوگی۔ آپ جو ہر روز دو تین بار مجھے ایک نامکمل مسلمان عورت کا طعنہ دیتے ہیں۔ آپ کون سے مکمل مسلمان ہیں۔ صرف نماز پڑھ لینے سے اور تبلیغی دوروں پر جانے سے آپ ایک مسلمان مرد نہیں بن سکتے۔ آپ کو تو میاں بیوی کے حقوق و فرائض کا بھی علم نہیں ہے۔ آپ کو تو یہ تک نہیں معلوم کہ خدا اور اس کے رسول ﷺ نے شوہروں پر بیویوں کے کیا حقوق رکھے ہیں آپ صرف اپنے حقوق جانتے ہیں، فرائض کا علم نہیں ہے۔"

"تحسین! بہت ہوگئی۔ بس کرو۔"

افشار کا رنگ غصے کی زیادتی سے سرخ ہورہا تھا۔

"کیوں سچی بات بری لگتی ہے کیا افشار ملک صاحب! خدا اور اس کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ اپنی بیویوں کو سنگھار کی چیزیں لاکر دو۔ ان کی دل آزاری مت کرو۔ وہ آبگینے ہیں اور افشار ملک صاحب! آپ نے اس سال کے تین سو پینسٹھ دنوں کے ہر ہر لمحے میں میری دل آزاری کی ہے' مجھے اپنی باتوں سے تکلیف پہنچائی ہے۔ جب کہ میں نے ان تین سو پینسٹھ دنوں کے ایک لمحے میں بھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی۔ آپ مذہب۔ مذہب ہر وقت الاپتے رہتے ہیں لیکن آپ نے کبھی غور نہیں کیا کہ آپ کا رویہ مذہب سے نفرت پیدا کررہا ہے، محبت نہیں۔

ٹھیک ہے، مجھ میں کچھ خامیاں تھیں۔ میں پردہ نہیں کرتی تھی۔ بال کٹواتی تھی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو بدل ڈالا تھا۔ مگر آپ ------ مجھے بہت افسوس ہے کہ مذہب کے متعلق آپ کچھ نہیں جانتے۔ اسلام اتنا تکلیف دہ مذہب نہیں جتنا آپ نے بنا رکھا ہے۔ میں ---------"

بولتے بولتے وہ لمحہ بھر کو چپ سی ہوگئی۔

"اقصیٰ نے مجھے روکا تھا، منع کیا تھا لیکن میں شاید آپ کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہوگئی تھی۔ شاید محبت کرنے لگی تھی آپ سے۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ یکدم مڑی، اور باہر چلی گئی۔ افشار وہیں حیران کھڑا اسے

دیکھتا رہا۔ عجیب خود سر لڑکی ہے' بجائے اس کے کہ اپنی غلطی تسلیم کرلے، الٹا مجھے برا بھلا کہہ گئی ہے۔ اس لیے میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کہا تھا ابا جان سے لیکن ---------

وہ غصے سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ کھانا کھانے گیا تو وہاں تحسین نہیں تھی۔

"تحسین بیٹی کہاں ہے؟"

"تایا ابا نے اس سے پوچھا۔ لیکن ربی نے جواب دیا۔

"وہ میرے کمرے میں سو رہی ہیں۔ ان کے سر میں درد تھا۔ کھانا نہیں کھائیں گی۔"

"اچھا، کھانا کھا کر اسے دودھ دے دینا۔"

انہوں نے ربی کو تاکید کی۔

افشار کھانا کھا کر کمرے میں آ گیا لیکن رات تحسین اس کے کمرے میں نہیں آئی تھی اور اگلے دن جب وہ کالج سے واپس آیا تو تب بھی وہ نظر نہ آئی تو اس نے ربی سے پوچھا۔

"تمہاری بھابی کدھر ہیں؟"

"وہ تو ساہیوال چلی گئیں۔"

"کیوں؟" وہ ذرا سا چونکا۔

"دراصل وہ بہت اداس ہورہی تھیں۔ گھر والوں کے لیے، انہوں نے ابا سے کہا، اور ابا انہیں چھوڑنے گئے ہیں۔ دو بجے کی فلائیٹ سے ٹکٹ مل گئے تھے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

افشار کا خیال تھا کہ وہ پندرہ بیس دن یا زیادہ سے زیادہ ایک ماہ رہ کر واپس آ جائے گی۔ ابا اسے چھوڑ کر واپس آ گئے تھے لیکن ایک ماہ کے بجائے دو ماہ گزر گئے، تو ایک دن ربی نے ہی اسے بتایا۔

"ابا جان نے فون کیا تھا ساہیوال، لیکن تحسین بھابی نے واپس آنے سے انکار کر دیا ہے۔"

"کیوں......؟" اسے حیرت ہوئی۔

"پتا نہیں۔ شاید وہ آپ سے خفا ہیں۔"

"مجھ سے۔؟"

اسے یقین نہ آیا۔ بھلا اس نے اسے کیا تکلیف دے رکھی تھی۔ ٹھیک ہے نہیں آتی تو نہ آئے۔ وہ تبلیغی دورے پر ملک سے باہر چلا گیا۔

واپس آیا تو ابا جان نے اسے حکم دیا کہ جا کر تحسین کو لے آئے۔

"مگر ابا جان!"

"اگر مگر کچھ نہیں جاؤ اور اگر شادی ہو ہی گئی تھی' اور فرض کرو کہ اس میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی، پھر بھی وہ تمہاری بیوی تھی اور تمہارا فرض تھا کہ تم اس کے حقوق پورے کرو۔"

"مگر ابا جان! میں نے اس کے حقوق۔"

اس نے کہنا چاہا، لیکن انہوں نے اسے ٹوک دیا۔

"جانتا ہوں میاں! اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم نے کیا حقوق پورے کیے ہیں اس کے۔ اسی گھر میں رہتا ہوں۔ تحسین بیٹی کا کوئی قصور نہیں ہے' ساری غلطی تمہاری ہے۔ وہ ایک بہترین بیوی ہے۔

قسمت والوں کو ہی ایسی اچھی بیویاں ملتی ہیں۔"

"ابا جان!"

"جاؤ میاں! اب زیادہ بحث نہ کرو۔"

اور یوں اسے ابا جان اور پھر اماں جان کے مجبور کرنے پر ساہیوال آنا پڑا۔

تحسین اسے بہت مختلف اور اچھی لگی۔ اس کے چہرے پر عجیب سا نور اور روشنی تھی۔ ان پانچ ماہ میں وہ بہت بدل گئی تھی یا اس کی نگاہوں کا قصور تھا۔ وہ کتنی ہی دیر تک یوں ہی اسے دیکھتا رہا۔

"کیسی ہو تحسین؟"

شاید پہلی بار اس نے نرم لہجے میں بات کی۔

"اچھی ہوں، تحسین کی نظریں جھکی تھیں۔"

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"تایا ابا نے بھیجا ہے؟"

"ہاں! وہ ٹپٹا گیا۔

بھیجا تو اسے ابا جان نے ہی تھا لیکن اس میں ان کی خواہش بھی اس لمحے شامل ہو گئی تھی۔" میں نے تایا ابا کو اپنا نقطہ نظر سمجھا دیا تھا۔ مجھے افسوس ہے افشار ملک صاحب! کہ میں آپ کے مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔ مجھ میں وہ خوبیاں نہیں ہیں۔ جو آپ اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے جو فیصلہ اب کیا ہے وہ مجھے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن مجھ میں ایک کمزوری تھی اور وہ کمزوری آپ کی محبت تھی، جس کی وجہ سے میں علیحدگی کا تصور نہیں کر سکتی تھی لیکن اب میں نے اس کمزوری پر قابو پا لیا ہے۔

مجھے طلاق نہیں چاہیے۔ البتہ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ آپ اپنی پسندیدہ لڑکی سے شادی کر لیں۔"

بات مکمل کر کے وہ باہر جانے کے لیے مڑی تو افشار نے آگے بڑھ کر اس کا اس کا راستہ روک لیا۔

"سنو تحسین! تم ہی میری پسندیدہ لڑکی ہو۔ تم میں وہ سب خوبیاں ہیں جن کی مجھے خواہش تھی میں غلطی پر تھا، مجھے افسوس ہے، پچھلے چند ماہ میں غیر ارادی طور پر میں تمہاری باتوں کو سوچتا رہا ہوں۔ تم نے صحیح کہا تھا تحسین، میرا علم نامکمل تھا۔ میں نے تمہاری دل آزاری کی ہے، مجھے معاف کر دو۔"

افشار کی نگاہیں اس کے صبیح چہرے پر جمی تھیں۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے پہلی بار تحسین کو دیکھا ہو۔ یہ اس قدر دلکش، اتنی پیاری لڑکی اس کی بیوی تھی، اور اس نے اسے کس قدر نظر انداز کر رکھا تھا۔

تحسین کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"پلیز تحسین! روؤ مت میرے ساتھ چلو۔ وہاں سب تمہارے بغیر اداس ہیں۔ وہ تمہاری کمی محسوس کر رہے ہیں۔"

تحسین نے کوئی جواب نہ دیا۔

"تحسین! انکار مت کرنا۔"

افشار نے التجا کی۔

افشار آج کتنی نرمی اور محبت سے بات کر رہا تھا۔ اس وقت جب اسے خواہش تھی کہ افشار اس سے نرم لہجے میں بات کرے، اس وقت افشار نے کبھی اس طرح اس سے بات نہیں کی تھی اور آج جب اس کے دل سے یہ خواہش ختم ہوگئی تھی تو آج افشار اس سے محبت اور نرمی سے بات کر رہا تھا۔

''تمہارا علم تو بہت زیادہ ہے نا تحسین۔!'' افشار نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''اور تمہیں پتا ہے کہ شوہر کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔''

تحسین نے سر ہلایا۔

''میں نے ایک سال کے دوران اپنے فرائض میں بالکل کوتاہی نہیں کی۔ لیکن اب شاید مجھ سے کوتاہی ہو جائے۔ اس لیے کہ۔''

''اگر تم سے کوئی کوتاہی ہوئی تو میں سمجھوں گا۔ یہ میری ناقدری کی سزا ہے۔''

افشار نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔

''لیکن پلیز، انکار مت کرو۔ میں کوشش کروں گا کہ اس ایک سال کی کوتاہیوں کی تلافی کر سکوں۔''

''اچھا......!'' تحسین نے سر ہلایا۔ لیکن اس کے آنسو اسی روانی سے بہتے رہے۔

تحسین افشار کے ساتھ واپس آ گئی تھی لیکن اب زندگی کا رنگ بدل گیا تھا۔

اب افشار کا دل چاہتا تھا کہ وہ تیار ہو، بنے سنورے، اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرے لیکن اب تحسین سنجیدہ ہوگئی تھی۔ وہ افشار کے کام پہلے کی طرح ہی کرتی تھی۔ اپنی طرف سے اپنے فرائض میں کوئی کوتاہی نہیں کرتی تھی لیکن زیادہ وقت وہ مذہبی کتابیں پڑھتی افشار سے پہلے ہی تہجد کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی۔ زیادہ تر سفید لباس پہنتی اور پیشانی تک بڑا سا دوپٹہ لیے وہ افشار کو کام میں مصروف دکھائی دیتی تھی۔

اور افشار کو یوں لگتا تھا، جیسے ہر گزرنے والا دن اسے بلند کر رہا ہے۔

وہ اس سے دور ہوگئی تھی۔ دور ہوتی جا رہی تھی۔ افشار کے دل میں اب اسکے لیے عشق کا جذبہ پیدا ہوا تھا لیکن وہ دنیاوی محبتوں سے بے نیاز ہوگئی تھی اور اس نے اپنے خدا سے لو لگالی تھی۔ اب اس کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی کہ افشار اسے دیکھے، اسے سراہے اس کی تعریف کرے۔

کبھی کبھی تو وہ اسے کوئی روبوٹ لگتی تھی لیکن وہ اس سے کوئی شکوہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اندر کے سارے رنگ اور خوشبو تو اس نے خود مار دی تھی۔ وہ ایسے ہی رنگ میں رنگ گئی تھی جیسا وہ چاہتا تھا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتا رہتا۔ اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں اس کا تعاقب کرتیں اور اس کے اندر جلتی تحسین کے عشق کی آگ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی۔

☆ ☆ ☆